بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

إِنَّ هٰذَا الْعِلْمَ دِيْنٌ فَانْظُرُوْا عَمَّنْ تَأْخُذُوْنَ دِيْنَكُمْ (صحیح مسلم)

بیشک یہ علم دین ہے پس خوب سوچ لو کہ تم اپنا دین کس سے حاصل کر رہے ہو؟

تفہیم المسائل

جلد اوّل

تصحیح و نظر ثانی شدہ ایڈیشن

پروفیسر مفتی مُنیب الرحمٰن

ضیاء القرآن پبلی کیشنز
لاہور - کراچی
پاکستان

نام کتاب	تفہیم المسائل (جلد اول)
مصنف	پروفیسر مفتی منیب الرحمٰن
تصحیح	مولانا حافظ محمد ابراہیم فیضی ۔ مولانا فیصل ندیم احمد قادری ایم اے ۔ ایل ایل بی ۔ بی ایڈ
طبع اول	ربیع الاول 1422 ہجری ، جون 2001ء
طبع دوم	جمادی الثانی 1422 ہجری ، ستمبر 2001ء
طبع سوم	شعبان المعظم 1422 ہجری ، اکتوبر 2001ء
طبع چہارم	محرم الحرام 1424 ہجری ، مارچ 2003ء
ناشر	ضیاء القرآن پبلی کیشنز ، لاہور
تعداد	ایک ہزار
کمپیوٹر کوڈ	1Z356
ہدیہ	-/200 روپے

ملنے کے پتے

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

داتا دربار روڈ ، لاہور ۔ 7221953 فیکس :۔ 042-7238010

9 ۔ الکریم مارکیٹ ، اردو بازار ، لاہور ۔ 7225085-7247350

14 ۔ انفال سنٹر ، اردو بازار ، کراچی

فون :۔ 021-2210212-221201-2630411

e-mail:- zquran@brain.net.pk

Website:- www.ziaulquran.com

انتساب

میں اپنی اس ناچیز علمی و فقہی کاوش کو اپنے والد ماجد قاضی حبیب الرحمٰن نور اللہ مرقدہ' اور والدہ کریمہ مد اللہ ظلہا العالی کے نام منسوب و معنون کرتا ہوں، جنہوں نے پسماندگی اور ظلمت کے ماحول میں مجھے نورِ علم سے آشنا کیا اور ذوقِ آگہی عطا کیا، لڑکپن کی ناتجربہ کاری کے باعث میرے قدم جب بھی علم و عرفان کے جادۂ مستقیم سے ڈگمگانے لگے تو ان کی دُعاؤں اور تربیت نے ثابت قدم رکھا۔ رب ارحمھما کما ربیانی صغیرا۔

ناکارۂ خلائق

منیب الرحمٰن



محمد اقبال نعیمی عفی عنہ
ریسرچ اینڈ رجسٹریشن آفیسر محکمہ اوقاف

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

میں نے ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور سے شائع کردہ کتاب "تفہیم المسائل (حصہ اول)" تالیف پروفیسر علامہ مفتی منیب الرحمٰن صاحب کے پروف پوری توجہ سے پڑھے ہیں میرے علم کے مطابق اس کتاب میں درج آیات قرآنی کے الفاظ اور اعراب غلطیوں سے مبرا ہیں۔

واللہ اعلم بالصواب

فقط
حافظ محمد ابراہیم فیضی

فہرست مضامین

☆...☆...☆

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للّٰہ رب العٰلمین' والصلوٰة والسلام علی رحمةٍ للعٰلمین' سیدنا ومولٰینا محمدٍ وّعلی اٰلہ الطیبین الطاھرین وعلی صحابتہ الصدیقین الکاملین' وعلی اولیآء امتہ وعلمآء ملتہ من الفقھآءِ المجتھدین والمحدثین والمفسرین اجمعین

مافی الضمیر

"تفہیم المسائل" کے عنوان سے میں نے مارچ ۱۹۹۹ء میں روزنامہ 'ایکسپریس" کراچی کے جمعہ ایڈیشن میں ہفتہ وار کالم شروع کیا تھا جو قارئین کے ارسال کردہ دینی سوالات کے جوابات پر مشتمل ہے۔ الحمدللہ علیٰ احسانہ یہ کالم کافی مقبول ہوا۔ قارئین نے نہایت دلچسپی کے ساتھ اس میں حصہ لیا اور دیگر علمی حلقوں نے بھی پذیرائی اور حوصلہ افزائی سے نوازا۔ اب یہ دسمبر ۲۰۰۰ء تک شائع شدہ سوالات وجوابات پر مشتمل دینی وعلمی مواد "تفہیم المسائل" ہی کے نام سے کتابی شکل میں آپ کے سامنے موجود ہے۔ یہ جلد اول ہے اور انشاء اللہ العزیز آئندہ مجلدات وقفے وقفے سے آتی رہیں گی۔

میں نے دیگر معاصر اخبارات کے اس نوع کے کالموں کی طرح نہ تو بالکل اختصار سے کام لیا ہے کہ محض 'ہاں' یا 'نہ' اور 'جائز' یا "ناجائز" کی حد تک جواب دے دیا جائے اور نہ ہی دلائل کا انبار لگایا ہے کہ کتاب طویل ہو جائے اور عام قاری کا ذہن اکتا جائے، بلکہ حتی الوسع توسط واعتدال سے کام لیا ہے، اور حسبِ ضرورت مختصر دلائل اور حوالہ جات بھی درج کردیئے ہیں تاکہ دینی ذوق رکھنے والوں کی علمی ضیافت کا بھی اہتمام ہو جائے اور ان کی کماحقہ تسلی وتشفی بھی ہو سکے۔

اخبار میں مطبوعہ سوالات وجوابات کے علاوہ چند مدلل وجامع فقہی فتاویٰ بھی اس میں شامل ہیں، جو بعض معاصر اہلِ فتویٰ سے تحریری بحث وتمحیص کے نتیجے میں مرتب ہوئے، لیکن ان کی تعداد بہت کم ہے۔ دارالعلوم نعیمیہ کے شیخ الحدیث اور شرح صحیح مسلم و"تبیان القرآن" کے مصنف علامہ غلام رسول سعیدی مدظلہم العالی کا وجود اور علمی خدمات دارالعلوم نعیمیہ، اہلسنت اور ملت اسلامیہ کے لئے سرمایہ افتخار ہیں، ان کی مشاورت، رہنمائی اور علمی سرپرستی اس کتاب کی تسوید وتبییض اور روزمرہ دینی امور میں ہمارے لئے

نعمت غیر مترقبہ ہے، ان کی صحت و درازیٔ عمر اور تصنیفی و تدریسی فیوض و برکات کے تادیر جاری رہنے کے لئے میں انتہائی خلوص کے ساتھ بارگاہ الوہیت میں دست بدعا ہوں۔

دار العلوم نعیمیہ کے استاذ حدیث مولانا احمد علی سعیدی زید مجدھم سے بھی دینی و فقہی مسائل میں مشاورت کرتا رہتا ہوں، ان کا علمی تعاون بھی میرے شامل حال رہا ہے۔ بناء بریں ان کا شکر گزار ہوں۔

عزیز محترم مولانا نور نبی خلف الرشید علامہ مفتی عبدالرحیم شاہ پور چاکر سندھ نے تفہیم المسائل کے منتشر و غیر مرتب سوال و جواب کی باقاعدہ تبویب (Classification) کی ہے جو بلاشبہ بہت اہم کام ہے اور اس کے بغیر اس مواد کو کتابی شکل میں لانا میرے لئے دشوار ہوتا، میں ان کے اس مخلصانہ علمی تعاون پر ان کا شکر گزار ہوں اور ان کی علمی ترقی کے لئے دعاگو ہوں۔

کتاب کی پروف ریڈنگ اور تصحیح کیلئے میں اس شعبے کے ماہر مولانا حافظ محمد ابراہیم فیضی صاحب کا ازحد شکر گزار ہوں، وہ چونکہ صاحب علم بھی ہیں، اس لئے جو تحریر ان کی نظر سے گزر جائے، اس میں لفظی و معنوی سقم کم رہتا ہے۔ دعا کرتا ہوں کہ اللہ جل شانہ انہیں ماجور فرمائے۔

اہل علم سے گزارش ہے کہ اگر دوران مطالعہ وہ میری کسی علمی فروگزاشت پر مطلع ہوں تو ازراہِ کرم ضرور مطلع فرمائیں تاکہ آئندہ ایڈیشن میں اس کی تصحیح کی جاسکے۔ انشاء اللہ العزیز وقتاً فوقتاً تفہیم المسائل کی آئندہ مجلدات آپ کے سامنے آتی رہیں گی۔ میں انتہائی عجز و نیاز کے ساتھ بارگاہ رب العزت میں دست بدعا ہوں کہ وہ اپنے حبیب کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے طفیل اس سعی ناتمام کو اپنی بارگاہ عالیہ میں مقبول و ماجور فرمائے اور اسے اہل علم و ارباب فکر و نظر اور دین اسلام سے محبت رکھنے والوں کی نظر میں قبولِ دوام نصیب فرمائے۔

بندۂ عاجز

منیب الرحمٰن

مہتمم دارالعلوم نعیمیہ، کراچی

رکن اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان

چیئرمین

مرکزی رویت ہلال کمیٹی پاکستان

کلماتِ تَشکُّر

الحمدللہ علیٰ احسانہٖ کہ اللہ جلّ شانہٗ کے بے پایاں فضل و کرم اور اس کے حبیب کریم ﷺ کے توسل سے "تفہیم المسائل" جلد اول کو ہمارے تصورات اور توقعات سے بدرجہا زائد کامیابی نصب ہوئی، رب کریم نے اسے قبول عام عطا کیا، اہل علم اور ارباب فکر و نظر نے کلمات تحسین سے نوازا اور پہلا ایڈیشن تقریباً تین ہفتے ہی میں ختم ہو گیا اور طلب برقرار رہی۔ ہم اس انعام ربانی پر اللہ تعالیٰ کے حضور سربسجود ہیں اور ہمارا قلب جذباتِ تشکر سے معمور ہے، ہم اپنے تمام ہمدردوں اور کرم فرماؤں کے لئے بھی سراپا سپاس ہیں، کیونکہ ارشادِ نبوی ہے: مَنْ لَّمْ یَشْکُرِ النَّاسَ لَمْ یَشْکُرِ اللّٰہَ۔

دوسرے ایڈیشن کی آمد میں تاخیر اس لئے ہوئی کہ ہم نے پوری کتاب پر نظر ثانی کی ہے، مکررات کو حذف (Delete) کر دیا ہے، موقع و محل کی مناسبت سے بعض مقامات پر تشریح و اضافہ کیا ہے اور بعض جگہ معمولی ترمیم کی ہے۔ اس کے علاوہ لفظی و معنوی تصحیح اور طباعت کے معیار کو حتی الامکان مزید بہتر بنانے کی کوشش کی ہے۔ بعض احباب کی فرمائش پر عربی عبارات پر اعراب بھی لگا دیئے ہیں، حالانکہ کمپوزنگ میں یہ بہت مشکل کام ہے۔

مفتی عبدالعزیز حنفی صاحب کے ساتھ طلاق بائن کے مسئلے پر جو تحریری مباحثہ شامل اشاعت تھا، اسے اہل علم اور مدرسین حضرات اور ائمہ و خطباء کرام نے نہایت دلچسپی، توجہ اور انہماک سے پڑھا ہے۔ احباب کی فرمائش پر اب ہم نے اسے واقعاتی ترتیب کے مطابق ازسرنو مرتب کیا ہے، ان کا اصل فتوٰی اور اس پر ہم نے جو ان کا تعاقب کیا، وہ اور ہمارے تعاقب پر ان کا ردعمل، جو ان کی طرف سے "متابعت الجواب" کے عنوان سے ہمیں موصول ہوا، من و عن انہی کے الفاظ مبارکہ میں نقل کر دیا ہے تاکہ ریکارڈ کا حصہ بن

جائے۔ علمی دیانت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ ان کا پورا موقف انہی کی تحریر میں قارئین کے سامنے آئے۔ اسی طرح اپنے موقف کی تائید میں ہم نے امام اہلسنت اعلیٰ حضرت عظیم البرکت رضی اللہ عنہ کے متعلقہ فتاویٰ بھی لفظ بہ لفظ نقل کر دیئے ہیں۔ امید ہے اب یہ مسئلہ اظہر من الشمس ہو کر سامنے آئے گا۔ علمی وقار اور شخصی احترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایک وقیع علمی بحث مزید دلچسپی کا باعث بنے گی۔

ہم اپنے جملہ معاونین بالخصوص جناب نجیب الدین شیخ صاحب اور محترم اظہر احمد صاحب کے تہہ دل سے شکر گزار ہیں اور انتہائی خلوص اور عجز و نیاز کے ساتھ اللہ رحیم و کریم کی بارگاہ میں ان کے حق میں بے پایاں اجر و ثواب اور خیر و برکت کے لئے دعا گو ہیں۔ ہماری کوشش ہے کہ جلد ثانی بھی جلد طبع ہو کر منظر عام پر آئے۔ ہم نے اللہ کی توفیق و عنایت سے کام شروع کر دیا ہے، اَلسَّعْیُ مِنَّا وَالْاِتْمَامُ مِنَ اللّٰہِ۔

سراپا تشکر و امتنان

منیب الرحمٰن

تبرکاتِ اکابر

شیخ الحدیث علامہ مفتی عبد القیوم ہزاروی مدظلہم العالی

صدر تنظیم المدارس اہلسنّت پاکستان

ناظم اعلیٰ جامعہ نظامیہ رضویہ لاہور

چیئرمین سنی سپریم کونسل جماعت اہلسنّت پاکستان

JAMIA NIZAMIA RIZVIA®
الجامعۃ النظامیۃ الرضویۃ

YOUR REF: ________
OUR REF: ________

DATE: ________
یکم جمادی الاولیٰ ۱۴۲۲ھ
۲۴ جولائی ۲۰۰۱ء

عزیزم محترم مولانا قاضی منیب الرحمٰن صاحب، زید مجدہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، مزاج شریف، خیریت مطلوب،

آپکی حسین وجمیل تالیف، "تفہیم المسائل" موصول ہوئی، شکریہ

ماشاء اللہ ظاہری اور باطنی حسن سے مرصع ہے، تقریر وتحریر میں آپکا انداز بیان خوب ہے، معاشرہ کی ضرورت کو سہل انداز میں بیان کیا گیا ہے، امید ہے کہ آئندہ بھی یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

کیونکہ بہت سے معاشرتی معاملات ومسائل باقی ہیں جن کی عوام کو ضرورت ہے، اس لئے تفہیم المسائل کی دوسری جلد پیش نظر رہنی چاہیے، میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپکے علم وعمل اور تقریر وتحریر اور خدمت دین میں مزید خلوص وبرکت فرمائے، آمین۔

(مفتی) محمد عبد القیوم ہزاروی

جامعہ نظامیہ رضویہ لاہور/شیخوپورہ

G.P.O Box No. 1016, Inside Lahori Gate, Lahore-54000, PAKISTAN.
New Educational Complex, Sargodha Road, Sheikhupura.
Ph: 92-42-7657314. Fax: 92-42-7657842. A/C No. 3461-0, Muslim Commercial Bank, Shah Alam Market, Lahore

حضرت علامہ عبدالحکیم شرف قادری مدظلہم، شیخ الحدیث جامعہ نظامیہ رضویہ، لاہور

مکتبہ قادریہ

جامعہ نظامیہ رضویہ لوہاری منڈی لاہور

حوالہ نمبر .... ۷۸۶/۹۲ تاریخ 25-7-2001

محترم و مکرم حضرت علامہ مولانا مفتی منیب الرحمٰن صاحب مدظلہ العالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ! مزاج شریف

آپ کی ارسال کردہ تصنیف لطیف "تفہیم المسائل" موصول ہوئی، جستہ جستہ مقامات سے مطالعہ کر کے لطف اندوز ہوا، آج کے قاری کو ایسی ہی کتابوں کی ضرورت ہے جن میں مختصر، مدلل اور واضح انداز میں مسائل بیان کئے گئے ہوں نیز ان کی زبان بھی شستہ اور عام فہم ہو، الحمد للہ! آپ کی تالیف جمیل میں یہ سب خوبیاں موجود ہیں، مولا کریم اسے قبول عام عطا فرمائے ضرورت اس امر کی ہے کہ یہ کتاب مارکیٹ میں دستیاب رہے۔

ارشاد الحق حقانی اور مولوی یوسف لدھیانوی پر آپ نے معقول گرفت کی ہے۔

علامہ سعیدی کو، علامہ جمیل احمد نعیمی اور دیگر اساتذہ کی خدمت میں السلام علیکم

والسلام

محمد عبدالحکیم شرف قادری

كتاب العقائد

اللہ میاں، اللہ سائیں کہنا

سوال: کیا اللہ میاں، اور اللہ سائیں کہنا جائز ہے؟

(محمد ناصر خان چشتی، نارتھ کراچی)

جواب: سورۂ بنی اسرائیل آیت نمبر ۱۱۰ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ؕ اَیًّامَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی ۚ

"(اے رسول!) آپ کہہ دیجئے کہ تم اللہ کہہ کر پکارو یا رحمٰن کہہ کر پکارو، جس نام سے بھی پکارو، اس کے سب ہی نام اچھے ہیں۔"

اللہ تعالیٰ کی ذات کو تعبیر کرنے کیلئے اسم ذات "اللہ" ہے، اس سے قریب تر صفاتی نام "الرحمٰن" ہے، باقی اس کے بہت سے صفاتی نام ہیں جو قرآن و حدیث میں مذکور ہیں، مثلاً الستار، الغفار، الروٴف، الرحیم وغیرہ۔ اللہ تعالیٰ کی ذات کو تعبیر کرنے کیلئے جو بھی اسماء، صفات اور کلمات استعمال کئے جائیں، ان کیلئے ضروری ہے کہ ذاتِ باری تعالیٰ کے شایانِ شان ہوں۔ "میاں" اور "سائیں" ایسے کلمات اللہ تعالیٰ کی ذات کے شایانِ شان نہیں ہیں، کیونکہ اگرچہ استعمال کرنے والا انہیں اچھے معنوں میں استعمال کر رہا ہو، لیکن ان میں کم تر معنی کا وہم پیدا ہو سکتا ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ کے اسم جلالت کے ساتھ ان کلمات کا استعمال درست نہیں ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ، اللہ جل شانہ اور اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ یا باری تعالیٰ کے کلمات استعمال کرنے چاہئیں۔

ذیل میں ہم کتب لغت کے حوالے سے لفظ "میاں" اور "سائیں" کے معانی درج کر رہے ہیں، ملاحظہ فرمایئے!

میاں: اردو زبان میں شوہر، خواجہ سرا، ایک کلمہ جس سے برابر والے یا اپنے سے کم درجہ شخص کو خطاب کرتے ہیں، بیٹا وغیرہ معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ (قائد اللغات، فیروز اللغات۔)

سائیں: خاوند، فقیر، بھکاری وغیرہ میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ ("قائد اللغات")

ان معانی سے آپ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ اللہ جل شانہ، کے شایانِ شان نہیں ہیں، ان میں سے بعض معانی ایسے ہیں جو ذاتِ باری تعالیٰ کیلئے نقص اور اہانت کا پہلو رکھتے ہیں۔ لہٰذا ہماری رائے میں "اللہ میاں" اور "اللہ سائیں" ایسے کلمات بولنے سے بالکل گریز کرنا چاہئے اور اپنے گھروں، دفاتر، مجالس اور بچوں کے ساتھ گفتگو میں اللہ جل شانہ کا ذکر کرتے وقت اسی احتیاط پر عمل کرنا چاہئے۔ اللہ تعالیٰ کی شانِ جلالت تو بہت بلند تر ہے۔ وہ ہر نقص، عیب اور کمزوری سے پاک ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ج

"آپ کا رب جو بڑی عزت والا ہے، ہر اس عیب سے پاک ہے جو وہ بیان کرتے ہیں۔" (الصّٰفّٰت: ۱۸۰)

ذاتِ پاک رسالت مآب ﷺ کیلئے بھی اللہ جل شانہ، نے ایسا ذو معنی کلمہ استعمال کرنے سے منع فرمایا جس کے معنی شانِ رسالت کے مطابق نہ ہوں، خواہ استعمال کرنے والے کی نیت بھی درست ہو، لیکن اس سے کوئی بد نیت، بد مذہب اور بد طینت شخص دور کا ایسا معنی مراد لے سکتا ہے، جس سے اہانت اور بے ادبی کا پہلو نکلتا ہو۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَقُوْلُوا انْظُرْنَا وَاسْمَعُوْا

اے ایمان والو! (اگر دورانِ کلام رسول اللہ ﷺ کو اپنی جانب متوجہ کرنا چاہو تو) رَاعِنَا (یا رسول اللہ!) نہ کہو بلکہ اُنْظُرْنَا (یا رسول اللہ!) کہو اور (ادب کا تقاضا یہ ہے کہ رسول اللہ کی بات کو) خوب توجہ سے سنو، (تاکہ انہیں دوبارہ بتانے میں زحمت نہ دینی پڑے)" (البقرہ: ۱۰۴)

عذابِ قبر

سوال: قرآن اور احادیث مبارکہ کی روشنی میں عذاب قبر ثابت کیجئے۔

(ایس۔ خان کیماڑی، کراچی)

جواب: عذاب قبر قرآن وحدیث کی نصوص قطعیہ سے ثابت ہے اور اس پر امت کا اجماع

ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اَلنَّارُ یُعرَضُوْنَ عَلَیْهَا غُدُوًّا وَّعَشِیًّا ۚ وَیَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ ۛ اَدْخِلُوْٓا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ ○

"انہیں (قوم فرعون کو) جہنم کی آگ پر صبح وشام پیش کیا جاتا ہے اور جب قیامت قائم ہوگی (تو فرشتوں کو حکم دیا جائے گا کہ) فرعونیوں کو زیادہ سخت عذاب میں داخل کرو۔" (المؤمن: ۴۶)

اس آیت میں قیامِ قیامت سے پہلے فرعون اور قومِ فرعون کو صبح وشام نارِ جہنم پر پیش کیے جانے کا ذکر ہے، یہی عذابِ قبر ہے، قبر سے مراد زمین کا وہ گڑھا ہی نہیں جس میں مردے کو دفن کیا جاتا ہے بلکہ عالَمِ برزخ ہے، یعنی انسان کی موت اور قیام قیامت کا درمیانی عرصہ، اس میں اس کے وجود کے ذرات، خاک یا راکھ کی شکل میں ہوں یا کسی اور شکل میں جہاں کہیں بھی ہوں، ان کے ساتھ قدرت کی طرف سے روح کا کوئی نہ کوئی تعلق قائم ہوتا ہے، جس کی کیفیت کا ہم اس دنیا میں ادراک نہیں کر سکتے اور اسے عذاب یا ثواب پہنچتا ہے۔

مِمَّا خَطِیْٓـٰٔتِهِمْ اُغْرِقُوْا فَاُدْخِلُوْا نَارًا ۙ "وہ (قومِ نوح) اپنے گناہوں کے سبب (طوفانِ نوح میں) غرق کر دیئے گئے، پھر آگ میں ڈالے گئے۔" (نوح: ۲۵)

یہاں غرقاب ہونے کے بعد جس عذاب کا ذکر ہے وہ عذاب قبر ہی ہے۔ عذاب قبر کے ثبوت میں کثرت سے احادیث وارد ہوئی ہیں جو حدِ شہرت کو پہنچی ہوئی ہیں۔

کلمۂ طیبہ کا ذکر قرآن میں

سوال: بعض حضرات یہ اعتراض کرتے ہیں کہ "کلمۂ طیبہ" جسے "کلمۂ اسلام" بھی کہتے ہیں، اس کا ذکر قرآن میں نہیں ہے۔ کیا اتنی بنیادی چیز قرآن میں نظر انداز کی جاسکتی ہے؟ (آصف انور۔ لانڈھی، کراچی)

جواب: قرآن کسی ایک آیت، کسی ایک سورت یا کسی ایک جزء کا نام نہیں ہے بلکہ پورا قرآن اللہ کا کلام ہے، سارے قرآن پر لفظاً و معنیً ایمان فرض عین ہے۔ کسی ایک

آیت کا انکار پورے قرآن کے انکار کے مترادف ہے۔ قرآن مجید سارے کا سارا یکبار گی نازل نہیں ہوا بلکہ وقتاً فوقتاً اللہ تعالیٰ کی حکمت سے نازل کیا جاتا رہا۔ اس لئے قرآن مجید میں عقائد، مسائل و احکام اور قصص و واقعات متفرق طور پر بیان کئے گئے ہیں۔ "لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ" کو کلمہ طیبہ بھی کہتے ہیں اور کلمۂ اسلام بھی کہتے ہیں۔ اس کے دونوں اجزاء قرآن مجید میں دو مقامات پر الگ الگ آئے ہیں۔ "لا الہ الا اللہ" قرآن مجید کی ۳۷ ویں سورت "الصافات" کی آیت نمبر ۳۵ میں مذکور ہے اور "محمد رسول اللہ" قرآن پاک کی ۴۸ ویں سورت "الفتح" کی آخری آیت، آیت نمبر ۲۹ کی ابتداء میں مذکور ہے۔ ان دونوں کو یکجا کرنے سے کلمہ طیبہ بنتا ہے۔

آثارِ قیامت

سوال: قیامت کس دن قائم ہوگی؟ اور قیامت کی نشانیاں کیا ہیں؟

(محمد اشرف، منظور کالونی۔ کراچی)

جواب: صحیح مسلم میں حدیث ہے کہ قیامت جمعہ کے دن قائم ہوگی، احادیث مبارکہ میں قیامت کی کئی نشانیاں بتائی گئی ہیں، ان میں سے چند یہ ہیں: علم اٹھ جائے گا، جہالت کا غلبہ ہوگا، بدکاری اور شراب نوشی کی وبا عام ہوگی، آبادی میں مردوں کے بہ نسبت عورتوں کا تناسب بڑھ جائے گا۔ امانت ضائع کر دی جائے گی اور اس کی نشانی رسول اللہ ﷺ نے یہ بتائی کہ مسلمانوں کی زمامِ اقتدار نااہلوں کے پاس چلی جائے گی، قومی دولت کو ذاتی جاگیر سمجھ لیا جائے گا، امانت کو مالِ غنیمت سمجھ کر اس پر ہاتھ صاف کر دیا جائے گا، لوگ زکوٰۃ کو تاوان اور جرمانہ سمجھیں گے یعنی یا تو دیں گے نہیں اور اگر دیں گے تو بے دلی سے۔ علمِ دین، دینی مقاصد کیلئے نہیں بلکہ دنیوی مقاصد کیلئے حاصل کیا جائے گا، مرد اپنی بیوی کا اطاعت گزار ہوگا اور ماں کا نافرمان، لوگ ذہنی اور فکری طور پر باپ سے دور ہو جائیں گے اور دوستوں سے قریب تر، مساجد میں لڑائی جھگڑے اور شور و غوغا ہوگا، بدکار و سرکش لوگ سردار و رہنما بن جائیں گے، نہایت کمینہ شخص قوم کا رئیس ہوگا، بڑے لوگوں کی تعظیم

(ان کے کسی علمی، ادبی اور اخلاقی کمال یا تقویٰ کی بناء پر نہیں) بلکہ ان کے شر کے خوف سے ہوگی، آلاتِ غنا و موسیقی اور گانے بجانے کا بڑا شہرہ ہوگا، لوگ اپنے آباء واجداد اور بزرگوں یعنی اسلاف کو لعن طعن کریں گے، باندی اپنے آقا کو جنے گی۔ وہ لوگ جو کبھی چرواہے تھے، جوتے اور لباس تک کے محتاج تھے بڑے بڑے محلات تعمیر کریں گے۔ احادیث مبارکہ میں اور بھی بہت سی علامات مذکور ہیں، لیکن ہمیں خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کیلئے یہ بھی کافی ہیں، بشرطیکہ ہم نے قبولِ حق کیلئے اپنے ذہن کے دریچے اور دل کی آنکھیں بند نہ کردی ہوں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

فَإِنَّهَا لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَلَٰكِن تَعْمَى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ ۝

"آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ وہ دل بصیرت سے محروم ہو جاتے ہیں جو سینوں میں دھڑکتے ہیں (الحج: ۴۶)"۔

اور رب کریم کا فرمان ہے:

وَمَنْ أَعْرَضَ عَن ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنكًا وَنَحْشُرُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَعْمَىٰ ۝ قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِي أَعْمَىٰ وَقَدْ كُنتُ بَصِيرًا ۝ قَالَ كَذَٰلِكَ أَتَتْكَ آيَاتُنَا فَنَسِيتَهَا ۖ وَكَذَٰلِكَ الْيَوْمَ تُنسَىٰ ۝

"اور جو میری نصیحت (کو قبول کرنے) سے رخ پھیر لے گا تو اس کیلئے معیشت تنگ ہو جائے گی اور ہم اسے قیامت کے دن اندھا کر کے اٹھائیں گے، وہ (حیرت کے مارے) کہے گا: اے پروردگار! تو نے مجھے اندھا کر کے کیوں اٹھایا، میں تو دنیا میں (اچھا بھلا) بینا تھا، رب فرمائے گا، اسی طرح (دنیا میں) تیرے پاس میری آیات آئی تھیں تو، تو نے انہیں بھلا دیا تھا، تم بھی آج اسی طرح نظر انداز کر دیئے جاؤ گے (طٰہٰ: ۱۲۴تا۱۲۶)"۔

قیامت کا دن

سوال: یہ کہنا کہاں تک درست ہے کہ قیامت کا دن ۱۰ محرم الحرام بروز جمعہ نماز عصر کے وقت ہوگا؟ (ڈینئل سردار بھٹی، کراچی)

جواب : صحیح مسلم میں جمعہ کے بارے میں حدیث ہے، ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''بہترین دن جس میں سورج طلوع ہوتا ہے، جمعہ کا دن ہے، اس روز حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق ہوئی، اسی دن انہیں جنت میں داخل کیا گیا، اسی دن انہیں جنت سے نکالا گیا اور قیامت بھی جمعہ ہی کے دن قائم ہوگی۔'' غنیۃ الطالبین میں، جس کے بارے میں مشہور ہے کہ غوث الاعظم شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف ہے، لکھا ہے کہ ''قیامت عاشورہ کے دن قائم ہوگی۔''

دجال کی حقیقت

سوال : دجّال کیا ہے؟ اس کی وجہ تسمیہ کیا ہے؟ تفصیل سے وضاحت فرمایئے۔

(ڈاکٹر عبداللہ ناصر بٹ، لانڈھی)

جواب : ''دجّال'' کا لفظ ''دجل'' سے ماخوذ ہے، جس کے معنی ہیں ''چھپانا'' اور ''ڈھانپ لینا۔'' ''کذّاب'' کو بھی ''دجّال'' اس لئے کہتے ہیں کہ وہ حق کو باطل کے سبب سے چھپا دیتا ہے۔ گویا ''دجل'' کے معنی فریب اور ملمع کاری کے ہیں۔ احادیث نبی کریم ﷺ کی روشنی میں ''دجّال'' کی بابت جو ارشادات اور علامات ملتی ہیں وہ یہ ہیں :

۱- ظہور دجّال علامات قیامت میں سے ہے۔

۲- اس کا ظہور قیامت سے پہلے ہوگا۔

۳- یہ شخص اعور (کانا) ہوگا اور اس کی کانی آنکھ انگور کی طرح پھولی ہوئی ہوگی۔

۴- اس کی دونوں آنکھوں کے درمیان ''ک، ف، ر'' لکھا ہوگا۔

۵- اس کے ساتھ آگ اور پانی کے دریا ہوں گے، وہ ایک آدمی کو قتل کر کے پھر زندہ کرے گا۔

۶- وہ مشرق کی طرف سے نمودار ہوگا، دجّال کا لقب ''مسیح'' ہوگا، لیکن وہ مسیحِ ضلالت ہوگا، جبکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام مسیحِ ہدایت ہیں۔

۷- حضرت عیسیٰ علیہ السلام دجّال کو قتل کریں گے۔ بعض روایات میں ہے کہ ''دجّال'' پہلے نبوت کا دعویٰ کرے گا اور پھر الوہیت کا۔

۸- قرآن مجید میں صراحت کے ساتھ دجّال کا ذکر نہیں ہے، البتہ بعض اکابر علماء جیسے حافظ ابن حجر عسقلانی، نے لکھا ہے کہ بعض آیات مبارکہ میں اشارتاً دجال کا ذکر ہے۔

۹- دجّال کے دعوائے الوہیت کو باطل ثابت کرنے کیلئے بعض احادیث مبارکہ ہیں۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ وہ کانا ہوگا، اللہ تو کانا نہیں ہے اور اگر وہ اپنی الوہیت کے دعوے میں سچا ہوتا تو اپنے جسمانی نقص اور عیب کو دور نہ کرتا۔ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ دجّال کا ظہور اہلِ ایمان کی ابتلاء، آزمائش اور امتحان کیلئے ہوگا۔ اسی باعث اس کے ہاتھ پر "خرقِ عادت" یعنی کرشماتی اور محیر العقول امور کا ظہور ہوگا۔

۱۰- احادیث مبارکہ میں یہ نہیں ہے کہ دجّال کا ذکر "سورۂ کہف" میں ہے، بلکہ یہ ہے کہ سورۂ کہف کی ابتدائی تین آیات یا ابتدائی دس آیات یا آخری دس آیات یا ہو سکے تو پوری سورۂ کہف کی تلاوت کرتے رہا کرو، اس کی برکت سے اللہ جل شانہٗ تمہیں فتنۂ دجّال سے محفوظ فرمائے گا۔

جنت کے کھانے کیسے ہوں گے؟

سوال: کیا جنت میں دنیاوی کھانوں کی طرح بھی کھانے ہوں گے یا خالی پھل اور میوے ہوں گے؟ (جبران سرتاج، پولیس لائن۔ کراچی)

جواب: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۭ كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ۙ قَالُوْا ھٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا ۭ

"اور آپ بشارت سنا دیجئے ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال کئے کہ ان کیلئے ایسے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہیں، جب انہیں ان (باغات) کے کسی پھل کا رزق دیا جائے گا، تو وہ کہیں گے کہ یہ تو وہی ہے جو ہمیں پہلے ملا تھا اور ان کو (صورتاً) ملتے جلتے پھل دیئے جائیں گے (البقرہ: ۲۵)"۔

وَلَكُمْ فِيهَا مَاتَشْتَهِي أَنفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيهَا مَاتَدَّعُونَ ○

"اور تمہارے لئے اس (جنت) میں ہر وہ چیز ہے جسے تمہارا جی چاہے اور تمہارے لئے اس میں ہر وہ چیز ہے جو تم طلب کرو۔" (حم السجدہ: ۳۱)"۔

وَفِيهَا مَاتَشْتَهِيهِ الْأَنفُسُ وَتَلَذُّ الْأَعْيُنُ

"اور وہاں ہر وہ چیز ہو گی جسے ان کے دل چاہیں اور آنکھیں لذت پائیں (الزخرف: ۷۱)"۔

فِيهِمَا فَاكِهَةٌ وَنَخْلٌ وَرُمَّانٌ ○

"اور ان میں پھل اور کھجوریں اور انار ہیں (الرحمٰن: ۶۸)"۔

ان آیات مبارکہ میں پھلوں کا بھی ذکر ہے، یہ بھی ذکر ہے کہ اہل جنت کو من پسند چیزیں ملیں گی، جس چیز کی وہ خواہش کریں گے، انہیں مل جائے گی، ظاہر ہے وہ کسی بھی چیز کی خواہش کر سکتے ہیں اور ہر طیب و طاہر اور حلال چیز انہیں دستیاب ہو گی۔ باقی رہا یہ سوال کہ وہ پھل اور کھانے کس طرح کے ہوں گے ؟ تو قرآن نے فرمایا کہ دنیا کے پھلوں کے مشابہ ہوں گے تاکہ طبیعت ان کی طرف مائل ہو، انسیت ہو، لیکن جنتی پھلوں، میووں اور طعام کی جو لذت ہو گی دنیا میں ہم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ اس کا ایک مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اہل جنت کو جو پھل بار بار دیئے جائیں گے 'وہ صورتاً تو پہلے پھلوں کے مشابہ ہوں گے لیکن ہر بار ذائقہ نیا ہو گا' لذت نئی ہو گی۔

برزخ سے کیا مراد ہے ؟

سوال: (ا) برزخ سے کیا مراد ہے ؟ (ب) اگر قیامت یوم عاشورہ بروز جمعہ واقع ہو گی تو یوم عاشورہ دنیا کے مختلف ممالک میں ایک آدھ دن کے فرق سے ہوتا ہے، پھر یوم جمعہ کا تعین کیسے ہو گا ؟ (ج) کیا جنت یا دوزخ میں انسان مکمل جسم کے ساتھ رہے گا یا صرف روح وہاں پر ہو گی ؟ (د) رمضان المبارک میں جن لوگوں نے جان بوجھ کر روزے نہیں رکھے، کیا وہ سزا کے مستحق ہو گئے ؟

(محمد شاہد اعجاز، ناظم آباد۔ کراچی)

جواب: (ا) "برزخ" دوچیزوں کے درمیان حدفاصل کو کہتے ہیں۔ علم العقائد کی اصطلاح میں انسان کی موت سے لے کر قیامت قائم ہونے تک (یعنی عالم آخرت کے آغاز تک) کا جو درمیانی وقفہ ہے، اسے عالم برزخ کہتے ہیں، خواہ وہ عرصہ انسان کا وجود خاکی کسی قبر میں گزارے، گل سڑ کر خاک بن چکا ہو یا جل کر راکھ ہو چکا ہو، کسی درندے کی خوراک اور اس کا جزءِ بدن بن کر تحلیل ہو چکا ہو۔ الغرض جس حالت اور جس کیفیت میں بھی اس پر یہ دور گزرا ہے، گزر رہا ہے یا قیامت تک گزرے گا، وہ عالم برزخ کہلاتا ہے۔ اس عرصے میں اس کے اجزاءِ بدن کے ساتھ اس کی روح کا کسی نہ کسی قسم کا تعلق قائم رہتا ہے اور از روئے قرآن و حدیث وہ عذاب و ثواب اور رنج و راحت کی کیفیات سے گزرتا رہتا ہے۔

(ب) اگر اللہ کے حکم اور تقدیر سے قیامت اس یوم عاشورہ کو واقع ہو گی جو جمعہ کے دن آئے گا تو ممالک کی تقسیم تو ہمارے اعتبار سے ہے۔ اللہ تعالیٰ کیلئے ساری زمین ایک ہے، تو جہاں بھی یوم عاشورہ جمعہ کے روز آئے گا، وہاں سے قیامت کا آغاز ہو جائے گا، زمین، سیاروں، ثوابت اور مظاہر کائنات کی شکست و ریخت کا عمل شروع ہو جائے گا اور پھر قبروں یا برزخ کی کیفیات واحوال سے مردوں کے زندہ کئے جانے اور حشر و نشر کے مراحل آئیں گے۔

(ج) قرآن و سنت کی نصوص اور تصریحات سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ انسان اپنے جسم کے ساتھ جنت یا دوزخ میں جائے گا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِنَا سَوْفَ نُصْلِيهِمْ نَارًا ۖ كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُودُهُمْ بَدَّلْنَاهُمْ جُلُودًا غَيْرَهَا لِيَذُوقُوا الْعَذَابَ ۗ

"بلاشبہ جن لوگوں نے ہماری آیات کا انکار کیا، عنقریب ہم انہیں آگ میں جھونک دیں گے۔ جب بھی ان (کے جسموں) کی کھالیں جل کر پک جائیں گی، ہم انہیں دوسری کھالوں سے تبدیل کر دیں گے، تاکہ وہ عذاب چکھیں۔"

(النسآء ۴:۵۶)

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

مِنْ وَّرَآئِهٖ جَهَنَّمُ وَيُسْقٰى مِنْ مَّآءٍ صَدِيْدٍ ۝ يَّتَجَرَّعُهٗ وَلَا يَكَادُ يُسِيْغُهٗ وَيَاْتِيْهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّمَا هُوَ بِمَيِّتٍ ؕ وَمِنْ وَّرَآئِهٖ عَذَابٌ غَلِيْظٌ ۝

”دوزخ اس کے پیچھے ہے اور اسے پلایا جائے گا (جہنمیوں کے زخموں سے رسنے والا) پیپ کا پانی، وہ بمشکل اس کا تھوڑا تھوڑا گھونٹ لے گا اور وہ اسے گلے سے نیچے اتار نہ سکے گا اور ہر طرف سے اسے موت گھیر لے گی اور وہ مرے گا نہیں اور اس کے پیچھے ایک سخت عذاب ہوگا“ (ابراہیم: ۱۶-۱۷)

اسی طرح اہل جنت کی کیفیات واحوال کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ ۝ عَلَى الْاَرَآئِكِ يَنْظُرُوْنَ ۝ تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِيْمِ ۝ يُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِيْقٍ مَّخْتُوْمٍ ۝ خِتٰمُهٗ مِسْكٌ ؕ

”بلاشبہ نیک لوگ ضرور نعمتوں میں سرشار (عزت کی اونچی) مسندوں پر (بیٹھے) دیکھتے ہوں گے، آپ ان کے چہروں کو راحت کی تروتازگی (کی علامات) سے پہچانیں گے، انہیں صاف شفاف مہر بند شراب پلائی جائے گی جس کی مہر مشک ہے۔“ (المطففین: ۲۲تا۲۶)

الغرض اسی طرح کی متعدد آیات ہیں جن سے قطعیت کے ساتھ ثابت ہوتا ہے کہ اہل جنت، جنت میں اور اہل جہنم، جہنم میں اپنے جسموں کے ساتھ ہوں گے۔

(د) رمضان المبارک میں جن لوگوں نے قصداً بغیر عذر کے روزے چھوڑے ہیں، وہ گناہ کبیرہ کے مرتکب ہیں اور سزا کے حقدار ہوں گے۔ انہیں چاہئے کہ اپنی اس کوتاہی پر توبہ کریں اور روزوں کی قضا بھی کریں۔

ارشاد احمد حقانی سے مکالمہ لفظ ”مولانا“ کا اطلاق

روزنامہ جنگ، کراچی کی ۷ر نومبر ۱۹۹۸ء کی اشاعت میں ادارتی صفحے پر محترم ارشاد

احمد حقانی کے کالم "حرف تمنا" میں ان کی عبدالودود صاحب کے ساتھ مراسلت شائع ہوئی ہے، جس میں عبدالودود صاحب نے منجملہ اورباتوں کے لفظ "مولانا" کے غیر اللہ پر اطلاق کو ناجائز قرار دیا ہے اور ان کے نزدیک یہ لفظ اللہ جلّ شانہٗ کی ذات کیلئے خاص ہے، جیسے ان کے فرمان کے مطابق عدالت میں جج کو (My Lord) کہہ کر مخاطب کرنا، ان کے ساتھ خاص ہے اور عدالت سے باہر کسی اور شخص کو اس لفظ سے مخاطب نہیں کیا جاسکتا حالانکہ یہ بھی کوئی قاعدہ اور ضابطہ نہیں ہے، محض ان کے ذہن کی اختراع ہے۔ سطور ذیل میں ہم اس مسئلے کی مکمل وضاحت کررہے ہیں تاکہ عوام کے ذہن میں کوئی خلجان باقی نہ رہے۔

لفظ "مولانا" کا مادہ (Origin) **وَلِیٌ** ہے اور لفظ "مولانا" دو کلمات سے مرکب ہے۔ مولیٰ + نا، "مولیٰ" مصدر میمی مبنی للفاعل یعنی فاعلی معنی میں ہے اور "نا" ضمیر جمع متکلم ہے، لہٰذا دوسری ضمائر (Pronouns) کے ساتھ مل کر اس کی مرکب صورت "مولاہ" "مولاک" "مولائی" وغیرہ ہوگی۔

لفظ "مولیٰ" عربی زبان کے اسمائے اضداد (The Word with Opposite Meanings) میں سے ہے، یعنی ایسے کلمات جو دو متضاد معنوں کیلئے وضع کئے گئے ہیں اور دونوں میں ان کا استعمال حقیقت ہے، مجاز نہیں، جیسے "بیع وشراء" کے کلمات، ان میں سے ہر ایک خرید و فروخت دونوں معنوں میں استعمال ہوتا ہے اور سیاق و سباق (Context) اور محل استعمال سے معنی کا تعین ہوتا ہے، مثلاً قرآن مجید کی سورہ البقرہ آیت نمبر ۲۰۷ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِىْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ؕ

"اور لوگوں میں سے ایک شخص ایسا ہے جو اللہ کی رضاجوئی کی خاطر اپنی جان کو بیچ دیتا ہے۔"

اور سورۃ التوبہ آیت نمبر ۱۱۱ میں ہے:

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ؕ

"بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان سے جنت کے عوض ان کی جان ومال کو خرید لیا ہے۔"

ان دو آیات میں مادہ "شِرَاءٌ" اور "شِرٰی" کے دو مشتقات (Derivaties) ہیں۔ پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے "یَشْرِیْ" بصیغۂ مضارع (Present & Futuire Tense) بیچنے کے معنی میں، اور دوسری آیت میں "اِشْتَرٰی" بصیغۂ ماضی (Past Tense) خریدنے کے معنی میں ارشاد فرمائے ہیں۔ حالانکہ ان دونوں کلمات یعنی "یَشْرِیْ" اور "اِشْتَرٰی" کا مادہ و مصدر (Origion) ایک ہے اور معانی (خرید و فروخت) ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اسی طرح عربی زبان کا کلمہ "اَلْجَوْن" بھی متضاد معنوں میں استعمال ہوتا ہے، یعنی اس کے معنی "سفید" بھی ہیں اور "سیاہ" بھی۔

اس تمہید کی روشنی میں واضح ہوگیا کہ لفظ "مولانا" جب کسی عالم دین کیلئے بولا جائے گا تو اس کے معنی ہوں گے، ہمارے سردار، ہمارے آقا وغیرہ۔ اور ظاہر ہے یہاں اس لفظ سے دینی سیادت و سربراہی مراد ہے اور یہ محض عقیدت و محبت کے اظہار اور احترام و اکرام کیلئے ہمارے ہاں بولا جاتا ہے، یہ کوئی عہدہ و منصب یا لقب (Title) نہیں ہے، اس میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے اور محترم ارشاد احمد حقانی کا اسے "غلط العام" قرار دینا دینی علوم میں مہارت تامہ نہ ہونے کی دلیل ہے۔

اللہ جل شانہٗ کے بعض اسماءِ صفات وہ ہیں جو اس کی ذات اعلیٰ و اجل کے ساتھ خاص ہیں، ان کا استعمال غیر اللہ کیلئے جائز نہیں ہے، جیسے اللہ، رحمٰن، عالم الغیب وغیرہ اور بعض اسماء باری تعالیٰ ایسے ہیں جن کا استعمال قرآن میں ذات باری تعالیٰ کیلئے بھی ہوا ہے اور غیر اللہ بطور خاص رسول اللہ ﷺ کیلئے بھی، جیسے عزیز، رؤف، رحیم، سمیع، بصیر، شہید، ولی، والی، غنی، کریم، حکیم، مومن وغیرہ۔ ان اسماءِ صفات کو جب اللہ تعالیٰ کیلئے استعمال کیا جاتا ہے تو استقلال ذاتی کے معنی ہیں، یعنی ان صفات عالیہ کا مصدر و منبع خود اللہ جل شانہٗ کی ذات ہے کسی اور سے مستعار و مستفاد نہیں اور جب ان صفاتِ محمودہ کا اطلاق رسول اللہ ﷺ یا مخلوق میں سے کسی اور کیلئے کیا جاتا ہے تو مراد یہ ہوتی ہے کہ یہ صفات اللہ تعالیٰ کی عطا و انعام سے انہیں حاصل ہیں، ان کا اصل مصدر و منبع اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے۔ لفظ "مولیٰ" بھی ایسی ہی صفات میں سے ہے جو اللہ تعالیٰ اور بندوں دونوں کیلئے

استعمال ہوتی ہیں، بس فرق جہت (Angle, Viewpoint) کا ہوتا ہے، قرآن مجید کی سورۃ التحریم آیت نمبر ۴ میں ارشاد ہے:

فَإِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰهُ وَجِبْرِيْلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِيْنَ ج

"تو یقیناً اللہ ان کا مولیٰ (مددگار) ہے اور جبرئیل اور صالح مومنین بھی"

اس آیت میں لفظ "مولیٰ" کا اطلاق ایک ہی مقام پر اللہ تعالیٰ کی ذات پر، جبرئیل امین پر اور صالح مومنین پر کیا گیا ہے۔ سورۃ النحل آیت نمبر ۷۶ میں ارشاد ہے:

وَهُوَ كَلٌّ عَلٰى مَوْلٰهُ لا اَيْنَمَا يُوَجِّهْهُّ لَا يَاْتِ بِخَيْرٍ ط

"اور وہ (ناکارہ غلام) اپنے مولیٰ (آقا) پر بوجھ ہے وہ اسے جدھر بھیجے کوئی بھلائی لے کر نہ آئے۔"

اس آیت میں آقا پر لفظ "مولیٰ" کا اطلاق کیا ہے اور متعدد آیات میں ذات باری تعالیٰ کیلئے بھی یہ کلمہ استعمال ہوا ہے، جیسے سورۃ البقرہ کی آیت نمبر ۲۸۶ میں ہے: "اَنْتَ مَوْلٰنَا" یعنی تو ہمارا مولیٰ (مددگار) ہے۔ اسی طرح احادیث نبی کریم ﷺ میں بھی لفظ "مولیٰ" کا استعمال غیر اللہ کیلئے بکثرت آیا ہے، جامع ترمذی، سنن ابن ماجہ اور مسند امام احمد میں ہے کہ حجۃ الوداع سے واپسی پر "غدیر خم" کے پاس آپ نے فرمایا: "مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَعَلِيٌّ مَوْلَاهُ" یعنی جس کا میں محِب ہوں، علی بھی اس کے محبّ ہیں۔

صحیح بخاری کتاب المغازی میں ہے کہ غزوۂ احد کے موقع پر ابوسفیان نے نعرہ لگایا: "اُعْلُ هُبَل" یعنی ھبل (مشرکین مکہ کا بت) کا نام سربلند ہو۔ حضور ﷺ نے صحابہ سے فرمایا: "اس نعرے کا جواب دو، صحابہ نے عرض کیا: "کیا جواب دیں؟" حضور ﷺ نے فرمایا: "کہو، اَللّٰهُ اَعْلٰى وَاَجَلُّ" (یعنی اللہ ہی کی ذات بلند ترین اور عظیم ترین ہے)، ابوسفیان نے پھر دوسرا نعرہ لگایا "لَنَا الْعُزّٰى وَلَا عُزّٰى لَكُمْ" (یعنی ہمارا تو عزیٰ بت ہے اور تمہارا تو کوئی عزیٰ نہیں ہے)، حضور ﷺ نے صحابہ سے فرمایا: اسے اس نعرے کا جواب دو، صحابہ نے عرض کیا: یارسول اللہ! کیا جواب دیں؟ آپ نے فرمایا: کہو، "اَللّٰهُ مَوْلَانَا وَلَا مَوْلٰى لَكُمْ" (یعنی اللہ ہمارا کارساز و مددگار ہے اور تمہارا کوئی مددگار نہیں ہے)۔ اس کا مطلب یہ

نہیں کہ غیر اللہ کیلئے "مولیٰ" کا کلمہ استعمال کرنا منع ہے بلکہ رسول اللہ ﷺ کے فرمان کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہماری مدد فرمائے گا اور تمہارے بت جو نہ سن سکتے ہیں، نہ دیکھ سکتے ہیں، نہ حرکت کر سکتے ہیں، نہ انہیں شعور ہے نہ عقل، جو اپنے اوپر سے مکھی بھی نہیں اڑا سکتے وہ تمہاری کیا مدد کریں گے؟ جبکہ اللہ عزوجل جو قادر و قیوم ہے وہ ہماری مدد فرمائے گا۔

ہاں یہ ضرور ہے کہ عالم دین کو اخلاص وللّٰہیت، عجز و نیاز اور انکسار کا پیکر ہونا چاہئے اور اس بات کی خواہش و آرزو نہیں کرنی چاہئے کہ لوگ انہیں مولانا، علامہ یا حضرت کے القاب سے پکاریں، کیونکہ اس سے اپنی تقدیس کا زعم پیدا ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ یُزَکُّوْنَ اَنْفُسَھُمْ ط بَلِ اللّٰہُ یُزَکِّیْ مَنْ یَّشَآءُ

"کیا آپ نے انہیں نہ دیکھا جو اپنی پاکیزگیءِ نفس کا دم بھرتے ہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے پاکیزگی عطا فرماتا ہے"۔ (النسآء: آیت ۴۹)

اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

فَلَا تُزَکُّوْٓا اَنْفُسَکُمْ ط ھُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰی O

"خود ستائی نہ کیا کرو وہی بہتر جانتا ہے کہ (در حقیقت) متقی کون ہے؟" (النجم آیت: ۳۲)

ہاں اگر مسلمان عقیدت و محبت سے کسی عالم دین کیلئے تکریم و اعزاز کے طور پر لفظ "مولانا" یا ایسا ہی کوئی اور کلمہ استعمال کریں تو یہ شرعاً درست ہے اور اس میں کوئی قباحت نہیں یہ "غلط العام" نہیں بلکہ از روئے قرآن وحدیث بالکل درست ہے۔

لفظ "مولانا" کا اطلاق

عنوان بالا کے تحت میری گزارشات پر جناب الیاس اختر انصاری کا مراسلہ "جنگ" کی ۳ نومبر کی اشاعت میں شائع ہوا ہے۔ میں ان کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے میری اصولی بحث سے اتفاق رائے کا اظہار کیا ہے، یعنی لفظ مولانا کے معانی اور کتاب و سنت کی روشنی میں "غیر اللہ" پر اس لفظ کے اطلاق کا جواز۔ اس سے انکار کی گنجائش اس لئے بھی نہیں کہ یہ

قرآن کے صریح انکار کے مترادف ہے۔ البتہ انہوں نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ عالم عرب میں یہ استعمال اہل علم کیلئے متعارف نہیں ہے، بلکہ اس کے متبادل لفظ "شیخ" اہل علم کیلئے بولا جاتا ہے۔ جواباً عرض ہے کہ لفظ مولانا کی طرح لفظ "شیخ" بھی عربی زبان میں متعدد اور متضاد معانی کیلئے وضع کیا گیا ہے، مثلاً بوڑھا، معمر، استاذ، عالم، قوم کا سردار، فضیلت اور مرتبے والا وغیرہ، لیکن فضیلتِ محمود ہی نہیں بلکہ فضیلت مذموم پر بھی بولا جاتا ہے، جیسے شیخ النار، شیطان کو کہتے ہیں۔ اور سیرت نگاروں نے لکھا ہے کہ شیطان بعض مواقع پر "شیخ نجد" کی صورت میں مشرکین مکہ کے ہمراہ رہا۔ جہاں تک عرف کا تعلق ہے تو وہ مختلف ممالک، علاقوں اور خطوں میں جدا جدا بھی ہو سکتا ہے اور اس میں کوئی قباحت نہیں، بشرطیکہ کوئی شرعی مانع نہ ہو، جیسے اللہ جل شانہٗ کی ذات کیلئے لفظ "خدا" کا استعمال جنوبی ایشیا، ایران، افغانستان اور وسطی ایشیاء میں، لفظ "تنگری" کا ترکی میں اور لفظ "God" کا یورپ، امریکا اور دنیا کے دیگر خطوں میں۔ اسی طرح آل رسول ﷺ کیلئے عالم عرب میں "شریف" کا کلمہ استعمال ہوتا ہے اور ہمارے سارے خطے میں "سید"، جبکہ عالم عرب میں "سید" آج بھی (مسٹر۔MR) یعنی محترم جناب کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ لہذا دینی حوالے سے کسی مسئلے پر شرعی دلیل کے بغیر اعتراض محض کٹ حجتی اور اعتراض برائے اعتراض ہے۔

اللہ تعالیٰ کی شان میں گستاخی

سوال: افریقہ کے ایک ملک ملاوی کے انڈین باشندے نے جو مسلم ہے اور ان کا نام 'الطاف اللہ ہے'، کہا کہ "اللہ تعالیٰ افریقن قوم کے اندر عقل ڈالنا بھول گیا اور اللہ سے غلطی ہو گئی" (العیاذ باللہ) وہاں ایک عالم نے انہیں متوجہ کیا یہ کلمہ کفر ہے، توبہ کرو اور تجدید نکاح کرو، لیکن وہ اس پر آمادہ نہیں ہوا۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ آیا اس کا نکاح باقی ہے یا اس کی بیوی اس کے نکاح سے خارج ہو چکی ہے، شرعی حکم بیان کیجئے۔ (عبدالقادر علی محمد، ایم-اے جناح روڈ، کراچی)

جواب: فرعون سے مکالمہ کے دوران قرآن حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قول نقل کرتے

ہوئے فرماتا ہے: "(ترجمہ) میرا رب نہ بھٹکتا ہے اور نہ بھولتا ہے (طٰہٰ : ۵۲)"۔
اسی طرح قرآن حضرت مریم سے فرشتوں کا مکالمہ نقل کرتے ہوئے فرماتا ہے: "(ترجمہ) ہم آپ کے رب ہی کے حکم سے اترتے ہیں ہمارے آگے اور ہمارے پیچھے اور اس کے درمیان جو کچھ ہے وہ اسی کا ہے اور آپ کا رب بھولنے والا نہیں ہے (مریم: ۶۴)"۔

صورت مسئولہ میں قائل مذکور نے ذات باری تعالیٰ کی طرف سہو ونسیان اور غلطی کی صریح نسبت کی، یہ اللہ تعالیٰ سبحانہ وتعالیٰ وجلّ شانہ کی صریح توہین ہے اور کفر ہے اور عالم دین کے متوجہ کرنے کے باوجود اس کا توبہ پر آمادہ نہ ہونا اصرار علی الکفر ہے۔ یہ کلمات ادا کرتے ہی اس کا نکاح فسخ ہو گیا اور عدت کے بعد اس کی بیوی کسی کے ساتھ بھی اپنی مرضی سے نکاح کرنے کے لئے آزاد ہے۔ البتہ اگر وہ صدق دل کے ساتھ کفر سے تائب ہو جائے اور شان الوہیت میں جو گستاخی کی ہے اس پر نادم ہو کر اس سے رجوع کر لے، تو وہ دونوں باہمی رضامندی سے دوبارہ نکاح کر سکتے ہیں۔

دولت مندوں کی جنت سے دوری

سوال: کیا امیر ترین، دولت مند، سرمایہ دار ۵۰۰ برس تک جنت سے دور کر دیئے جائیں گے؟ (ڈینئل سردار بھٹی، کراچی)

جواب: ملا علی قاری نے مرقاۃ شرح مشکوٰۃ اور علامہ شرف الدین حسین طیبی نے اپنی شرح الطیبی میں ایک حدیث مبارکہ کی تشریح کرتے ہوئے میں لکھا ہے کہ فقراء، مہاجرین صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنھم امراء سے پانچ سو سال پہلے جنت میں جائیں گے۔

یہ صحابہ کرام کی نسبت سے ان فقراء اور اہل ایمان کا ذکر ہے جو مکمل طور پر شریعت پر عامل ہوں اور ہر قسم کے فسق وفجور سے محفوظ ہوں۔ ظاہر ہے جس کا پرچۂ امتحان جتنا طویل ہوگا، اس کا جواب اور حساب کتاب بھی اتنا ہی تفصیلی ہوگا۔ چونکہ فقراء مومنین کے پاس ضرورت سے زائد دولت ہی نہیں لہٰذا ان پر جواب دہی کی ذمے داری بھی نہیں، اس کے برعکس جن اہلِ ثروت کو اللہ تعالیٰ نے وافر دولت دی ہے، انہیں اس دولت کی آمد وخرچ کا

تفصیلی حساب بھی دینا ہوگا۔ یہ امر ذہن میں رہے کہ یہ ان اہلِ ثروت کا ذکر ہے جو اپنی دولت شریعت کے مطابق جمع اور خرچ کرتے ہیں اور جو لوگ اس معاملے میں شرعی احکام کو نظر انداز کرتے ہیں، ان کا حساب کتاب نہایت دشوار ہوگا۔

مفلس کون

سوال: شریعت میں مفلس کس کو کہا گیا ہے؟ (محمد مختار احمد، فیڈرل بی ایریا۔ کراچی)

جواب: صحیح مسلم میں حدیث ہے "حضرت ابوہریرہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے (صحابہ سے) فرمایا "کیا تم جانتے ہو کہ مفلس کون ہے؟" انہوں نے عرض کیا (یارسول اللہ ﷺ!) ہمارے نزدیک تو مفلس وہ ہے جس کے پاس نقد رقم اور سازوسامان دنیا نہ ہو، آپ نے فرمایا: "میری امت میں سے مفلس وہ ہے جو قیامت کے دن نماز، روزہ اور زکوٰۃ (یعنی عبادات کا ذخیرۂ آخرت) لے کر آئے گا، لیکن (بدقسمتی سے) اس نے (دنیا میں) کسی کو گالی دی ہوگی، کسی پر ناجائز تہمت لگائی ہوگی، کسی کا مال باطل طریقے سے کھایا ہوگا، کسی کا ناحق خون بہایا ہوگا، کسی کو مارا پیٹا ہوگا، تو ان میں سے ہر ایک "مظلوم" کو اس کے ڈھائے ہوئے مظالم کے بدلے میں اس کی نیکیاں منتقل کردی جائیں گی۔ اور اگر ان مظلومین کے حقوق کی ادائیگی کیلئے اس کی نیکیاں ناکافی ہوں گی، تو ان کے گناہ اس کے کھاتے میں ڈال دیئے جائیں گے اور پھر اسے جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔"

☆...☆...☆

کتاب الطہارت

غسل کے بعد وضو

سوال: کیا غسل کے بعد نماز کی ادائیگی کیلئے وضو ضروری ہے؟

(شازیہ و شہناز، کراچی)

جواب: غسل کرنے کے بعد نماز پڑھنے کیلئے وضو کی ضرورت نہیں رہتی۔ اگر غسل میں پورے بدن پر پانی ڈالنے سے پہلے صحیح طریقے سے کلی کرلی ہے اور ناک میں اندر تک پانی ڈال لیا ہے، تو اب غسل کے بعد وضو کی ضرورت نہیں ہے، تاہم غسل کا مسنون طریقہ یہ ہے کہ پہلے سنت کے مطابق باقاعدہ وضو کریں اور پھر پورے بدن پر پانی ڈالیں۔ غسل جنابت میں کلی کرنا اور ناک میں اندر تک پانی ڈالنا فرض ہے، غسل طہارت اور غسل مسنون میں فرض نہیں ہے سنت ہے۔

نیل پالش اور وضو

سوال: کیا ازروئے شریعت نیل پالش کا استعمال جائز ہے اور نیل پالش کے ساتھ وضو ہو جائے گا؟

(سارہ مجید، گارڈن ویسٹ۔ کراچی)

جواب: اگر نیل پالش کے اجزائے ترکیبی میں کوئی حرام اور ناپاک چیز شامل نہیں ہے تو اس کا استعمال جائز ہے۔ اگر کوئی خاتون باوضو ہے اور اس نے وضو کی حالت میں ایسی نیل پالش استعمال کی ہے، جس میں کوئی ناپاک اور حرام چیز شامل نہیں ہے، تو جب تک وہ پہلا وضو قائم ہے، وہ نماز پڑھ سکتی ہے۔ ہماری معلومات کے مطابق نیل پالش سے ناخن پر کیمیکل کی ایک سطح جم جاتی ہے جو چکناہٹ کی وجہ سے "واٹر پروف" ہوتی ہے، یعنی وضو کا پانی اس میں سرایت کر کے ناخن کی اصل سطح تک نہیں پہنچ پاتا۔ ایسی صورت میں جب تک نیل پالش کو کھرچ کر صاف نہ کر دیا جائے، وضو نہیں ہوگا۔ اور اگر کوئی ایسی نیل پالش مارکیٹ میں دستیاب ہے جس میں کوئی ناپاک اور حرام چیز شامل نہیں ہے اور اس کے لگانے کے بعد پانی اس میں سے سرایت کر کے ناخن کی اصل سطح تک پہنچ جاتا ہے تو اس کے استعمال سے وضو ہو جائے گا۔

کیا جھوٹ بولنے سے وضو ٹوٹتا ہے؟

سوال: وضو کرنے کے بعد جھوٹ بولا، کسی کی غیبت کی، فحش کلامی کی تو کیا اس سے وضو ٹوٹ جاتا ہے یا بحال رہتا ہے، کیا تازہ وضو کئے بغیر نماز پڑھ سکتے ہیں؟

(منور احمد، ملیر۔ کراچی)

جواب: فقہی طور پر تو وضو قائم رہتا ہے اور اس سے نماز پڑھ لی تو ادا ہو جائے گی۔ لیکن اس کی کامل روحانیت، نورانیت، اجر و ثواب اور برکت حاصل نہیں ہو گی، لہٰذا افضل اور مستحب یہ ہے کہ دوبارہ تازہ وضو کر کے نماز پڑھے اور اگر چاہتا ہے کہ ان گناہوں کا اثر اور نحوست پوری طرح سے زائل ہو جائے تو صدق دل سے اللہ تعالیٰ سے توبہ بھی کرے۔

دوران نماز وضو کا ٹوٹنا

سوال: (۱) نماز باجماعت کے دوران اگر اگلی صف میں کھڑے کسی نمازی کا وضو ٹوٹ جائے اور اطراف سے نکلنے کا راستہ نہ ہو، تو نمازی کیا کرے...... کیا صفوں کو چیرتا ہوا نکل سکتا ہے؟

جواب: (۱) اگر نماز باجماعت ہو رہی ہے اور اگلی صفوں میں کھڑے کسی نمازی کا وضو ٹوٹ جائے تو اسے چاہئے کہ اسی لمحے نماز کو ترک کر دے اور پچھلی صفوں میں سے نمازیوں کے درمیان میں سے راستہ بناتے ہوئے نکل جائے یا جس صف میں کھڑا ہے وہاں نمازیوں کے آگے سے گزر کر کنارے پر چلا جائے اور کنارے سے راستہ بنا کر نکل جائے، نمازی کو چاہئے کہ اپنی ناک پر ہاتھ رکھ لے تاکہ دوسرے نمازیوں کو پتہ چل جائے کہ اس کا وضو ٹوٹ چکا ہے اور اسے وضو کرنے کیلئے پیچھے جانا ہے۔ جب وضو کر کے واپس آئے اور جماعت بدستور جاری ہو تو سب سے پچھلی صف میں جہاں جگہ ملے کھڑا ہو جائے اور امام کے سلام پھیرنے کے بعد، اس کی بیچ کی کوئی رکعت نکل گئی ہو تو اسے پڑھ لے۔

سوال: (۲) مسجد میں وضو کی جگہ اکثر لوگ جوتے دھوتے ہیں کیا یہ جائز ہے؟

جواب: (۲) وضو کی جگہ جوتے دھونا معیوب تو لگتا ہے لیکن دھو سکتے ہیں بشرطیکہ اگر وہ ناپاک ہیں تو ان کے چھینٹے کسی کے بدن یا لباس پر نہ پڑیں۔

ہاتھ پاک کرنا

سوال: بہت سے لوگ بیت الخلاء سے آنے کے بعد ہاتھ نہیں دھوتے۔ کیا یہ درست ہے؟ یا صرف پانی سے ہاتھ دھوتے ہیں، صابن استعمال نہیں کرتے؟۔

جواب: اسلام ایسا دین ہے جو تزکیہ، طہارت اور نفاست کی تعلیم دیتا ہے۔ جب تک مومن کا بدن، لباس اور نماز کی جگہ پاک نہ ہو، نماز ادا کرنے کا اہل ہی نہیں ہوتا۔ قضائے حاجت کے بعد ہاتھ دھونا طبعی نفاست کی دلیل ہے۔ ڈاکٹر حضرات کا بھی یہی مشورہ ہے کہ قضائے حاجت کے بعد صابن سے ہاتھ دھولیا کریں ورنہ یرقان کا مرض لاحق ہونے کا خدشہ ہے۔ حضور انور ﷺ کے عہد مبارک میں صابن نہیں تھا لیکن صفائی میں مبالغہ اور احتیاط کیلئے ہاتھوں کو مٹی پر رگڑ کر دھویا کرتے تھے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ وَیُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِیْنَ "بلاشبہ اللہ توبہ کرنے والوں اور نہایت عمدہ طریقے سے پاکیزگی اختیار کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے۔" (البقرہ: ۲۲۲)

حضور ﷺ نے فرمایا: "طہارت نصف ایمان ہے" (مشکوٰۃ بحوالہ ترمذی) اور اسلام کا سارا نظام عبادت و اطاعت اس کے حصول کا ذریعہ ہے۔ نماز میں جسم، لباس اور مقامِ نماز کا پاک ہونا شرط لازم ہے۔ نماز، روزے اور زکوٰۃ، ان تمام عبادات سے بندۂ مومن کے قلب اور قالب، جان و مال، ظاہر و باطن، بدن و روح اور ذہن کی تطہیر مقصود ہے۔ اس سے انسان میں اخلاص، للّٰہیت، حضوریٔ قلب، سخاوت، شجاعت اور صبر و ضبط نفس پیدا ہوتا ہے۔

آنسو بہنے سے وضو پر اثر

سوال: آنکھ میں تنکا پڑنے سے پانی بہنے لگتا ہے۔ رونے سے آنسو بہہ نکلتے ہیں اور کبھی آنکھ دکھنے سے پانی بہتا ہے، کیا اس سے وضو ٹوٹ جاتا ہے؟

(سید عمیر الحسن، دستگیر کالونی۔ کراچی)

جواب: آنکھ میں تنکا وغیرہ پڑنے سے جو پانی بہتا ہے یا رونے والے کے آنسوؤں سے وضو نہیں ٹوٹتا، البتہ آنکھ دکھ جانے سے جو پانی بہتا ہے اس سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔

حائض اور جُنب کیلئے قرآن کی تلاوت اور چھونے کا حکم

سوال : کیا حائض عورت اور جنبی مرد کیلئے قرآن مجید کی تلاوت جائز ہے اور یہ لوگ قرآن پاک کو چھو سکتے ہیں ؟۔ (عمران قریشی، خدا داد کالونی۔ کراچی)

جواب : حائض عورت اور جنبی مرد کیلئے قرآن کی تلاوت منع ہے اور قرآن کو چھونا یعنی ہاتھ میں پکڑنا بھی منع ہے۔ البتہ اگر کوئی بے وضو ہے تو وہ زبانی قرآن کی تلاوت کر سکتا ہے۔ تاہم مصحف شریف کو کسی غلاف یا پاک کپڑے میں لپیٹے بغیر چھونا منع ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

لَا یَمَسُّہٗٓ اِلَّا الْمُطَھَّرُوْنَ ۝ "اس قرآن کو نہ چھوئیں مگر (وہی لوگ) جو پاکیزہ ہوں۔" (الواقعہ : ۷۹)

معلّمات اور طالبات کا ایّام کے دوران تعلیمِ قرآن

سوال : اسکولوں اور کالجوں بلکہ یونیورسٹی کی سطح تک قرآن کی تعلیم دی جاتی ہے، کہیں ناظرہ، کہیں ترجمہ اور کہیں تفسیر پڑھائی جاتی ہے۔ بعض اوقات معلّمات اور طالبات ایّام سے ہوتی ہیں، ایسی صورت میں انہیں کیا کرنا چاہیئے ؟

(فاطمہ بنت عبداللہ۔ کراچی)

جواب : جو معلّمہ اور طالبہ ایّام سے ہے، وہ قرآن کی نہ تلاوت کرے اور نہ چھوئے۔ ایسی طالبات جو باوضو اور طہارت سے ہوں، وہ تلاوت کریں اور دوسری سنیں۔ ترجمہ، تفسیر اور مسائل اگر معلّمہ ایّام سے ہوں تب بھی بیان کر سکتی ہیں۔ اگر وہ صرف قرآن یا مترجم قرآن یا قرآنی تفسیر پر مشتمل نصابی کتاب سامنے رکھنا ضروری سمجھیں تو پاک کپڑے یا غلاف میں لپیٹ کر پکڑ سکتی ہیں۔ اسی طرح ناظرہ پڑھاتے ہوئے ایک ایک لفظ الگ کر کے طالبات کو سمجھا سکتی ہیں۔

پان یا نسوار منہ میں رکھ کر سلام کا جواب دینا

سوال : کسی کے منہ میں پان یا نسوار ہے اور کوئی اسے سلام کرتا ہے تو سلام کا جواب دینا چاہیئے یا نہیں ؟ اس حالت میں درود پاک پڑھنا یا ذکر و تلاوت کرنا جائز ہے یا نہیں ؟ (نور خان برکی، سبزی منڈی۔ کراچی)

جواب: کسی کے منہ میں پان یا نسوار ہو اور کوئی اسے سلام کرے تو اسے جواب دینا چاہئے۔ کیونکہ سلام کرنا سنت ہے اور جواب دینا واجب ہے۔ مسجد میں کچی پیاز، لہسن یا کوئی بھی بدبو دار چیز کھا کر جانا اس لئے منع ہے کہ اس سے فرشتوں کو اذیت پہنچتی ہے اور دوسرے نمازیوں کیلئے بھی باعث کراہت و اذیت ہے۔ انسان اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں جسمانی، روحانی، صوری اور معنوی ہر اعتبار سے پاک و صاف ہو کر کھڑا ہو۔ لہٰذا ادب کا تقاضا تو یہ ہے کہ باوضو بھی ہو، کلی یا مسواک کر کے منہ کو اچھی طرح صاف کرے اور ہو سکے تو خوشبو لگا کر قرآن مجید کی تلاوت کرے اور درود پاک پڑھے۔ مستند ڈاکٹروں کی تحقیق کے مطابق چونکہ تمباکو کینسر اور دیگر مہلک امراض کا سبب بن سکتا ہے لہٰذا اس سے اجتناب بہتر ہے۔

ڈرائی کلین کئے ہوئے کپڑوں کی طہارت کا مسئلہ

سوال: شہروں میں لوگ اکثر اپنے کپڑے دھوبی اور ڈرائی کلینرز سے دھلواتے ہیں، ان کپڑوں میں کچھ تو پاک ہوتے ہیں اور کچھ ناپاک اور دھوبی لوگ ان کپڑوں کو ایک ساتھ مشین میں ڈال دیتے، اسی استعمال شدہ پانی میں انہیں صاف کر کے، چمکا کر استری کر کے دے دیتے ہیں، کیا اس طرح یہ سارے کپڑے شرعاً پاک ہو جاتے ہیں اور ایسا لباس پہن کر بلا تردد نماز پڑھ سکتے ہیں۔ (م-ن-خان چشتی، ٹانک سرحد)

جواب: اگر فی الواقع صورتحال ایسی ہے جیسا کہ سوال میں بیان کی گئی ہے کہ پاک و ناپاک کپڑے ایک ساتھ مشین میں ڈال دیئے جاتے ہیں تو ظاہر ہے کہ وہ ماء مستعمل ناپاک ہوتا ہے۔ اور اگر اسی میں میل نکال کر کپڑوں کو چمکا کر خشک کر کے استری کر دیا جاتا ہے تو یہ شرعاً پاک نہیں ہوں گے اور انہیں پہن کر نماز پڑھی جائے تو ادا نہیں ہوگی، کیونکہ طہارتِ لباس نماز کیلئے شرط ہے۔ لیکن اگر مشین میں یہ انتظام ہے کہ وہ استعمال شدہ پانی کو خارج کر دیتی ہے یا اس سے خارج کر دیا جاتا ہے اور اس کے بعد تازہ پاک پانی اس میں ڈال کر کپڑوں کو پاک کر لیا جاتا ہے، جیسا کہ آج کل گھروں میں عام طور پر آٹومیٹک واشنگ مشینوں میں یہ سہولت موجود ہے، تو کپڑے شرعاً پاک ہو جاتے ہیں۔ مشین آٹومیٹک نہ بھی ہو تو پہلے استعمال شدہ پانی

کو نکال کر دوبارہ پاک پانی ڈالا جاسکتا ہے یا کپڑوں کو باہر نکال کر پانی میں ایک دوبار بھگو کر نچوڑا جاسکتا ہے۔ مسئلے کی یہ تفصیل ہم نے ان لوگوں کیلئے درج کی ہے جو ممکنہ حد تک شرعی احتیاط پر عمل کرنا چاہتے ہیں اور دنیوی معاملات کی طرح دینی معاملات میں بھی اپنے قلبی اطمینان کی حد تک تحقیق کرکے اس پر عمل کرتے ہیں۔ ورنہ خالص فقہی جواب یہ ہے کہ اگر کسی شخص کو ڈرائی کلیننگ کے سارے طریقہ کار (Process) کا یقینی علم نہ ہو تو محض شک وشبہے کی بنا پر کپڑے کا حکم تبدیل نہیں ہوگا بلکہ اپنی سابقہ حالت پر برقرار رہے گا یعنی اگر ڈرائی کلین کئے جانے سے پہلے شرعاً پاک تھا تو اب بھی پاک سمجھا جائے گا اور اگر پہلے ناپاک تھا تو ڈرائی کلیننگ کے بعد بھی وہی حکم رہے گا۔ واضح رہے کہ کپڑے کا میلا اور اجلا ہونا اور بات ہے اور شرعاً پاک وناپاک ہونا اور بات ہے۔

بغل کے اور زیرِ ناف بالوں کے ازالے کیلئے کون سا طریقہ بہتر ہے؟

سوال: عام طور پر مرد بغل کے اور زیرِ ناف بالوں کو مونڈتے ہیں اور خواتین اس سلسلے میں کریم یا پاؤڈر کا استعمال کرتی ہیں، کیا اس کے برعکس کرنا جائز ہے؟

(م ۔ن ۔ گلشن اقبال، کراچی)

جواب: زیرِ ناف بالوں کا ازالہ دینِ فطرت کی ان اقدار میں سے ہے جو ملتِ ابراہیمی میں بھی شامل تھیں اور ہمارے نبی مکرم ﷺ کی شریعت مطہرہ میں بھی شامل ہیں۔ شریعت کا اصل مقصود تطہیر ونفاست ہے اور ان غیر ضروری بالوں کا ازالہ ہے، اس کے تین طریقے ہوسکتے ہیں۔ مونڈنا (یعنی استرے یا بلیڈ کا استعمال)، قصر (تراشنا، قینچی وغیرہ سے) اور نتف (اکھیڑنا، آج کل اس کیلئے کریم یا پاؤڈر کا استعمال ہوتا ہے)۔ شرعاً یہ تینوں طریقے مرد اور عورت دونوں کیلئے درست ہیں، کیونکہ ان میں سے ہر ایک سے مقصد حاصل ہوجاتا ہے۔ تاہم حدیث وفقہ کے کلمات کی روشنی میں مرد کیلئے حلق (مونڈنا) افضل ہے اور عورت کیلئے نتف (کریم یا پاؤڈر کے ذریعے) لیکن اس کے برعکس بھی جائز ہے۔

☆...☆...☆

كتاب الصلوٰة

باب الاذان، دُعاء بعد الاذان و دُعا کے کلمات

نوٹ :- پاکستان ٹیلی ویژن سینٹرل ڈائریکٹریٹ اسلام آباد سے ڈائریکٹر پروگرامز جناب محسن علی صاحب کی طرف سے باقاعدہ دستخط شدہ یہ استفتاء موصول ہوا تھا، جس کا جواب ہم نے انہیں ارسال کیا اور بعد ازاں اس کی عمومی افادیت کے پیش نظر اسے روزنامہ 'جنگ' کراچی، روزنامہ 'ایکسپریس' کراچی، ماہنامہ 'السعید' ملتان، ماہنامہ 'نور الحبیب' بصیر پور نے بھی شائع کیا، اور اس کی اہمیت کے پیش نظر ہم نے اسے تفہیم المسائل میں شامل کیا ہے۔

ٹیلی ویژن سے اذان نشر کرنے کے بعد دُعاء مسنون مع ترجمہ پڑھی جاتی ہے، اس "دعاء بعد الاذان" کے بارے میں وقتاً فوقتاً بعض حضرات کی جانب سے چند اعتراضات کئے جاتے ہیں، جو یہ ہیں :

۱- یہ کہ "اَلدَّرَجَةُ الرَّفِيْعَةُ" اور "اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ" کے کلمات اضافی ہیں، کیونکہ یہ "صحیحین" میں مذکور نہیں ہیں۔

۲- یہ کہ اس دعاء میں رسول اللہ ﷺ کیلئے جن مقامات رفیعہ کی دعاء کی جاتی ہے وہ تو آپ کو پہلے سے ہی حاصل ہیں، جبکہ اس دعاء سے یہ تاثر ملتا ہے کہ گویا آپ ابھی ان مراتب پر فائز نہیں ہوئے اور ہماری دعاؤں کی ضرورت ہے۔ اس طرح اس دعاء سے معترضین کی سوچ کے مطابق توہینِ رسالت کا پہلو نکلتا ہے۔

۳- یہ کہ "وَارْزُقْنَا شَفَاعَتَهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ" کے کلمات بصورت دعاء احادیث میں مذکور نہیں ہیں۔

جواباً مندرجہ ذیل گزارشات پیش خدمت ہیں :

(۱) "دعاء بعد الاذان" متعدد احادیث صحیحہ صریحہ سے ثابت ہے اور یہ اپنی اصل کے اعتبار سے سنت ہے۔

(۲) اہل سنت کے کسی بھی مکتبۂ فکر کے نزدیک یہ قطعی اور طے شدہ اصول نہیں ہے کہ صرف "صحیحین" یا "صحاح ستہ" میں مندرج احادیث ہی لائقِ استناد ہیں اور ان کتب احادیث سے باہر کوئی بھی حدیث لائقِ استناد اور حجت نہیں ہے، ورنہ تو احادیث کی بقیہ تمام کتب بیک جنبشِ قلم ساقط الاعتبار اور قابلِ تنسیخ قرار پائیں گی اور صحاح، سنن، مسانید، معاجم اور مصنّفات پر مشتمل دسیوں مآخذ حدیث ہمارے قابل فخر سرمایۂ

حدیث سے حذف اور کالعدم ہو جائیں گے۔ حدیث کو "صرف معیارِ صحت" پر پرکھا جاتا ہے اور یہ بھی مسلّمہ امر ہے کہ فضائل اعمال میں ضعیف احادیث بھی معتبر ہوتی ہیں اور یہ امر بھی ملحوظ رہنا چاہیے کہ "حدیث ضعیف" اور "حدیث موضوع" میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

(۳) ٹیلی ویژن پر جو "دعاء بعد الاذان" نشر کی جاتی ہے اس کے بیشتر الفاظ "صحیح بخاری" اور "صحاح ستہ" میں موجود ہیں۔ دراصل متعدد کتب احادیث اور روایات میں منقول الفاظ مبارکہ کو نہایت کمال اور شانِ جامعیت کے ساتھ اس دعاء میں جمع کر دیا گیا ہے۔ اور اس دعاء میں ایک بھی ایسا لفظ نہیں ہے جو بلفظہٖ یا قریب المعنیٰ الفاظ کے ساتھ کسی نہ کسی حدیث میں مذکور نہ ہو۔

معترضین نے جن کلمات کو اضافی قرار دیا ہے وہ مندرجہ ذیل احادیث سے ماخوذ ہیں:

(الف) عَنْ اَيُّوْبَ وَعَنْ جَابِرِ الْجُعْفِيِّ قَالَا: مَنْ قَالَ عِنْدَ الْاِقَامَةِ اَللّٰهُمَّ رَبَّ هٰذِهِ الدَّعْوَةِ التَّامَّةِ وَالصَّلٰوةِ الْقَائِمَةِ اَعْطِ سَيِّدَنَا مُحَمَّدًا نِ الْوَسِيْلَةَ وَارْفَعْ لَهُ الدَّرَجَاتِ حُقَّتْ لَهُ الشَّفَاعَةُ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ (المصنف للحافظ عبد الرزاق الجزء الاول حدیث نمبر ۱۹۹۱ ص: ۴۹۶-۴۹۵ باب الدعاء عن الاذان والاقامۃ مطبوعہ: المجلس العلمی پاکستان)

"حضرت ایوب اور جابر جعفی روایت کرتے ہیں کہ جس شخص نے اقامت کے وقت (یعنی اذان کے بعد) یہ دعا مانگی "اے اللہ! اس دعوت کامل اور (تاقیامت) قائم ہونے والی نماز کے رب تو ہمارے آقا محمد ﷺ کو (مقام) وسیلہ عطا فرما اور ان کے درجات کو بلند فرما، تو (قیامت میں) نبی ﷺ پر اس کی شفاعت واجب ہے۔"

دعاء بعد الاذان میں "اَلدَّرَجَةُ الرَّفِيْعَةُ" کے کلمات مندرجہ بالا حدیث پاک کے خط کشیدہ الفاظ سے ماخوذ و مفہوم ہیں۔

(ب) عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ قَالَ حِيْنَ سَمِعَ النِّدَاءَ: اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْئَلُكَ بِحَقِّ هٰذِهِ الدَّعْوَةِ التَّامَّةِ وَالصَّلٰوةِ الْقَائِمَةِ اٰتِ

"حضرت جابر بن عبداللہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص اذان سن کر یہ دعا پڑھے: "اے اللہ! میں اس دعوت کامل اور (تاقیامت) قائم ہونے والی نماز کے

مُحَمَّدًا ۨالْوَسِيْلَةَ وَالْفَضِيْلَةَ وَابْعَثْهُ الْمَقَامَ الْمَحْمُوْدَ ۨالَّذِيْ وَعَدْتَّهٗ اِنَّكَ لَاتُخْلِفُ الْمِيْعَادَ حَلَّتْ لَهٗ شَفَاعَتِيْ (السنن الکبریٰ للبیہقی ص: ۴۰۱ مطبوعہ ملتان)	وسیلے سے تجھ سے التجا کرتا ہوں کہ تو محمد ﷺ کو مقام وسیلہ اور فضیلت عطا فرما اور انہیں اس مقام محمود پر فائز فرما جس کا تو نے ان سے وعدہ فرمایا ہے، بلاشبہ تو وعدے کے خلاف نہیں فرماتا" تو اس کیلئے (قیامت کے دن) میری شفاعت جائز ہو جائے گی۔"

دعاء بعد الاذان میں "اِنَّكَ لَاتُخْلِفُ الْمِيْعَادَ" کا جملہ بعینہٖ اور بلفظہٖ مندرجہ بالا حدیث مبارک سے لفظاً ماخوذ ہے۔

(۴) رہا معترضین کا یہ سوال کہ اس دعا سے توہین رسالت کا پہلو نکلتا ہے اور حضور ﷺ کو توچودہ سو سال قبل ہی اللہ تعالیٰ نے یہ مقامات رفیعہ عطا فرما دیئے تھے، ہماری دعاؤں کی ان کو کیا احتیاج ہے؟ وغیرہ، تو اس سلسلے میں گزارش ہے کہ یہ کتاب و سنت اور دین کے مزاج سے ناواقفی کی بناء پر ہے، ورنہ معمولی تامل بھی فرماتے تو یہ اشکال رفع ہو جاتا۔ تاہم اس کی چند توجیہات درج ذیل ہیں:

(الف) نبی کریم ﷺ کیلئے مقام وسیلہ، فضیلت، درجہ رفیعہ اور مقام محمود کی اللہ تعالیٰ سے دعا کرنے سے یہ مقصد ہرگز نہیں کہ حضور ﷺ کو ہماری دعاؤں کی احتیاج ہے۔ بلکہ اس کے ذریعے رسول اللہ ﷺ کی ذات سے اپنی محبت، عقیدت اور اخلاص کا اظہار مقصود ہے جو بلاشبہ ہمارے لئے دنیا و آخرت میں فلاح و نجات کا باعث ہے۔ کیا ہم اللہ تعالیٰ کی عبادت، تسبیح اور تحمید اس لئے کرتے ہیں کہ معاذ اللہ! اللہ تعالیٰ کو اس کی حاجت ہے؟، نہیں ہرگز نہیں، بلکہ ہماری بندگی کا تقاضا ہے اور اس کا فیض خود ہماری ہی ذات کو پہنچتا ہے۔

(ب) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا یعنی اے ایمان والو! تم ان پر درود بھیجو اور خوب سلام بھیجا کرو"، نبی کریم ﷺ پر

درود بھیجنے کا مطلب اللہ تعالیٰ کی ذات سے ان پر نزول رحمت کی دعا مانگنا ہے، حالانکہ وہ تو پہلے ہی اللہ تعالیٰ کی بے پایاں رحمتوں، برکتوں اور انوار و تجلیات کا مہبط و منبع ہیں بلکہ "رحمة للعالمين" ہیں تو پھر یہ حکم کیوں ؟اس کی حکمت تک ہم پہنچ سکیں یا نہیں، ہم پر اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل واجب ہے۔اسی طرح دعاء بعد الاذان میں بھی ارشاد رسول ﷺ کی تعمیل ضروری ہے اور ہم اس پر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں یقیناً ماجور ہوں گے۔

(ج) اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں درجات و مراتب کی کوئی انتہا نہیں ہے بلکہ یہ لامتناہی ہیں۔ اس لئے ایک درجے کے بعد دوسرے درجے اور ایک مرتبے کے بعد دوسرے مرتبے کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ بالکل ممکن ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کریم ﷺ کیلئے ارشاد فرمایا:

وَعَلَّمَكَ مَالَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ط وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيماً

"اور آپ جو کچھ نہیں جانتے تھے، وہ (سب کچھ) اس (اللہ) نے آپ کو سکھادیا اور آپ پر اللہ کا بڑا فضل ہے۔ (النسآء : ۱۱۳)"

اللہ تعالیٰ نے سب کچھ اور کائنات میں سب سے زیادہ علم عطا کرنے کے باوجود اپنے حبیب کریم کو یہ دعاء مانگنے کی تلقین فرمائی: "وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِىْ عِلْمًا" "اور کہہ دیجئے! اے میرے رب میرے علم میں اضافہ فرما (طٰہٰ : ۱۱۴)" ایسا کیوں ؟اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں درجات علم کی کوئی انتہا نہیں ہے، اس لئے اس کی بارگاہ سے زیادہ اور مزید زیادتی کی دعاء علم یا مراتب علم کی کمی کی طرف مشیر نہیں بلکہ ان میں اضافے کی دلیل ہے۔

(د) اگر یہ کہا جائے کہ جو مقام رفعت و فضیلت پہلے سے حاصل ہو، اس کیلئے دعاء کرنے کا کیا جواز ہے؟ تو جواباً عرض ہے کہ رسول اللہ ﷺ نہ صرف یہ کہ روز اوّل سے مہدی یعنی ہدایت یافتہ تھے بلکہ ساری امت کیلئے ہادی و مرشد بن کر تشریف لائے تھے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

قَدْ جَآءَ كُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ○ يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَيُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ

"بے شک جلوہ گر ہوا تمہارے پاس اللہ کی طرف سے نور اور روشن کتاب، اللہ اس کے ذریعے سلامتی کی راہوں پر لاتا ہے ان لوگوں کو جو اس کی رضا کے طالب ہیں اور اپنے ارادہ سے انہیں تاریکیوں سے نکالتا ہے نور کی طرف۔"

(سورۃ المائدہ آیت نمبر ۱۵-۱۶)

اس کے باوجود آپ ہر نماز کی ہر رکعت میں سورۃ فاتحہ کے اندر اپنے رب ذوالجلال سے دعاء مانگتے تھے۔ "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ" یعنی "اے اللہ تو ہمیں سیدھے راستے پر چلا" اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے عطائے نعمت اور بندے کی طرف سے حصولِ نعمت کے باوجود بقاء ودوامِ نعمت کیلئے مسلسل بارگاہِ الوہیت میں رجوع کی ضرورت رہتی ہے اور یہ تشکرِ نعمت کی ایک بہترین صورت بھی ہے۔

(۵) "دعاء بعد الاذان" پر ایک اور اعتراض بھی کیا جاتا ہے کہ احادیث میں "حَلَّتْ لَهٗ شَفَاعَتِیْ"، "حَلَّتْ عَلَيْهِ شَفَاعَتِیْ"، "حَلَّتْ عَلَيْهِ الشَّفَاعَةُ"، "حُقَّتْ لَهُ الشَّفَاعَةُ"، "وَجَبَتْ لَهُ الشَّفَاعَةُ" اور "جَعَلَهُ اللّٰهُ فِیْ شَفَاعَتِیْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ" کے الفاظ تو آتے ہیں لیکن "وَارْزُقْنَا شَفَاعَتَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ" بہ انداز دعا کے الفاظ نہیں آئے، مذکورہ بالا الفاظ بطور وعدہ اور بشارت کے ہیں، یعنی جو صاحب ایمان اذان کے بعد یہ دعاء مانگے وہ رسول اللہ ﷺ کی شفاعت کا آخرت میں حقدار قرار پائے گا، اسی وعدہ اور بشارت کے کلمات سے اکتساب فیض کرتے ہوئے دعاء کے آخر میں دعاء شفاعت کے کلمات شامل کر دیئے گئے ہیں جو معنیً حدیث کے عین مطابق ہے۔ لیکن معترض کی تسلی کیلئے یہ عرض ہے کہ ایک اور روایت میں یہ دعائیہ کلمات لفظاً بھی مذکور ہیں، ملاحظہ فرمائیے :

عَنْ اِبْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ نَبِیَّ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: مَنْ سَمِعَ النِّدَآءَ فَقَالَ اَشْهَدُاَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلاَّ اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِیْكَ لَهٗ وَاَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ ، اَللّٰهُمَّ صَلِّ وَبَلِّغْهُ دَرَجَةَ الْوَسِیْلَةِ عِنْدَكَ وَاجْعَلْنَا فِیْ شَفَاعَتِهٖ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ وَجَبَتْ لَهُ الشَّفَاعَةُ۔ (المعجم الکبیر ص :۶۶ حدیث ۱۲۵۵۴، الجزء الثانی عشر، داراحیاء التراث العربی)

ترجمہ : حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جو شخص اذان سن کر یہ دعاء پڑھے : میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں، وہ ایک ہے، اس کا کوئی شریک نہیں اور یہ کہ محمد ﷺ اس کے بندے اور رسول ہیں، اے اللہ! ان پر اپنی رحمت نازل فرما اور انہیں اپنے پاس "درجہء وسیلہ" پر پہنچا اور ہمیں روزِ قیامت ان کی شفاعت نصیب فرما، تو اس کیلئے شفاعت (نبی کریم ﷺ کے ذمہء کرم پر) واجب ہے۔

اس حدیث پاک میں "دعاءِ شفاعت" کے کلمات بھی صراحۃً مذکور ہیں۔ (یہ حدیث مجمع الزوائد جلد نمبر۱ص :۳۳۳ پر بھی درج ہے۔)

(۵) رہا یہ سوال کہ متفرق احادیث میں روایت کئے گئے کلمات کو یکجا کرنے کا کیا جواز ہے؟ تو اس سلسلے میں عرض ہے کہ اس کی متعدد مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں، مثلاً کلمہء طیبہ "لَآ اِلٰهَ اِلاَّ اللّٰهُ مُحَمَّدٌ" رَّسُوْلُ اللّٰهِ "کلمہء اسلام کہلاتا ہے۔ لیکن یہ قرآن مجید میں یکجا کسی ایک مقام پر مذکور نہیں ہے بلکہ "لَآ اِلٰهَ اِلاَّ اللّٰهُ" "سورہ محمد" کی آیت نمبر۱۹ اور "مُحَمَّدٌ" رَّسُوْلُ اللّٰهِ" "سورہ الفتح" کی آیت نمبر ۲۹ سے ماخوذ ہے اور دونوں متفرق کلمات کو یکجا کر کے "کلمہء طیبہ" کی تکمیل ہوتی ہے۔ اسی طرح "نمازِ جمعہ" کی پہلی چار سنتیں اور فرض جمعہ کے بعد چھ سنتیں کسی ایک حدیث میں یکجا مروی نہیں ہیں بلکہ متفرق احادیث کو یکجا کر کے ان پر عمل کیا جاتا ہے۔ اسی طرح قرآن مجید میں ارکانِ صلوٰۃ کسی ایک مقام پر ترتیب کے ساتھ ذکر نہیں کئے گئے بلکہ متعدد

متفرق آیات میں وہ الگ الگ مذکور ہیں۔ لیکن چونکہ سارا قرآن باہم مربوط ہے اور اس کی آیات ایک دوسرے کی تصدیق و تکمیل کرتی ہیں، اس لئے متفرق آیات میں الگ الگ مذکور ارکانِ صلوٰۃ کو ایک ترتیب سے مرتب انداز میں بیان کیا جاتا ہے اور ان پر عمل کیا جاتا ہے۔

(۶) ''دعاء بعد الاذان'' کی احادیث کے چند حوالہ جات درج ذیل ہیں:

۱- صحیح البخاری الجزء الاول ص: ۱۰۹۱ حدیث نمبر ۶۱۴، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت ۔ ن

۲- صحیح مسلم الجزء الاول ص: ۲۸۹ حدیث نمبر ۷۵۳، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت لبنان

۳- سنن الترمذی الجزء الاول ص: ۲۵۳ حدیث نمبر ۲۱۱، مطبوعہ دار الفکر، بیروت

۴- سنن ابی داؤد الجزء الاول ص: ۱۸۶ حدیث نمبر ۵۲۹، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت، لبنان

۵- سنن ابی داؤد الجزء الاول ص: ۱۸۴-۱۸۵ حدیث نمبر ۵۲۳، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت، لبنان

۶- سنن النسائی الجزء الاول ص: ۳۵۵-۳۵۶ حدیث نمبر ۶۷۹، مطبوعہ مکتبہ المؤید ریاض۔ سعودی عرب

۷- سنن ابن ماجہ الجزء الاول ص: ۳۹۹ حدیث نمبر ۷۲۲، مطبوعہ دار المعرفہ، بیروت، لبنان

۸- السنن الکبرٰی ص: ۴۱۰، مطبوعہ نشر السنۃ ملتان

۹- المصنف للحافظ عبد الرزاق الجزء الاول ص: ۴۹۵-۴۹۶ حدیث نمبر ۱۹۱۱، مطبوعہ المجلس العلمی پاکستان

۱۰- المعجم الکبیر الجزء الثانی ص: ۶۶ حدیث نمبر ۱۲۵۵۴، مطبوعہ دار الاحیاء التراث العربی، لبنان

۱۱- المعجم الاوسط الجزء الرابع ص: ۳۹۷ حدیث نمبر ۳۶۷۵، مطبوعہ مکتبۃ الریاض، سعودی عرب

(۷) محولہ بالا احادیث میں سے حدیث نمبر ۲ اور حدیث نمبر ۵ میں رسول اللہ ﷺ نے موذن کے ساتھ کلمات اذان دہرانے کا حکم فرمایا ہے اور فرمایا کہ اس کے بعد مجھ پر درود پڑھو کیونکہ جو صاحب ایمان مجھ پر درود بھیجے گا، اللہ تعالیٰ اس پر دس رحمتیں نازل فرمائے گا۔ لہذا افضل اور مسنون امر یہ ہے کہ اذان کے بعد اولاً درود شریف پڑھا جائے اور اس کے بعد مسنون دعا پڑھی جائے۔ اس سے انشاء اللہ اجر و ثواب میں بے پایاں اضافہ ہو گا اور فرمانِ رسول ﷺ کی کماحقہ تعمیل بھی ہو گی۔

(۸) میرے نزدیک زیر بحث دعاء مسنون بعد الاذان کا مناسب ترجمہ یہ ہے:

ترجمہ: "اے اللہ اس دعوت کامل اور تا قیامت قائم ہونے والی نماز کے رب تو محمد ﷺ کو جنت میں نمایاں مقام، فضیلت اور بلند درجہ عطا فرما اور انہیں اس مقامِ محمود پر فائز فرما جس کا تو نے ان سے وعدہ فرمایا ہے اور قیامت کے دن ہمیں ان کی شفاعت نصیب فرما، بے شک تو وعدے کے خلاف نہیں فرماتا۔" محولہ بالا حدیث نمبر ۲ اور ۵ میں نبی کریم ﷺ نے اذان کے بعد درود بھیجنے کا حکم فرمایا اور اس کے بعد فرمایا کہ: "پھر اللہ عزوجل سے میرے لئے "الوسیلہ" کی دعا مانگو کیونکہ یہ جنت میں ایک نمایاں اور ممتاز مقام ہے، جو اللہ تعالیٰ کے صرف ایک بندۂ خاص ہی کے شایانِ شان ہے اور مجھے یقین ہے کہ وہ بندۂ خاص میں ہی ہوں گا۔" ان احادیث مبارکہ کی روشنی میں، میں نے "الوسیلہ" کا ترجمہ "جنت میں نمایاں مقام" کیا ہے اس طرح حدیث کی صحیح ترجمانی ہو گی اور رسول اللہ ﷺ کی منشا بھی واضح ہو جائے گی۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو حق سمجھنے اسے قبول کرنے اور اس پر عمل پیرا ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔

تثویب کیا ہے؟

سوال: کیا اذان کے بعد تثویب کہنا جائز ہے؟

(مولانا عبدالعزیز فیضی، مدینہ مسجد، خداداد کالونی)

جواب : "تثویب" کسی اعلان کے دوبارہ اعلان کرنے کو کہتے ہیں، فقہی اصطلاح میں تثویب کے معنی ہیں اذان اور اقامت کے درمیان "نماز باجماعت" کا دوبارہ اعلان کرنا کیونکہ اذان بھی فی نفسہ ایک اعلان ہے۔ فتاویٰ شامی میں ہے کہ مغرب کے سوا باقی تمام نمازوں کیلئے تثویب جائز ہے کیونکہ دینی امور میں لوگوں میں سستی کا رجحان پیدا ہو گیا ہے۔ علامہ شامی نے لکھا ہے کہ "قامت قامت" (یعنی نماز کھڑی ہو رہی ہے) یا "الصلوٰۃ الصلوٰۃ" یا جو بھی لوگوں کے درمیان اس مقصد کیلئے متعارف کلمات ہوں جائز ہیں، جیسے کراچی کی بعض مساجد میں "الصلوٰۃ والسلام علیک یا رسول اللہ" پڑھا جاتا ہے، علامہ شامی عنایہ کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ اصلاً تو تثویب نماز فجر کیلئے شروع ہوئی تھی لیکن بعد میں متاخرین فقہاء نے اسے مغرب کے علاوہ تمام نمازوں کیلئے جاری کر دیا، اور جس بات کو مسلمان اچھا سمجھیں وہ اللہ کو بھی پسند ہوتی ہے۔ (ردالمحتار جلد نمبر ۱ ص: ۲۶۴ مطبوعہ بیروت) فتاویٰ عالمگیری جلد نمبر ۱ صفحہ نمبر ۵۶ پر ہے تثویب فجر کے سوا ہر نماز میں متاخرین کے نزدیک مستحسن ہے۔

بیت الخلاء میں اذان کا جواب

سوال : اگر بیت الخلاء میں اذان کی آواز سنائی دے تو کیا اس کا جواب دے سکتے ہیں؟

(سید محبوب شاہ، قائد آباد۔ کراچی)

جواب : بیت الخلاء میں اذان کی آواز سنائی دے تو جواب نہیں دینا چاہئے۔ وہاں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول مکرم ﷺ کا نام لینا یا قرآن کی تلاوت کرنا یا تسبیحات و درود پڑھنا یا کلماتِ اذان کو دہرانا خلافِ ادب ہے اور گناہ ہے۔

خطبے کے دوران کلام اور نشست کے آداب

سوال : اذانِ خطبہ کا جواب اور دعا مقتدی کو آواز سے پڑھنا چاہئے یا نہیں؟ دورانِ خطبہ آیت درود آجائے تو مقتدی کو درود آواز سے پڑھنا چاہئے یا نہیں؟ اور خطبے کے دوران نمازیوں کو کس طرح بیٹھنا چاہئے؟

(مولانا عبدالعزیز فیضی، جامع مسجد خداداد کالونی۔ کراچی)

جواب: بہتر ہے کہ نمازی اذان خطبہ کے کلمات کا اعادہ اور بعد الاذان دعا آواز سے پڑھنے کے بجائے دل میں پڑھیں۔ اسی طرح اگر امام خطبے کے دوران آیت درود پڑھے تو نمازی آواز سے درود پاک پڑھنے کے بجائے دل میں پڑھیں۔ خطبۂ جمعہ کے دوران مقتدیوں کیلئے کسی خاص ہیئت میں بیٹھنے کا لازمی حکم نہیں ہے، بس اتنا ضروری ہے کہ صف بستہ ہو کر باادب بیٹھیں، ہو سکے تو اس طرح بیٹھیں جیسے حالت تشہد میں بیٹھتے ہیں، لیکن اگر کسی کو زیادہ دیر تک اس طرح بیٹھنے میں دشواری ہو تو وہ جس طرح بیٹھنے میں آسانی محسوس کرے، اس طرح بیٹھ جائے۔

نماز کی نیت میں تاخیر

سوال: رمضان المبارک کی نماز تراویح میں یہ دشواری پیش آتی ہے کہ مقتدی کو نیت کے الفاظ ادا کرنے میں کچھ وقت لگ جاتا ہے اور اس عرصے میں حافظ صاحبان قرأت شروع کر دیتے ہیں اور ہم لوگ ثناء (سبحانك اللهم) نہیں پڑھ پاتے؟

(سید عزیز بدر فی۔ دستگیر کالونی)

جواب: نیت دل کے ارادے کا نام ہے یعنی یہ کہ انسان کے ذہن میں یہ بات بالکل مستحضر ہو کہ آپ کون سی نماز پڑھ رہے ہیں، کتنی رکعات ہیں، وقت کا تعین وغیرہ۔ لفظاً نیت کرنے کو متاخرین فقہاء امت نے محض اس غرض سے مستحسن قرار دیا کہ توجہ مقصد کی جانب مرکوز ہو جائے، ذہنی انتشار نہ رہے، لہٰذا اگر بھی آپ لفظاً نیت نہ بھی کریں لیکن حضوریٔ ذہن ہے تو تکبیر تحریمہ اللہ اکبر کہہ کر نماز شروع کر دیجئے، اجر میں کوئی کمی نہیں آئے گی، انشاء اللہ۔ اور نماز تراویح میں تو ۲۰ رکعات کی نیت (دس دوگانہ کی صورت میں) ایک ساتھ بھی کر سکتے ہیں، بار بار نیت کے الفاظ دہرانا ضروری نہیں ہے۔

رکوع اور سجود میں کتنی دیر ٹھہرے

سوال: رکوع و سجود میں کتنی دیر ٹھہرنا فرض ہے؟ (سید محمد علی، اورنگی ٹاؤن۔ کراچی)

جواب: رکوع و سجود میں ایک مرتبہ "سبحان اللہ" کہنے کی مقدار ٹھہرنا فرض ہے، اس

سے کم وقفہ کیا تو رکوع اور سجدہ ادا نہیں ہوں گے۔ تین بار رکوع و سجود کی تسبیحات پڑھنا سنت ہے اور اتنی دیر تک ٹھہرے رہنا بھی سنت ہے، تین سے زیادہ طاق مرتبہ تسبیحات پڑھنا مستحب ہے۔

تشہد میں انگشتِ شہادت سے اشارہ کرنا

سوال: قعدۂ نماز میں انگشت شہادت سے اشارہ کرنے کی شرعاً کیا حیثیت ہے اور اس کا صحیح طریقہ کیا ہے؟ (سہیل ساجد، کیماڑی۔ کراچی)

جواب: (۱) صحیح مسلم میں حدیث ہے: "حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب نماز میں بیٹھتے تو اپنے ہاتھ اپنے گھٹنوں پر رکھتے اور جو انگلی انگوٹھے کے قریب ہے اس سے اشارہ کرتے دراں حالیکہ آپ کا بایاں ہاتھ بائیں گھٹنے پر بچھا ہوتا۔"

(۲) "حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما ہی سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب تشہد میں بیٹھتے تو بایاں ہاتھ بائیں گھٹنے پر رکھتے اور دایاں، دائیں پر اور شہادت کے وقت ترپن کا عقد بناتے اور انگشت شہادت سے اشارہ کرتے۔"

اس موضوع پر احادیث مبارکہ بکثرت ہیں اور حدِ شہرت کو پہنچی ہوئی ہیں۔ الفقہ علی المذاهب الاربعہ مؤلفہ عبدالرحمٰن الجزیری میں ہے: "امام ابو حنیفہ، امام مالک اور امام شافعی کے نزدیک سبابہ (انگشت شہادت) کے سوا تمام انگلیوں کے ساتھ مٹھی بند کرے اور سبابہ سے اشارہ کرے اسی کو ترپن کا عقد کہتے ہیں، اور امام احمد بن حنبل کے نزدیک خنصر اور بنصر (چھنگلی اور اس کے برابر والی انگلی) کو بند کرے اور درمیانی انگلی کو انگوٹھے کے ساتھ ملا کر حلقہ بنائے اور انگشت شہادت سے اشارہ کرے۔ امام ابو حنیفہ کے نزدیک "اشهد ان لا اله الا اللہ" میں "لا" پر انگلی اٹھائے اور "الا" پر رکھ دے، تاکہ نفی کے ساتھ رفع (انگلی اٹھانے) اور اثبات کے ساتھ وضع (انگلی رکھنے) کی مناسبت ہو۔ امام احمد بن حنبل اور امام شافعی کے نزدیک لفظ اللہ پر انگلی اٹھائے تاکہ قول اور عمل سے

توحید ظاہر ہو۔ ائمہ ثلاثہ ترپین کا عقد بنانے کے قائل ہیں اور امام احمد بن حنبل حلقہ بنانے کے قائل ہیں اور دونوں طریقے حدیث سے ثابت ہیں۔ الغرض رفعِ سبابہ پر ائمہ اربعہ اور احناف کے تینوں ائمہ کا اجماع ہے۔ بعض متاخرین فقہاءِ احناف کے اقوال کی روشنی میں حضرت مجدد الف ثانی التحیات میں کلمۂ شہادت پڑھتے وقت انگشت شہادت اٹھانے کو جائز نہیں سمجھتے، علامہ غلام رسول سعیدی نے شرح صحیح مسلم جلد ثانی صفحات ۱۶۸ تا ۱۷۷ میں حضرت مجدد الف ثانی کا موقف تفصیل کے ساتھ بیان کر کے ان کے دلائل کا جواب دیا ہے۔ علمی ذوق رکھنے والے حضرات اس مقام کا مطالعہ کریں۔

نمازی امام کو رکوع میں پائے تو کیا کرے؟

سوال: ایک نمازی مسجد میں پہنچا، اس وقت امام رکوع میں تھا۔ مقتدی نیت کر کے پہلے ہاتھ باندھ کر "سبحانک اللھم" پڑھے یا صرف ہاتھ باندھ کر رکوع میں چلا جائے۔

(زاہد حسین، مانسہرہ کالونی۔ کراچی)

جواب: جب نمازی مسجد میں دخل ہو اور امام کو رکوع میں پائے، تو سب سے پہلے، دیکھے کہ اسے صف میں کہاں کھڑا ہونا ہے، اگر پہلی صف مکمل ہے تو نئی صف میں درمیان میں امام کے بالکل پیچھے کھڑا ہو، اگر اس صف میں پہلے سے کچھ نمازی کھڑے ہیں تو وسط صف سے جس طرح آدمی کم ہوں، اس طرف کھڑا ہو جائے۔ اگر دونوں طرف آدمی برابر ہوں تو پھر دائیں جانب کھڑا ہو، پہلے بالکل سیدھا کھڑا ہو کر نیت کرے اور تکبیر تحریمہ (اللہ اکبر) کہے، پھر دوسری تکبیر (یعنی تکبیرِ رکوع) کہہ کر رکوع میں چلا جائے اور امام کے ساتھ شامل ہو جائے۔ ہاتھ باندھنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ حالتِ قیام میں ہاتھ تب باندھے جاتے ہیں جب کچھ پڑھنا ہو، اگر یہ سمجھتا ہے کہ "سبحانک اللھم" پڑھنے سے امام رکوع سے اٹھ جائے گا تو ثناء پڑھنا چھوڑ دے۔ اگر عجلت میں سیدھا کھڑے ہوئے بغیر تکبیر تحریمہ جھکتے ہوئے کہی اور اس طرح رکوع میں چلا گیا تو فرض قیام رہ جانے سے رکعت نہیں ملے گی۔

نابالغ بچے کی امامت

سوال: بعض بچے کم عمری میں قرآن مجید حفظ کر لیتے ہیں، کیا نابالغ بچے کی اقتدا میں نماز تراویح پڑھی جاسکتی ہے ؟ (سید عمیر الحسن، فیڈرل بی ایریا)

جواب: تراویح کی امامت کا شرعی معیار بھی وہی ہے جو فرض نمازوں کا ہے لہذا نابالغ بچے کی اقتدا میں نمازِ تراویح کا پڑھنا جائز نہیں ہے۔ اسی طرح داڑھی منڈے حافظِ قرآن کی امامت بھی جائز نہیں ہے۔

سورۃ الکوثر کی صرف دو آیتیں پڑھنا

محترم المقام جناب مفتی صاحب
دار العلوم نعیمیہ۔ کراچی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

صورتِ مسئولہ یہ ہے کہ ایک امام صاحب رمضان المبارک میں وتر کی نماز باجماعت پڑھا رہے تھے، انہوں نے ایک رکعت میں سورۂ فاتحہ کے بعد سورۃ الکوثر کی قرأت شروع کی، ابتدائی دو آیات پڑھیں مگر تیسری آیت یاد نہ رہی، انہوں نے ایک بار ابتدائی آیات کا تکرار بھی کیا مگر اس کے باوجود تیسری آیت زبان پر جاری نہ ہو سکی۔ انہوں نے اسی قدر قرأت پر اکتفا کرتے ہوئے اللہ اکبر کہا اور بقیہ نماز حسب معمول مکمل کر لی، سجدۂ سہو نہیں کیا۔ امام صاحب نے یہ سمجھا کہ کم از کم مقدار واجب کی حد تک قرأت ہو چکی ہے۔ ترکِ واجب نہیں ہوا۔ لہذا سجدۂ سہو کی ضرورت نہیں ہے اور نماز بلا کراہت مکمل ہو گئی۔ اس کے برعکس بعض لوگوں کا موقف یہ ہے کہ امام کو سجدۂ سہو کرنا چاہیے تھا اور چونکہ انہوں نے سجدۂ سہو نہیں کیا، اس لئے نماز واجب الاعادہ ہے۔

اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ از روئے شرع متین امام صاحب کا موقف درست ہے یا معترضین کا؟ از روئے شرع متین وفقہ حنفی مفصل ومدلل جواب عنایت فرما کر عند اللہ ماجور ہوں اور حق وصواب کی طرف ہماری رہنمائی فرمائیں۔

المستفتی
عبد الرزاق
مانسہرہ، ہزارہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب ھو الموفق للصواب بتوفیق اللہ تعالیٰ وعونہ

صورتِ مسئولہ کا براہِ راست اور مختصر جواب یہ ہے کہ امام صاحب کا موقف درست ہے اور معترضین کا اعتراض بے جا، "سورۃ الفاتحہ" کے بعد "سورۃ الکوثر" کی ابتدائی دو آیات پڑھنے سے "ضم سورۃ" کا واجب ادا ہو گیا اور قرأت بہ مقدارِ واجب ہو گئی، ترکِ واجب نہیں ہوا، لہٰذا سجدۂ سہو کی ضرورت نہیں، کیونکہ "سورۃ الکوثر" کی ابتدائی دو آیات کے حروف کی مجموعی تعداد تیس بن جاتی ہے اور علامہ محمد امین ابن عابدین شامی علیہ الرحمہ نے اسقاطِ واجب کیلئے اسی کو معیار قرار دیا ہے۔

تفصیلی دلائل حسبِ ذیل ہیں:

نماز میں سورۃ الفاتحہ کے ساتھ "ضم سورۃ" کے وجوب کیلئے مندرجہ ذیل احادیث مبارکہ وارد ہوئی ہیں:

۱- عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ نِ الْخُدْرِیِّ قَالَ اَمَرَنَا نَبِیُّنَا صلی اللہ علیہ وسلم اَنْ نَّقْرَءَ الْفَاتِحَۃَ وَمَا تَیَسَّرَ۔
(صحیح ابن حبان ج ۳ ص: ۲۱۱، ابوداؤد ج ۱ ص: ۱۱۸)

حضرت ابوسعید خدری کہتے ہیں آنحضرت ﷺ نے ہمیں حکم دیا کہ ہم نماز میں فاتحہ اور جو کچھ میسر ہو قرآن میں سے پڑھیں۔

۲- عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ (مرفوعا) لَاصَلٰوۃَ اِلَّا بِفَاتِحَۃِ الْکِتٰبِ فَمَا زَادَ۔ وَقَالَ الْحَاکِمُ ھٰذَا حَدِیْثٌ صَحِیْحٌ لَاغُبَارَ عَلَیْہِ۔
(ابوداؤد ج ۱ ص: ۱۱۸، ومستدرک حاکم ج ۱ ص: ۲۳۹)

حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ نماز فاتحہ اور کچھ زائد حصے کے بغیر نہیں ہوتی۔

۳- لَاصَلٰوۃَ لِمَنْ لَمْ یَقْرَءْ بِفَاتِحَۃِ الْکِتٰبِ فَصَاعِدًا۔ (مسلم ج ۱ ص: ۱۶۹، نسائی ج ۱ ص: ۱۴۵)

سورۃ فاتحہ اور کچھ زائد حصے کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔

۴- لَاصَلٰوۃَ لِمَنْ لَمْ یَقْرَءْ بِالْحَمْدِ وَسُوْرَۃٍ فِیْ فَرِیْضَۃٍ اَوْ غَیْرِھَا۔ (ترمذی ص: ۶۱ ابن ماجہ ص: ۶۰، مصنف ابن ابی شیبہ ج ۱ ص: ۳۶۱)

نماز الحمد (سورۃ فاتحہ) اور کسی سورۃ کے ملانے کے بغیر نہیں ہوتی خواہ نماز فرض ہو یا اس کے علاوہ۔

۵- لَاصَلٰوۃَ اِلاَّ بِفَاتِحَۃِ الْکِتٰبِ وَاٰیَتَیْنِ (اَیْ طَوِیْلَتَیْنِ)۔ (شرح نقایہ ج ۱ ص: ۷۹، کنز العمال ج ۷ ص: ۳۱۴ بحوالہ طبرانی)

سورۃ فاتحہ اور دو لمبی آیتوں کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔

۶- لَاتَجْزِی الْمَکْتُوْبَۃُ اِلاَّ بِفَاتِحَۃِ الْکِتٰبِ وَثَلَاثِ اٰیَاتٍ فَصَاعِدًا۔ (کنز العمال ج ۷ ص: ۳۱۳ بحوالہ ابن عدی عن ابن عمر و نصب الرایہ ج ۱ ص: ۳۶۵)

فرض نماز نہیں ہوتی سورۃ فاتحہ اور تین آیات یا اس سے کچھ زیادہ کے بغیر۔

۷- لَاتَجْزِیْ صَلٰوۃٌ لَایُقْرَءُ فِیْھَا بِفَاتِحَۃِ الْکِتٰبِ وَشَیْءٍ مَعَھَا مِنَ الْقُرْاٰنِ۔ (نصب الرایہ ج ۱ ص: ۳۶۵ بحوالہ ابو نعیم)

وہ نماز درست نہیں ہوتی جس میں سورۃ فاتحہ اور کچھ حصہ قرآن کا نہ پڑھا جائے۔

۸- عَنْ رِفَاعَۃَ بْنِ رَافِعٍ مَرْفُوْعًا اِذَا اسْتَقْبَلْتَ الْقِبْلَۃَ فَکَبِّرْ ثُمَّ اقْرَءْ بِاُمِّ الْقُرْاٰنِ ثُمَّ اقْرَءْ بِمَا شِئْتَ۔ (صحیح ابن حبان ج ۳ ص: ۲۰۹، واللفظ لہ وابوداؤد ج ۱ ص: ۱۲۵)

حضرت رفاعہ بن رافع سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا "جب تم نماز کیلئے قبلہ رخ ہو تو پہلے تکبیر کہو۔ پھر سورۃ فاتحہ پڑھو اور پھر قرآن میں جو حصہ چاہو پڑھو۔

ان احادیث طیبہ کو علامہ وصی احمد محدث سورتی متوفی ۱۳۳۴ھ نے اپنی تصنیف التعلیق المجلی حاشیة منیة المصلی میں "ضم السورة او مایقوم مقامها من الایات الیها" کے حاشیہ پر (صفحہ نمبر ۲۷۲) یکجا کیا ہے۔ ان احادیث طیبہ میں سورۃ الفاتحہ کے ساتھ وجوب قرأت کیلئے فصاعدا (کچھ زائد)، اوغیرھا (اس کے علاوہ)، وا'یتین (اور دو آیات) مَاتَیَسَّرَ (جو بھی آسان ہو)، مَازَادَ (کچھ زائد)، ثلاثِ ا'یاتٍ (تین آیات)، وشیٔ معها من القرآن (قرآن کا کچھ حصہ) اور ثم اقرءُ بما شئت (پھر قرآن میں سے جو حصہ چاہو پڑھو) کے الفاظ وارد ہیں، جن کا منشایہ ہے کہ اس کا مدار یُسر پر ہے اور دو یا تین آیات سے بھی اسقاطِ واجب ہو جاتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے ان ارشادات مبارکہ کی روشنی میں فقہاء کرام نے "ضم سورۃ" یعنی سورۃ الفاتحہ کے بعد قرأت کی مقدار واجب کیلئے ضوابط بیان کئے ہیں اور مسائل کا استنباط کیا ہے۔ زیر بحث مسئلہ سے متعلق چند اہم حوالہ جات درج ذیل ہیں:

۱- علامہ ابراہیم بن محمد بن ابراہیم الحلبی متوفی ۹۵۶ھ اپنی تصنیف صغیری شرح منیة المصلی صفحہ ۱۶۷ (مطبوعہ مطبع مجتبائی دھلی ۱۳۴۸ھ) پر رقم طراز ہیں:

ثم یضم الی الفاتحة سورة او ثلاث ا'یات قصار قدراقصر سورة وجوبا فان قرء مع الفاتحة ا'یة قصیرة او ایتین قصیرتین لم یخرج عن حد الکراهة ای کراهة التحریم لترك الواجب وان قرأ ثلاث ا'یات قصار او کانت الأیة والأیتان تعدل ثلث ا'یات قصار خرج عن حدالکراهة المذکورة۔

۲- مصنف مذکور اپنی تصنیف غنیۃ المستملی شرح منیۃ المصلی (المعروف کبیری) صفحہ ۳۵۵ (مطبع ہوپ لاہور ۱۲۸۳ھ) پر لکھتے ہیں:

ثم یضم الی الفاتحة سورة اوثلث ا'یات قصار قد را قصر سورة و تقدم ان ذالك واجب کالفاتحة فان قرء مع الفاتحة آیةقصیرة او آیتین قصیرتین لم یخرج عن حدالکراهة ای کراهة التحریم لاخلاله بالواجب وان قرء ثلث ا'یات قصار اوکانت الآیة والآیتان تعدل ثلث ایات قصار خرج عن حدالکراهة المذکورة۔

علامہ حلبی کی ان دونوں عبارات کا خلاصہ یہ ہے کہ نماز میں سورۃ الفاتحہ کے ساتھ "ضم سورۃ" یا تین چھوٹی آیات کا ملانا واجب ہے، لہذا اگر نماز میں سورۃ الفاتحہ کے ساتھ ایک یا دو آیات

قصیرہ (چھوٹی آیات) پڑھیں تو ترک واجب کی وجہ سے یہ مکروہ تحریمی ہوگا (اور اس کی تلافی کیلئے سجدۂ سہو لازم ہوگا) لیکن اگر تین آیات قصار (چھوٹی آیات) پڑھیں یا ایک آیت طویلہ یا دو ایسی آیات پڑھیں جو تین "آیات قصار" کے برابر ہیں تو مکروہ تحریمی کا ارتکاب لازم نہیں آئے گا (لہذا اسقاطِ واجب کی بناء پر نماز صحیح طور پر ادا ہو جائے گی اور سجدۂ سہو لازم نہیں ہوگا)۔

۳- علامہ احمد بن اسماعیل الطحطاوی الحنفی متوفیٰ ۱۲۳۱ھ حاشیہ مراقی الفلاح شرح نور الایضاح للشیخ حسن بن عمار بن علی الشرنبلالی الحنفی متوفی ۱۰۶۹ھ کے صفحہ ۱۴۸ (مطبوعہ مطبع مصطفیٰ البابی الحلبی مصر ۱۳۵۶ھ) پر رقم طراز ہیں:

(قولہ او ثلاث ایات قصار) قدر اقصر سورۃ او آیۃ طویلۃ تعدل ثلاث آیات قصار۔

یعنی نماز میں سورۃ الفاتحہ کے ساتھ تین آیات قصار یا ایک آیت طویلہ جو تین آیات قصار کے برابر ہو کا ملانا واجب ہے۔

۴- علامہ شاہ محمد مظہر اللہ دہلوی رحمہ اللہ متوفی ۱۳۸۶ھ لکھتے ہیں:

سوال نمبر ۱۴:- ایک مسجد کا امام الحمد کے بعد رَبُّ الْمَشْرِقَيْنِ وَرَبُّ الْمَغْرِبَيْنِ ۝ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝ پڑھ کر رکوع میں چلا جاتا ہے اس صورت میں نماز ہو جائے گی یا نہیں؟ (قاری محمد سلیمان مدرسہ عالیہ عربیہ، مسجد فتح پوری۔ دہلی)

جواب- صورت مذکورہ میں نماز تو ہو جاتی ہے لیکن امام کو ایسا نہ کرنا چاہئے کہ خلافِ سنت ہے۔ (فقط- محمد مظہر اللہ غفر اللہ لہ۔ مسجد جامع فتحپوری دہلی۔)

(بحوالہ فتاوی مظہری مطبوعہ مدینہ پبلشنگ کمپنی ۱۳۹۰ھ ص: ۱۰۶)

۵- بعینہ اسی استفتاء کے جواب میں جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن کے دار الافتاء کا فتویٰ درج ذیل ہے۔

جواب بصورت مسئولہ سورۂ کوثر کی دو آیت پڑھنے سے قرأت کا فرض ادا ہو گیا کیونکہ یہ مقدار تین چھوٹی آیتوں کے برابر ہے۔ اور امام صاحب نے بغیر سجدۂ سہو نماز مکمل کرا دی درست کیا اس صورت میں سجدۂ سہو واجب نہیں ہوتا۔ اس لئے امام صاحب کا موقف درست ہے۔

فقط

ابوبکر سعید الرحمن

دار الافتاء جامعہ علوم اسلامیہ کراچی

۶- مندرجہ بالا فقہی آراء و حوالہ جات میں "آیاتِ قِصار" کا ذکر بار بار آیا ہے، لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ "آیتِ قصیرہ" کا معیار کیا ہے؟ کیونکہ قرآن مجید میں چند آیاتِ طوال بہت واضح اور متعارف ہیں، مثلاً "سورۃ البقرہ" آیات ۱۷۷، ۲۵۵، ۲۸۲، ۲۸۶ وغیرہ، ان کے مقابلے میں اکثر آیات قِصار ہیں اور آیات کا چھوٹا بڑا ہونا ایک اضافی امر ہے، چنانچہ فقہاء کرام نے اداءِ فرض اور اسقاطِ فرض کے لئے "اَدْنٰی مَایُطْلَقُ عَلَیْهِ الْقُرْآنُ" یا "اَقْصَرُ الْآیَةِ" کو معیار قرار دیا ہے اور قرآن مجید کی سب سے چھوٹی آیت "لَمْ یَلِدْ" (الاخلاص: ۳) ہے جو صورتاً پانچ حروف پر مشتمل ہے اور تحقیقاً چھ حروف پر یا "ثُمَّ نَظَرَ" (المدثر: ۲۱) جو چھ حروف پر مشتمل ہے۔

علامہ محمد بن علی بن محمد الحصکفی المتوفی ۱۰۸۸ھ (بحوالہ ردالمحتار علی الدر المختار صفحہ ۵۰۱ جلد اول مطبوعہ استنبول ۱۳۲۷ھ) لکھتے ہیں:

(وَفَرْضُ الْقِرَاءَةِ آیَةٌ عَلَى الْمَذْهَبِ) هِیَ لُغَةً الْعَلَامَةُ وَعُرْفًا طَائِفَةٌ مِّنَ الْقُرْآنِ مُتَرْجَمَةٌ اَقَلُّهَا سِتَّةُ اَحْرُفٍ وَلَوْ تَقْدِیْرًا كَلَمْ یَلِدْ۔

اور اس کی شرح میں علامہ محمد امین ابن عابدین شامی متوفی ۱۲۵۲ھ لکھتے ہیں:

(قوله على المذهب) ای الذی هو ظاهر الروایة عن الامام وفی روایة عنه ما یطلق علیه اسم القرآن ولم یشبه قصد خطاب احد وجزم القدوری بأنه الصحیح من مذهب الامام ورجحه الزیلعی بأنه اقرب الی القواعد الشرعیة لان المطلق ینصرف الی الادنی وفی البحر فیه نظر بل ینصرف الی الکامل قلت وهو مدفوع بأن براءة الذمة لاتتوقف علی الکامل والالزم فرضیة الطمأنینة فی الرکوع والسجود قال فی شرح المنیة وعلی هذه الروایة لایجزی عنده نحو ثم نظر ای لانه یشبه قصد الخطاب والاخبار تأمل وفی روایة ثالثة عنه وهی قولهما ثلاث آیات قصار او آیة طویلة۔

ان دونوں عبارات کا خلاصہ یہ ہے کہ:

"ادائے فرض" کیلئے سب سے چھوٹی آیت ہی کافی ہے، یہ ظاہر الروایہ کے مطابق امام اعظم کا مذہب ہے۔

چنانچہ علامہ ابن عابدین شامی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ صاحب قدوری اور علامہ

زیلعی نے اسی کو امام اعظم کا مذہب صحیح قرار دیا ہے، اور یہ قواعد شرعیہ کے قریب تر بھی ہے، کیونکہ مطلق سے "فردِ ادنیٰ" ہی مراد ہوتا ہے، پھر علامہ شامی نے اس پر علامہ زین الدین ابن نجیم متوفی ۹۷۰ھ صاحب البحرالرائق کے اس اعتراض ___ کہ مطلق سے تو فردِ کامل مراد ہوتا ہے؟ ___ کا ذکر کرکے اسے رد کیا ہے کہ جب سوال "اسقاطِ فرض" اور "براءۃ الذمہ" (یعنی کسی فریضے سے عہدہ براہونا) کا ہو تو اس وقت "فردِ ادنیٰ" ہی مراد ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ہم نماز کے رکن "رکوع" کے سلسلے میں حالتِ رکوع تک محض جھکنے ہی کو اسقاطِ فرض کیلئے کافی سمجھتے ہیں کیونکہ یہی رکوع کی ادنیٰ مقدار ہے اور اگر اسقاطِ فرض کیلئے "فردِ کامل" معیار ہوتا تو رکوع میں تعدیل اور طمانینت فرض ہوتی حالانکہ ایسا نہیں ہے۔

۷- اب زیرِ بحث مسئلہ "ضم سورۃ" واجب ہے اور اس کی مقدار فقہاء احناف کی متفقہ رائے کے مطابق "تین آیاتِ قصار" ہیں یا ایسی ایک آیت طویلہ یا دو آیات جو تین آیاتِ قصار کے مساوی ہوں اور یہ بدیہی امر ہے کہ اس کیلئے فقہاء کرام کی نظر قرآن مجید کی ایسی تین آیاتِ قصار کی جانب متوجہ ہوگی جو کسی ایک مقام پر "متوالیہ" یعنی مسلسل ہوں اور وہ اکثر اجلہ فقہاء کرام کی رائے میں یہ ہیں:

ثُمَّ نَظَرَ ۝ ثُمَّ عَبَسَ وَبَسَرَ ۝ ثُمَّ اَدْبَرَ وَاسْتَكْبَرَ ۝ یعنی سورۃ المدثر" کی آیات ۲۱، ۲۲ اور ۲۳۔

چنانچہ ذیل میں ہم ان فقہاء کرام کی آراء اور عبارات باحوالہ پیش کررہے ہیں جنہوں نے ان تین آیاتِ قصار کو قرأتِ واجبہ کیلئے معیار قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ ان تین آیاتِ قصار کے برابر اگر ایک طویل آیت پڑھ لی جائے یا دو آیتیں پڑھ لی جائیں تو واجب ادا ہو جاتا ہے اور سجدۂ سہو لازم نہیں آتا۔

(ا) علامہ محمد بن علی بن محمد الحصکفی متوفی ۱۰۸۸ھ رقم طراز ہیں (بحوالہ الدرالمختار علی ہامش ردالمحتار صفحہ ۳۴۷ جلد اول مطبوعہ استنبول ۱۳۲۷ھ):

(وضم) اقصر (سورة) كالكوثر او ما قام مقامها و هو ثلاث آيات قصار نحو ثم نظر ثم عبس وبسر ثم ادبر واستكبر وكذا لو كانت الآية والآيتان تعدل ثلاثا قصارا۔

(ب) علامہ ابوالحسنات محمد عبدالحی بن عبدالحلیم لکھنوی متوفی ۱۳۰۴ھ، الہدایہ

متولفہ علامہ برہان الدین ابو الحسن علی بن ابی بکر الفرغانی المرغینانی متوفی ۵۹۳ھ کے حاشیے میں ملا الہداد کے حوالے سے صاحب ہدایہ (مطبوعہ المکتبۃ العربیہ دستگیر کالونی، کراچی) کی عبارت (متن) "ثم یقرأ بفاتحة الکتاب و سورة اوثلاث آیات من ای سورة شاء" کے حاشیہ پر صفحہ ۸۸ پر لکھتے ہیں:

قوله او ثلث آیات الخ۔ قلت او آیة طویلة ففی الذخیرة قراءة ثلث آیات قصار او آیة طویلة من واجبات الصلوٰة بالاجماع فلو قرء مع الفاتحة آیة قصیرة سهواً فعلیه السهو ذکر فی شرح اوراد انه لواکتفی مع الفاتحة علی قوله تعالیٰ: "وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّاباً رَّحِيْماً" او قوله تعالیٰ: "فَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءً اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِاللّٰهَ يَجِدِاللّٰهَ غَفُوْرًارَّحِيْمًا" کما ذکر فی الاوراد انه یقرء التحیة الوضوء الفاتحة مع الآیة الاولی فی الرکعة الاولی و مع الثانیة فی الرکعة الثانیة جاز بلا کراهة اذ الواجب مع الفاتحة هو قدر ثلث آیات قصار کما هوالمذکور فی الکتب المعتبرة والآیات القصار۔ مثل قُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ٥ ثُمَّ نَظَرَ ٥ ثُمَّ عَبَسَ وَبَسَرَ ٥

(ج) علامہ ابو الحسنات محمد عبد الحی بن عبد الحلیم لکھنوی متوفی ۱۳۰۴ھ "السعایه فی کشف مافی شرح الوقایه" مطبوعہ سہیل اکیڈمی لاہور ۱۳۹۶ھ صفحات ۱۲۹، ۱۳۰ پر رقم طراز ہیں:

وذکر المصنف السورة لیفید ان الواجب انما هو اقصر سورة الکوثر والاخلاص ومازاد علیه سنة او مندوب ولو قال وضم قدر سورة لکان اولی لماصر حوا من انه لوقرء قدرا قصر سورة نحو ثم نظر ثم عبس وبسر ثم ادبر واستکبر خرج عن عهدة الوجوب۔ ولهذا قال العینی فی شرح تحفة الملوك الواجب قرأة السورة مع الفاتحة اوقدرها انتهی۔ وفی غنیة المستملی ان قرء ثلث آیات قصار اوکانت الأیة والأیتان تعدل ثلث ایات خرج عن حدالکراهة المذکورة یعنی کراهة التحریم انتهی۔ وقال الحصکفی فی شرح ملتقی الا بحرلم اره لغیره وهو مهم فیه یسر عظیم لدفع کراهة التحریم انتهی۔

(د) علامہ الشاہ احمد رضا خان فاضل بریلوی متوفی ۱۳۴۰ھ العطایا النبویہ فی الفتاوی الرضویہ جلد سوم صفحہ نمبر ۱۵۲ پر (مطبوعہ سنی دارالاشاعت علویہ رضویہ لائل پور ۱۳۹۳ھ) ایک استفتاء کے جواب میں لکھتے ہیں:

مسئلہ: از بیکانیر مارواڑ محلہ مہاوتان مرسلہ قاضی تمیز الدین صاحب ۹ ربیع الاول شریف ۱۳۳۸ھ۔

میں نے ایک معلم صاحب کی زبانی سنا ہے کہ نماز میں تین آیت شریف سے کم مضمون پڑھا جاوے گا یعنی دو آیت شریف پڑھی جائے گی تو نماز نہیں ہو گی اگر غلطی سے پڑھی گئی تو نماز کو دہرانا چاہیے۔ ایک امام نے پہلی رکعت میں ایک رکوع پڑھا دوسری رکعت میں وَاِنْ یَّکَادُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَیُزْلِقُوْنَکَ بِاَبْصَارِهِمْ لَمَّا سَمِعُوا الذِّکْرَ وَیَقُوْلُوْنَ اِنَّهٗ لَمَجْنُوْنٌ ۝ وَمَا هُوَ اِلَّا ذِکْرٌ لِّلْعٰلَمِیْنَ تو قبلہ وکعبہ یہ دوسری رکعت میں جو پڑھا گیا وہ میں نے لکھا ہے یہ صرف دو آیت شریف ہیں، آیا نماز صحیح ہو گئی یا نہیں یا دہرانا پڑے گی۔ بینوا توجروا۔

الجواب: نماز میں ایک آیت پڑھنا فرض ہے مثلاً الحمدللہ رب العالمین اس کے ترک سے نماز نہ ہو گی اور پوری سورۂ فاتحہ اور اس کے بعد متصلاً تین آیتیں چھوٹی چھوٹی یا ایک آیت کہ تین چھوٹی آیت کے برابر ہو پڑھنا واجب ہے اور اگر اس میں کمی کرے گا نماز ہو تو جائے گی یعنی فرض ادا ہو جائے گا مکروہ تحریمی ہو گی بھول کر ہے تو سجدۂ سہو واجب ہو گا اور قصداً ہے تو نماز پھیرنی واجب ہو گی اور بلا عذر ہے تو گنہگار بھی ہو گا مثلاً تین آیتیں یہ ہیں: ثم نظر ثم عبس وبسر ثم ادبر واستکبر یا یہ الرحمن ۝ علم القرآن ۝ خلق الانسان ۝ تو ظاہر ہے کہ وہ دو آیتیں وان یکاد الذین کفروا بلکہ اس میں کی پہلی ہی آیت ان تین چھوٹی آیتوں سے بڑی ہے تو نماز واجب ادا ہو گئی دہرانے کی حاجت نہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم

(ہ) علامہ محمد امجد علی اعظمی متوفی ۱۳۶۷ھ اپنی تصنیف "بہار شریعت" مطبوعہ شیخ غلام علی اینڈ سنز کراچی کی جلد سوم صفحہ نمبر ۶۱ پر واجبات نماز کے ذیل میں لکھتے ہیں:

سورۃ ملانا یعنی ایک چھوٹی سورت انا اعطینک الکوثر یا تین چھوٹی آیتیں جیسے ثم نظر o ثم عبس وبسر o ثم ادبر واستکبر یا ایک یا دو آیتیں تین چھوٹی کے برابر پڑھنا۔

۸- یہاں تک تو وہ حوالہ جات درج کئے گئے ہیں جن میں فقہاء کرام نے "سورۃ المدثر" کی تین آیات قصیرہ کو (۲۱ تا ۲۳) اسقاطِ واجب کیلئے مدار و معیار قرار دیا ہے یعنی یہ یا ان کے مساوی ایک طویل آیت یا دو آیتیں۔

چنانچہ علامہ عبدالحی فرنگی محلی نے مذکورہ بالا پیراگراف نمبر ۷ (ب) میں حاشیہ ہدایہ پر ملا الہداد کے حوالے سے لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص نماز کی ایک رکعت میں سورۃ الفاتحہ کے ساتھ سورۃ المائدہ کی آیت نمبر ۶۴ پڑھ لے یا سورۃ النساء کی آیت نمبر ۱۱۰ پڑھ لے تو نماز ادا ہو جائے گی حالانکہ بظاہر یہ طویل آیات نہیں ہیں لیکن کم از کم مقدار واجب ان سے پورا ہو جاتا ہے، اسی طرح فاضل بریلوی علیہ الرحمہ نے بھی اپنے فتویٰ میں لکھا ہے کہ سورۃ القلم کی آیت ۵۱ یا سورۃ الرحمٰن کی ابتدائی تین مختصر ترین آیات بھی ادائے واجب کیلئے کافی ہیں۔

۹- بعض فقہاء کرام (مثلاً علامہ زین الدین ابن نجیم متوفی ۹۷۰ ھ) کی عبارات میں ہے کہ "ثلاث آیات قصار کالکوثر" اس عبارت میں "سورۃ الکوثر" کی آیات پر "قصیرہ" کا اطلاق لغوی اور عرفی اعتبار سے ہے، اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ جو تین چھوٹی آیات "ضم سورۃ" کے وجوب کیلئے معیار ہیں وہ سورہ کوثر کی تین آیات ہیں، کیونکہ اس سے پہلے ہم باحوالہ بیان کر چکے ہیں کہ وہ تین آیات قصار جو "ضم سورۃ" کے وجوب کو ساقط کرتی ہیں، وہ "ثم نظر o ثم عبس وبسر o ثم ادبر واستکبر o" ہیں یا ایسی ایک یا دو آیات جو مقدار میں ان کے مساوی ہوں۔

۱۰- اب تک فقہاء کرام کی وہ آراء و عبارات تھیں جن میں تین آیات قصیرہ کو معیار بنایا گیا ہے، لیکن علامہ محمد امین ابن عابدین شامی نے ان تین آیاتِ قصار کی تعدادِ حروف کو بھی معیار بنایا ہے جو مجموعی طور پر تیس حروف ہیں۔ لہٰذا تیس حروف پر مشتمل ایک یا دو آیات قرآنی پڑھنے سے بھی واجب ساقط ہو جاتا ہے۔ علامہ شامی رحمہ اللہ تعالیٰ نے ردالمحتار مطبوعہ استنبول ۱۳۲۷ جلد اول کے صفحات ۴۲۷ اور ۵۰۲ پر اپنے اس موقف کو بیان فرمایا ہے، دونوں حوالہ جات بالترتیب درج ذیل ہیں:

(أ) (قوله تعدلَ ثلاثا قصارا) اى مثل ثُمَّ نَظَرَ الخ. وهى ثلاثون حرفا فلو قرأ آية طويلة قدر ثلاثين حرفا يكون قدأتى بقدر ثلاث آيات لكن سيأتى فى فصل جهر الامام ان فرض القرأة آية وان الآية عرفا طائفة من القرآن مترجمة اقلها ستة احرف ولوتقديراً "كَلَمْ يَلِدْ" الااذا كانت كلمة فالا صح عدم الصحة اه ومقتضاه انه لو قرأ آية طويلة قدر ثمانية عشر حرفا يكون قدأتى بقدر ثلاث آيات وقد يقال ان المشروع ثلاث آيات متوالية على النظم القرآنى مثل ثم نظر الخ. ولا يوجد ثلاث متوالية اقصر منها فالو اجب اما هى اوما يعدلها من غيرها لا مايعدل ثلاثة امثال اقصر آية وجدت فى القرآن ولذا قال تعدل ثلاثا قصارا ولم يقل تعدل ثلاثة امثال اقصر آية على ان فى بعض العبارات تعدل اقصر سورة فتامّل وسنذكر فى فصل الجهر زيادة فى هذالبحث.

(ب) (تنبيه) لم ارمن قدر ادنى مايكفى بحد مقدر من الآية الطويلة وظاهر كلام البحر كغيره انه موكول الى العرف لا الى عدد حروف اقصر آية وعلى هذا لواراد قرأة قدر ثلاث آيات التى هى واجبة عندالامام لابد ان يقرأ من الآية الطويلة مقدار ثلاثة امثال مما يسمى بقراءته قارئا عرفا ولذا فرضوا المسئلة بآية الكرسى وآية المداينة وفى التتار خانية والمعراج وغيرهما لو قرأ آية طويلة كآية الكرسى او المداينة البعض فى ركعة والبعض فى ركعة اختلفوا فيه على قول ابى حنيفة قيل لايجوز لانه ماقرأ آية تامة فى كل ركعة وعامتهم على انه يجوز لان بعض هذه الآيات يزيد على ثلاث قصار اويعدلها فلاتكون قراءته اقل من ثلاث آيات اه لكن التعليل الاخير ربما يفيد اعتبار العدد فى الكلمات او الحروف ويفيده قولهم لوقرأ آية تعدل اقصر سورة جاز وفى بعض العبارات تعدل ثلاثا قصارا اى كقوله تعالىٰ "ثُمَّ نَظَرَ ثُمَّ عَبَسَ وَبَسَرَ ثُمَّ اَدْبَرَ وَاسْتَكْبَرَ" وقدرها من حيث الكلمات عشر ومن حيث الحروف ثلاثون فلو قرأ "اَللّٰهُ لاَ

اِلٰهَ اِلاَّ هُوَالْحَیُّ الْقَیُّوْمُ لاَتَأْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلاَ نَوْمٌ "یبلغ مقدار هذه الآیات الثلاث فعلی ماقلناه لواقتصر علی هذالمقدار فی کل رکعة کفی عن الواجب ولم ارمن تعرض لشئی من ذلک فلیتأمل۔

پیراگراف نمبر ۴ کی بحث میں تحریر کیا جاچکا ہے کہ قرآن مجید کی چھوٹی سے چھوٹی آیت چھ حروف پر مشتمل ہے، اس پیراگراف کے جزء (ا) میں علامہ شامی فرماتے ہیں کہ اس کا مقتضاء یہ ہے کہ اٹھارہ حروف پر مشتمل ایک طویل آیت سے بھی واجب ساقط ہو جانا چاہئے، لیکن اس پر یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ تین آیات قصار متواتر ہونی چاہئیں، جیسے ثم نظر الخ۔ اور ان تین سے کم تر مسلسل آیات قرآن میں موجود نہیں ہیں پس اقل مقدار معیار واجب یا تو یہی ہیں اور یا جو ان کے مساوی ہوں، یہی وجہ ہے "ثلاثة امثال اقصر اية" کے برابر کو معیار نہیں بنایا گیا، یعنی اگر سب سے چھوٹی (یعنی چھ حرفی) آیت کی تین مثل کو معیار قرار دیا جاتا تو اٹھارہ حرف والی آیت سے بھی واجب ساقط ہو جاتا۔ لہذا بات سب سے چھوٹی آیت کی تین مثلوں کی نہیں بلکہ سب سے چھوٹی تین آیتوں کی ہے یا ان کے مساوی ایک یا دو آیتیں۔ اس عبارت کے شروع میں علامہ شامی نے کہا ہے کہ "ثم نظر" الخ میں تیس حروف ہیں۔

علامہ شامی نے نمبر ۱۰ جزء (ب) کی عبارت میں بعض علماء کا اختلاف ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جمہور فقہاء اس امر کو جائز قرار دیتے ہیں کہ اگر ایک طویل آیت پوری نہ بھی پڑھی بلکہ تین آیات متوالیہ قصیرہ کے برابر (یعنی دس کلمات یا تیس حروف کے برابر) آیت طویل کا حصہ پڑھ لیا تو بھی واجب ادا ہو جائے گا۔ مثلاً اگر آیت الکرسی اللّٰہ لا الہ...... لاتاخذہ سنة ولا نوم تک بھی پڑھ لی تو دس کلمات یا تیس حروف پورے ہو جاتے ہیں، لہذا نماز ادا ہو جائے گی۔

تین آیات قصار (یعنی ثم نظر الخ) کی تعداد کلمات و حروف کو نماز کے اندر واجب قرأت کے اداء اور اسقاط واجب کیلئے معیار قرار دینے کی بات سب سے پہلے علامہ شامی ہی نے کی ہے، اسی لئے انہوں نے اظہار تفاخر اور تحدیث نعمت کے طور پر فرمایا ہے کہ "ولم ارمن تعرض لشئ من ذالک فلیتامل"۔

(ج) علامہ شامی کی اتباع میں تین آیات قصار (یعنی ثم نظر الخ) کی تعداد حروف کو اداء واجب کیلئے معیار قرار دینے کی بات ہمارے فقہاء متاخرین بلکہ معاصرین نے بھی

کی ہے۔ چنانچہ فتاویٰ دارالعلوم دیوبند مطبوعہ دارالاشاعت کراچی ۱۹۸۶ء جلد دوم صفحہ ۲۲۶ پر سوال نمبر ۴۰۷ مع جواب درج ذیل ہے :

سوال: (۴۰۷) جو آیت سورہ کوثر کے برابر ہو بڑی آیت شمار ہوگی۔ کسی کتاب فقہ کی عبارت تحریر فرمادیجئے کہ کم سے کم بڑی آیت کی مقدار کیا ہے۔

الجواب: در مختار میں ہے وضم اقصر سورة کالکوثر اوما قام مقامها وهو ثلث ایات قصار نحو ثُمَّ نَظَرَ ثُمَّ عَبَسَ وَبَسَرَ ثُمَّ اَدْبَرَ وَاسْتَكْبَرَ۔ وفی الشامی قوله تعدل ثلاثا قصاراً ای مثل ثم نظر الخ وهی ثلثون حرفاً فلو قرء ایةً طویلةً قدر ثلثین حرفاً یکون قداتی بقدر ثلث ایات الخ۔ فقط

(د) اسی طرح بعینہ اسی استفتاء کے جواب میں دارالعلوم کراچی کا فتویٰ ملاحظہ ہو جسے مفتی محمد طلحہ صاحب نے لکھا اور نائب مفتی دارالافتاء مفتی محمد عبدالمنان صاحب نے اس کی تائید و تصویب کی۔

الجواب

فقہاء کرام نے سورۂ فاتحہ کے ساتھ تین چھوٹی یا ایک بڑی آیت کو ملانا واجب قرار دیا ہے جس کی مقدار احتیاطاً تیس حروف بیان کی گئی ہے اور مذکورہ صورت میں سورۃ الکوثر کی دو آیات کے حروف کی مقدار تیس تک پہنچ جاتی ہے لہذا یہ نماز درست ہو گئی ہے، نہ سجدہ سہو کی ضرورت تھی اور نہ نماز کا اعادہ واجب ہے۔

فی الدرالمختار:- (ضم) اقصر (سورة) کالکوثر او ماقام مقامها، وهو ثلاث آیات قصار، نحو۔ "ثُمَّ نَظَرَ۔ ثُمَّ عَبَسَ وَبَسَرَ۔ ثُمَّ اَدْبَرَ وَاسْتَكْبَرَ" وكذا لوكانت الآية او الایتان تعدل ثلاثاً قصاراً۔

وفی الشامیة :- ای مثل۔ ثم نظر۔ الخ ، وهی ثلاثون حرفاً، فلو قرأ آیة طویلة قدر ثلاثین حرفاً، یکون قدأتی بقدر ثلاث آیات......

(ج اص ۴۵۸) واللہ اعلم۔

محمد طلحہ عفی عنہ

دارالافتاء دارالعلوم کراچی نمبر ۱۴

الجواب صحیح محمد عبدالمنان

۱۱- اس مسئلے میں حرف آخر یہ ہے کہ علامہ الشاہ احمد رضا خاں قادری بریلوی علیہ الرحمۃ متوفی ۱۳۴۰ھ نے اپنی تصنیف جد الممتار علی رد المحتار جلد اول مطبوعہ ادارہ تحقیقات امام احمد رضا کراچی ۱۹۸۵ھ میں علامہ شامی کی عبارت "ولا یوجد ثلاث متوالیۃ اقصر منھا" پر اپنے حاشیے میں صفحہ ۲۳۹ پر رقم طراز ہیں:

(قولہ) ولا یوجد ثلاث متوالیۃ، (اقول) بلی فقولہ تعالی "قُمْ فَاَنْذِرْo وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ o وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ o ثمانیۃ وعشرون حرفا، مقروءا وخمسۃ وعشرون مکتوبا، وقولہ تعالی: وَالْفَجْرِo وَلَيَالٍ عَشْرٍo وَّالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ o خمسۃ وعشرون حرفا والمکتوب ستۃ وعشرون، فاذن ینبغی ادارۃ الحکم علی خمسۃ وعشر بن حرفا سواء اریدت المقروءات کما ھو الالیق، او المکتوبات، ۱۲۔

یعنی علامہ شامی کا یہ کہنا کہ "ثم نظر الخ" سے مختصر تر مسلسل تین آیات قرآن مجید میں اور کہیں نہیں۔ کیوں نہیں؟ ارشاد باری تعالیٰ: "قُمْ فَاَنْذِرْo وَرَبَّكَ فَكَبِّرْo وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْo" یہ تین مسلسل آیات ہیں اور ان کے حروف کی مجموعی تعداد اگر پڑھے جانے والوں (مقروءہ) کا اعتبار کریں تو اٹھائیس بنتی ہے اور لکھے جانے والوں (یعنی مکتوبہ) کا اعتبار کریں تو پچیس بنتی ہے اور اللہ تعالیٰ کا قول: "وَالْفَجْرِ o وَلَيَالٍ عَشْرٍ o وَّالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ o" تین مسلسل آیات ہیں اور ان کے حروف کی مجموعی تعداد پچیس بنتی ہے اور مکتوبہ کی چھبیس بنتی ہے، تو زیادہ مناسب بات یہ ہے کہ اداءِ واجب قرأت یا اسقاط واجب کا معیار و مقدار پچیس حروف پر ہونا چاہئے (نہ کہ تیس پر) خواہ پڑھے جانے والے حروف (مقروءات) کا اعتبار کیا جائے یا حیطہءِ کتابت (مکتوبات) میں آنے والے حروف کا۔

اس تشریح کی روشنی میں تو سورۂ کوثر کی ابتدائی دو آیات پڑھنے سے بہ طریق اولیٰ مقدار قرأت واجبہ ادا ہو جاتی ہے۔ الحمد للہ یہ اس مسئلے پر کافی ووافی تحریر ہے۔ تقبل اللہ ذالك، فقط ھذا ماعندی واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

مفتی منیب الرحمٰن
مہتمم دار العلوم نعیمیہ

قرآن مجید کی سورتوں کو ترتیب سے پڑھنا

سوال: کیا نماز میں سورتوں کو ترتیب سے پڑھنا واجب ہے؟ اور آیا نماز میں قرآن مجید کی سورتیں خلافِ ترتیب پڑھنے سے کوئی خرابی لازم آئے گی یا سجدۂ سہو کرنا پڑے گا؟ (محمد حنیف طیب، جامع مسجد رحمانیہ، گوہر آباد۔ کراچی)

جواب: تلاوت کرنے والے کیلئے قرآن مجید ترتیبِ مصحف کے مطابق پڑھنا واجب ہے اور نماز میں بھی قرآن کی سورتوں کو ترتیب کے مطابق پڑھنا چاہئے لیکن یہ مسئلہ واجباتِ تلاوت سے ہے، واجباتِ نماز سے نہیں ہے لہذا اگر کسی نے بھول کر نماز کی رکعات میں سورتیں خلافِ ترتیب پڑھ لیں تو بھی نماز صحیح ادا ہو جائے گی۔ سجدۂ سہو لازم نہیں آئے گا۔ تاہم جان بوجھ کر خلافِ ترتیب پڑھنے سے گریز کرنا چاہئے۔

نماز میں قرأت کا مسئلہ

سوال: اگر کوئی شخص نماز کی پہلی رکعت میں سورۂ "الناس" پڑھ لیتا ہے تو اب دوسری رکعت میں کیا پڑھے؟ (منور احمد، ملیر۔ کراچی)

جواب: دوسری رکعت میں بھی سورۂ الناس ہی پڑھ لے۔

سوال: گاؤں میں اکثر مولوی صاحبان چھوٹی چھوٹی مساجد کے امام ہیں ان کے تلفظ اتنے کمزور ہیں کہ جب وہ پڑھتے ہیں تو سمجھ میں کچھ نہیں آتا اور ان کے مخارج بھی صحیح نہیں ہیں کیا ان کے پیچھے نماز ہو جائے گی؟ (غلام نبی جسکانی۔ کراچی)

جواب: مساجد کے متولیان اور منتظمین کی ذمہ داری ہے کہ وہ باقاعدہ امام کا تقرر کرتے وقت اس امر کا خیال کریں کہ وہ صحیح العقیدہ ہو، ضروریاتِ دین کا علم رکھتا ہو، نماز کے تمام مسائل، ضروری جزئیات و تفصیلات کے ساتھ جانتا ہو اور کم از کم بقدرِ جوازِ نماز قرأت صحیح کرتا ہو۔ افضلیت کے معیار کتب فقہ میں مذکور ہیں۔ اگر امام کی قرأت میں ایسی خرابی ہے جو جواز صلوٰۃ سے مانع ہے تو ایسے امام کی اقتداء میں نماز نہ پڑھیں، پڑھ لی ہو تو اعادہ کرلیں۔ باقی شخصی پسند و ناپسند کا شرعی مسئلے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

التحیات نماز میں ہے، قرآن میں نہیں

سوال: التحیات قرآن پاک میں ہے یا نہیں؟ (رشید احمد قریشی۔ کراچی)

جواب: نماز میں ہر دو رکعت کے بعد اور آخر میں ایک خاص ہیئت میں بیٹھنے کو "قعدہ" کہتے ہیں۔ فرض، واجب اور سنت موٴکدہ نماز میں درمیان کا "قعدہ" واجب اور آخری "قعدے" پر بیٹھنا فرض ہے، نفل نماز کا ہر "قعدہ" فرض ہوتا ہے۔ "قعدے" میں "التحیات" کا مکمل پڑھنا واجب ہے، اس کے پہلے لفظ کی مناسبت سے اسے "التحیات" کہتے ہیں اور چونکہ اس کا آخری حصہ کلمہٴ شہادت پر مشتمل ہے، اس لئے اس کی مناسبت سے اسے "تشہد" (گواہی دینا) بھی کہتے ہیں۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے میرا ہاتھ اپنے دونوں مبارک ہاتھوں میں پکڑ کر اسی اہمیت کے ساتھ مجھے "تشہد" کی تعلیم فرمائی، جس طرح آپ ﷺ مجھے قرآن کی کسی سورت کی تعلیم ارشاد فرمایا کرتے تھے، پھر انہوں نے حضور ﷺ کی تعلیم کردہ پوری "التحیات" پڑھ کر سنائی۔ اس سے معلوم ہوا کہ "التحیات" کے کلمات اس ترتیب کے ساتھ اور اس کا صریح حکم تو قرآن میں نازل نہیں ہوا، لیکن "صاحبِ قرآن" حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے قرآن جیسی اہمیت کے ساتھ بہ نفسِ نفیس صحابہ کرام کو تعلیم فرمایا۔ نماز اور اس کا مکمل طریقِ ادا بہ کمال و تمام تواتر کے ساتھ رسول اللہ ﷺ سے منقول ہے اور آج تک امت کا اس پر تعامل ہے اور "التحیات" کے کلمات ترتیب و تفصیل کے ساتھ احادیثِ صحیحہ مشہورہ کے ذریعے حضور ﷺ سے ثابت ہیں۔

وتر میں دعائے قنوت کی جگہ "قل ھو اللہ" پڑھنا

سوال: اگر کسی کو دعائے قنوت یاد نہ ہو تو وتر کی تیسری رکعت میں دعائے قنوت کی جگہ "قل ھو اللہ" پڑھنے سے نماز ادا ہو جائے گی؟ (عبدالماجد، لسبیلہ۔ کراچی)

جواب: وتر کی تیسری رکعت میں مطلقاً دعاء پڑھنا واجب ہے اور بطور خاص "دعائے

قنوت" پڑھنا سنت ہے لہذا پہلی فرصت میں اسے یاد کریں تاکہ نماز وتر کے اجرِ کامل سے محروم نہ رہیں۔ جب تک "دعائے قنوت" مسنون یاد نہیں کرپاتے "رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّفِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ" تک پڑھ لیا کریں، یہ بھی یاد نہ ہو تو "اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ" تین بار پڑھ لیں اور اگر یہ بھی فوری طور پر یاد نہ ہو سکے تو "قل ھو اللہ" پڑھنے سے بھی واجب ادا ہو جائے گا۔

مسجد میں دوبارہ جماعت کرانا

سوال: مسجد میں دوبارہ جماعت کرانا جائز ہے؟ (محمد جیلانی۔ نارتھ کراچی)

جواب: کسی محلے کی مسجد میں، جب ایک بار اذان و اقامت کے ساتھ باقاعدہ جماعت ہو چکی ہو، تو دوبارہ اذان و اقامت کے ساتھ جماعت کرنا مکروہ ہے۔ اس سے مساجد فتنہ و افتراق کا مرکز بننے سے بھی محفوظ رہتی ہیں۔ ایسی مساجد، جو شارع عام پر واقع ہوں۔ ایئر پورٹ، بندرگاہ، ریلوے اسٹیشن، بس اڈے، مارکیٹ وغیرہ پر واقع ہوں، جہاں لوگوں کے قافلے اور گروپ آتے جاتے رہتے ہیں۔ وہاں الگ اذان و اقامت کے ساتھ ایک سے زیادہ جماعتیں کرانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ علامہ ابن عابدین شامی نے ردالمحتار میں حرمین طیبین میں بھی ایک سے زائد جماعتوں کو جائز قرار دیا ہے، کیونکہ حرمین طیبین میں بھی زائرین کے قافلے ہر وقت آتے رہتے ہیں، اسی طرح اگر محلے کی مسجد میں باہر کے لوگ آکر باجماعت نماز پڑھ کر چلے گئے ہوں تو اہل محلہ کیلئے اذان و اقامت کے ساتھ اپنی معمول کی جماعت بلاشبہ قائم کرنا جائز ہے، درمختار میں ہے کہ اگر کسی محلے کی مسجد میں باقاعدہ امام و موذن مقرر نہ ہوں تو وہاں تکرار جماعت میں کوئی حرج نہیں ہے، مسجد محلہ میں جماعتِ ثانیہ کی کراہت کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ لوگ غفلت اور کاہلی میں مبتلا ہو کر جماعتِ اولیٰ کی اہمیت کو نظر انداز کردیں گے اور ایسے لوگوں کیلئے جماعتِ ثانیہ بلاشبہ ناجائز ہے۔ البتہ علامہ شامی نے لکھا ہے کہ اگر اتفاقاً کچھ لوگ کسی عذر یا مانع کے سبب تاخیر سے آجائیں اور وہ پہلی جماعت کی جگہ سے

ہٹ کر جماعتِ ثانیہ کر لیں تو جائز ہے۔ ایسی صورت میں جماعتِ ثانیہ کیلئے اذان دینا تو جائز نہیں ہے البتہ اقامت میں کوئی حرج نہیں ہے۔

عورت اور مرد کی نماز

سوال: کیا میاں بیوی ایک ساتھ، ماں اپنے بیٹے کے ساتھ یا خالہ بھانجے کے ساتھ الگ جائے نماز پر نماز ادا کر سکتی ہیں؟

جواب: اگر مرد امام ہے اور عورت مقتدی اور امام نے عورتوں کی امامت کی نیت بھی کر رکھی ہے یا مرد اور عورت دونوں کسی ایک امام کی اقتداء میں نماز پڑھ رہے ہیں اور ان دونوں صورتوں میں عورت برابر میں کھڑی ہے تو مرد کی نماز فاسد ہو جائے گی بشرطیکہ عورت بالغہ یا قریب البلوغت ہو، خواہ وہ اس کی بیوی یا محرم ہی کیوں نہ ہو۔ البتہ اگر عورت بعد میں آکر کھڑی ہوئی اور امام یا مقتدی نے اسے پیچھے ہٹنے کا اشارہ کیا اور وہ نہ ہٹی تو اس عورت کی نماز فاسد ہو گی، لیکن اگر مرد اور عورت دو یا زائد کسی ایک کمرے میں اپنی اپنی نماز علیحدہ پڑھ رہے ہیں اور کسی پاک جگہ یا بڑی جائے نماز پر یا الگ الگ جائے نماز بچھا کر برابر یا آگے پیچھے کھڑے ہو کر پڑھ رہے ہیں تو دونوں یا سب کی نماز بلا کراہت ادا ہو جائے گی۔ ماں، بہن، خالہ، پھوپھی، بھتیجی، بھانجی اور بیوی وغیرہ تو محارم میں سے ہیں، کسی بھی عورت کے لئے غیر محرم مرد کے ساتھ نشست و برخاست شرعاً جائز نہیں ہے۔

سترہ کے مسئلے پر ایک علمی بحث

حضرت مفتی صاحب مدظلہ العالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

جناب مولانا صاحب بندہ کو ایک مسئلہ درپیش یہ ہے کہ عمدۃ الفقہ کتاب الصلوۃ میں حضرت مولانا سید زوار حسین نے یہ مسئلہ لکھا ہے:

"امام کا سترہ تمام مقتدیوں کیلئے کافی ہے پس جب امام کے آگے سترہ ہو تو اگر کوئی

مقتدیوں کی صف کے سامنے سے گزرے تو اس پر کچھ گناہ نہیں ہے اور یہی حکم مسبوق کیلئے بھی ہے کیونکہ اعتبار نماز شروع کرنے کے وقت کا ہے اور اس وقت امام کا سترہ اس کیلئے کافی تھا پس اب بھی وہی کافی رہے گا۔ (ص ۲۷۶)

یہ مسئلہ مولانا نے کس کتاب سے لیا ہے اور اس مسئلہ کی خوب وضاحت فرمائیے۔ امید ہے کہ بندہ کی صحیح رہنمائی فرمائیں گے۔

المستفتی

سید محمد فرحان حسین

الجواب باسم ملهم الصواب

سید صاحب مرحوم نے مندرجہ بالا مسئلہ فقہ حنفی کی معتبر و مستند کتاب "شامی" سے لیا ہے۔ اصل عبارت یہ ہے: وكفت سترة الامام للكل (قوله للكل) اى للمقتدين به كلهم وعليه فلو مر مار فى قبلة الصف فى المسجد الصغير له لم يكره اذا كان للامام سترة و ظاهر التعميم شمول المسبوق وبه صرح القهستانى وظاهره الاكتفاء بهاولوبعد فراغ امامه والا فما فائدته ؟(شامی ج ص ۶۳۸) واللہ سبحانہ اعلم۔

محمد نصر اللہ احمد پوری

دار الافتاء دار العلوم زکریا F-B ایریا۔ کراچی

نوٹ:- مندرجہ بالا فتویٰ ہمیں موصول ہوا اور اس کے نتیجے میں جو علمی و فقہی بحث ہوئی، وہ درج ذیل ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب هوالموفق للصواب

زیر بحث صورت مسئلہ یہ ہے کہ امام نماز سے فارغ ہو چکا، امام اور مدرک مقتدی منتشر ہو رہے ہیں، جبکہ مسبوق کھڑے ہو کر اپنی بقیہ نماز کی تکمیل کر رہا ہے، تو ایسی صورت میں کیا لوگ بلا تردد اس مسبوق مقتدی کے آگے سے گزر سکتے ہیں اور کیا وہ دانستہ ایسا کرنے سے

گنہگار نہیں ہوں گے ؟۔

مستفتی سید محمد فرحان حسین کے والد محترم سید ایوب حسین صاحب اس امر کے مدعی تھے کہ چونکہ امام کا سترہ مقتدی کیلئے بھی سترہ ہے اور یہ حکم مسبوق کو بھی شامل ہے جبکہ وہ فراغتِ امام کے بعد تنہا کھڑے ہو کر اپنی بقیہ نماز پڑھ رہا ہو، اور انہوں نے اپنے موقف کی تائید میں سید زوار حسین صاحب کی کتاب "عمدۃ الفقہ" کی محولہ بالا عبارت پیش کی، میں نے عرض کیا کہ اگر آپ کے نزدیک اس عبارت کا محمل یہ ہے تو یہ کتب فقہ و فتاویٰ سے مؤید نہیں ہے۔ اس پر انہوں نے اپنے موقف کی تائید میں دار العلوم زکریا کے مفتی محمد نصر اللہ احمد پوری کا فتویٰ حاصل کیا جو اس بحث کے شروع میں درج ہے۔

مفتی صاحب محترم نے اپنے فتویٰ کو فتاویٰ شامی کی عبارت سے مزین کیا ہے، لیکن قابلِ افسوس بات یہ ہے کہ انہوں نے علامہ شامی کی نا تمام عبارت پیش کی ہے اور اس کا تکملہ یعنی آخری حصہ نظر انداز کر دیا، ایسا اگر دانستہ کیا جائے تو علمی خیانت کے زمرے میں آتا ہے اور سہواً ایسا ہو جائے تو تسامح کہلاتا ہے، ہم حسنِ ظن سے کام لیتے ہوئے اسے تسامح پر محمول کرتے ہیں۔ مفتی صاحب موصوف نے فتاویٰ شامی کی جو عبارت چھوڑ دی ہے، وہ یہ ہے:

وقد يقال فائدته التنبيه على انه كالمدرك لايطلب منه نصب سترة قبل الدخول فى الصلوة وان كان يلزم ان يصير منفردا بلا سترة بعد سلام امامه لان العبرة لوقت الشروع وهو وقته كان مستترا بسترة امامه تامل، (رد المحتار علی الدر المختار، ج ا، ص ۴۲۹، دار احیاء التراث العربی)

اس عبارت کا مستفاد یہ ہے کہ "مسبوق مقتدی" صرف اس حد تک مدرک کی طرح ہے کہ جماعت میں شمولیت کے وقت وہ سترے کا اہتمام نہیں کرے گا، یعنی "دخول فی الصلوٰۃ" سے پہلے اس سے نصبِ سترہ کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا کیونکہ اعتبار (اہتمامِ سترہ کے مسئلہ میں) وقتِ شروع کا ہے اور اس وقت وہ اپنے امام کے سترہ کے ساتھ مستتر ہے۔ لیکن امام کے سلام پھیرنے کے بعد وہ اب منفرد ہے اور بلا سترہ ہے (لہٰذا اس کے آگے سے گزرنے والے کو محتاط رہنا ہوگا، احتراز کرنا ہوگا، کیونکہ یہ موجب گناہ ہے)۔

مسبوق کو حسب درجہ جماعت کا اجر تو ملے گا، انشاء اللہ العزیز، لیکن جب وہ اپنی بقیہ نماز کی تکمیل کرتا ہے تو اس پر منفرد کے احکام کا اطلاق ہوتا ہے، مثلاً:

(۱) اس سے دورانِ اقتداء کوئی ترکِ واجب ہوا تو اس پر سجدۂ سہو لازم نہیں ہے لیکن امام کے سلام پھیرنے کے بعد اس سے کوئی ترکِ واجب ہو جائے تو اس پر سجدۂ سہو لازم ہے ورنہ نماز واجب الاعادہ ہو گی۔

(۲) امام کی اقتداء میں دورانِ قرأتِ امام مقتدی پر سکوت واجب ہے لیکن جب فراغتِ امام کے بعد مقتدی اپنی بقیہ نماز کیلئے کھڑا ہو گا تو اس پر قرأت فرض ہے۔

(۳) امام کی اقتدا کے دوران جس رکعت میں شامل ہوا، وہی محسوب ہو گی، لیکن بعد میں جب اپنی بقیہ نماز کی تکمیل کیلئے کھڑا ہو گا تو اصل ترتیب کا لحاظ کرے گا، سورۃ والی رکعت یا رکعات پہلے پڑھے گا اور بغیر سورۃ والی بعد میں، اس کی جب اپنی دو رکعات مکمل ہوں گی تو قعدۂ اولیٰ بھی اس پر واجب ہو گا۔

(۴) امام بخاری اور دیگر محدثین نے جس حدیث سے یہ مسئلہ مستنبط کیا ہے اس باب کا عنوان یہ قائم کیا ہے "سُتْرَۃُ الْاِمَامِ سُتْرَۃٌ لِمَنْ خَلْفَہٗ" اور فقہی ضابطہ یہ ہے کہ جب حکم مشتق پر لگے تو اس حکم کی علت "ماخذ اشتقاق" ہوتا ہے، یعنی "امامت"، تو اس قاعدے کی رو سے امام کا سترہ مقتدی کیلئے اس وقت تک سترہ ہے جب تک وہ امامت میں ہے، جب امامت سے فارغ ہو گیا تو اب اس کا سترہ مقتدی کیلئے سترہ نہ رہا، چہ جائیکہ وہ فارغ ہو کر گھر چلا گیا ہو۔ علی ھذا القیاس۔

امید ہے کہ مفتی محمد نصر اللہ احمد پوری صاحب علامہ شامی رحمہ اللہ تعالیٰ کی محولہ بالا جامع گفتگو کی روشنی میں اپنے فتویٰ پر نظر ثانی فرمائیں گے۔

فقط ھذا ماعندی، واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

مفتی منیب الرحمٰن

مہتمم دارالعلوم نعیمیہ

بلاک ۱۵، فیڈرل بی ایریا۔ کراچی

الجواب باسم ملهم الصدق والصواب

تعلیمی سال کے اوائلی ایام کی طویل ترین مصروفیت و مشغولیت کے بعد استفتاء دیکھنا شروع کئے، اولاً سریع الطلب سوالات کے جوابات قلمبند کئے گئے، دوران تسلسل چند ایام قبل اپنے ہی تحریر کئے گئے ایک فتوے پر نظر پڑی، جس کے ساتھ محترم مفتی منیب الرحمن صاحب کے قلم سے تحریر شدہ "اصلاح الجواب" بھی منسلک تھا۔

جس میں بندہ کے جواب پر چند غلط فہمیاں اور ان کی تفصیل درج تھی، چونکہ اس پر "اظہار مافی الضمیر" کیلئے قدرے وقت مطلوب تھا، اس لئے اس میں مزید تاخیر ہوتی چلی گئی، بفضلہ تعالیٰ ساعۃ حاضرہ میں کچھ رقم کرنے بیٹھا ہوں، اللہ عزوجل اس کو مکمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے (آمین یارب العالمین)

احقر اپنی اس مختصر تحریر کو دو حصوں پر تقسیم کرے گا:

(۱) اولاً مسئلہ مبحوثہ کی وضاحت اور تحقیق ہو گی۔ (۲) ثانیاً محترم مفتی صاحب کی جانب سے تحریر کئے گئے "جواب الجواب" پر نظر ثانی کی جسارت کی جائے گی۔

زیر بحث صورت مسئولہ وہی ہے جو موصوف مفتی صاحب نے تحریر فرمائی ہے:

صورتِ مسئولہ یہ ہے کہ امام نماز سے فارغ ہو چکا، امام اور مدرک مقتدی منتشر ہو رہے ہیں، جبکہ مسبوق کھڑے ہو کر اپنی بقیہ نماز کی تکمیل کر رہا ہے، تو ایسی صورت میں کیا لوگ بلاتردد اس مسبوق مقتدی کے آگے سے گزر سکتے ہیں اور کیا وہ دانستہ ایسا کرنے سے گنہگار نہیں ہوں گے؟

دراصل اتنی بات پر تو جملہ فقہاء کرام متفق ہیں کہ دورانِ جماعت امام کے سلام پھیرنے سے قبل تمام مقتدی سترہ کے ساتھ مستتر ہیں، اس اتفاقی مسئلہ کو بایں الفاظ بیان کیا گیا ہے:

علامہ وھبۃ الزحیلی رقم طراز ہیں:

وسترة الامام سترة لمن خلفه بالاتفاق (الفقہ الاسلامی وادلتہ ج ۲، ص ۹۴۱)

لیکن تحقیق طلب امر یہ ہے کہ:

آیا امام کا سترہ امام کیلئے اور مقتدیوں کے ہر فرد کیلئے (خواہ وہ مسبوق ہو یا مدرک اور لاحق) مستقلاً سترہ ہے۔

اس صورت میں امام اگر سلام پھیرنے کے بعد غائب بھی ہو جائے تب بھی مسبوق سترہ کے ساتھ مستتر رہے گا، جس طرح امام کی موجودگی میں لوگوں کا اس کے آگے گزرنا بلاشبہ صحیح تھا، اسی طرح امام کی غیوبت میں اس کے آگے گزرنا بلاشبہ صحیح ہوگا، کیونکہ امام اگرچہ معدوم ہے، لیکن اس کا وہ سترہ موجود ہے جو مسبوق کیلئے بھی مستقلاً سترہ ہے۔

یا یہ کہ امام کے سامنے موجود سترہ فقط امام کیلئے کفایت کرے گا، جبکہ مقتدیوں کیلئے امام بذاتِ خود سترہ ہے۔

اس صورت میں جب تک مسبوق خلف الامام ہے۔ اس وقت تک اس کے آگے گزرنا بلاشبہ صحیح اور درست ہوگا، لیکن جونہی امام اپنی نماز سے فارغ ہوگا، تو مسبوق بلا سترہ ہو جائے گا اور اس کے آگے گزرنا مکروہ اور باعث گناہ ہوگا۔

واضح رہے کہ اس مسئلہ میں فقہاء کرام کا اختلاف ہے، جمہور فقہاء کرام کا مسلک یہ ہے کہ امام کا سترہ امام کیلئے اور تمام مقتدیوں کیلئے مستقلاً سترہ ہے۔ جبکہ بعض فقہاء کرام فرماتے ہیں کہ امام کے سامنے موجود سترہ صرف امام کیلئے خاص ہے، باقی خلف الامام مقتدیوں کیلئے خود امام بذاتہ سترہ ہے۔

معروف فقیہہ علامہ ابن نجیم رحمہ اللہ (المتوفی ۹۷۰ھ) نے اس اختلاف کو بایں الفاظ نقل فرمایا ہے:

وقد اختلف العلماء فی ان سترة الامام هل هی بنفسها سترة للقوم وله اوهی سترة له خاصة وهو سترة لمن خلفه

(البحر الرائق ج ۲، ص ۱۸)

علامہ ظفر احمد عثمانی رحمہ اللہ نے اس اختلاف کی جانب یوں اشارہ فرمایا:

لکن اختلفوا هل سترتهم سترة الامام ام سترتهم الامام نفسه

(اعلاء السنن ج ۵، ص ۸۲)

ثمرہ اختلاف مسبوق کے حق میں ظاہر ہوتا ہے کہ امام کے سلام پھیرنے کے بعد جب وہ کھڑے ہو کر اپنی بقیہ نماز کی تکمیل کر رہا ہے تو کیا وہ اس وقت سترہ کے ساتھ مستتر ہے یا نہیں ؟

تو جمہور و فقہاء کا مسلک یہ ہے کہ یہ مسبوق سترہ کے ساتھ مستتر ہے۔ کیونکہ امام اگرچہ موجود نہیں، لیکن اس کا وہ سترہ موجود ہے جس کے ساتھ وہ اور اس کے تمام مقتدی بشمول مسبوق مستتر تھے، لہٰذا مسبوق جس سترہ کے ساتھ قبل از فراغِ امام مستتر تھا، اب بھی وہ اسی سترہ کے ساتھ مستتر ہے اور جمہور ہی کے مسلک کو کتب فقہ و فتاویٰ میں اختیار کیا گیا ہے۔ چنانچہ :-

(۱) شیخ الاسلام برہان الدین علی بن ابی بکر الفرغانی (المتوفی ۵۹۳ھ) فرماتے ہیں :

وسترة الامام سترة للقوم لانه عليه السلام صلى ببطحاء مكة الى عنزة ولم يكن للقوم سترة (ھدایہ ج۱، ص ۱۳۹)

(۲) علامہ ابن نجیم الحنفی (المتوفی ۹۷۰ھ) رقم طراز ہیں :

ان سترة الامام تجزئی عن اصحابه (البحر الرائق ج ۲، ص ۱۸)

(۳) علامہ عالم بن علاء الانصاری الاندریتی (المتوفی ۷۸۶ھ) فرماتے ہیں :

سترة الامام تجزئی اصحابه (الفتاوی التتارخانیہ ج ۱، ص ۶۳۰)

ظاہر ہے کہ مندرجہ بالا عبارات میں "قوم" اور "اصحاب" کے الفاظ مدرک، لاحق اور مسبوق تینوں قسم کے مقتدیوں کو شامل ہیں۔

(۴) صاحب ملتقی الابحر رقم طراز ہیں :

وسترة الامام مجزئة عن القوم (ملتقی الابحر مع المجمع ج ۱، ص ۱۲۲)

اس عبارت میں بھی "قوم" کی تعمیم شمولیت مسبوق کی جانب مشعر ہے، یعنی امام کا سترہ امام کے ساتھ تمام مقتدیوں کیلئے کافی ہوگا، خواہ وہ مسبوق ہو یا مدرک اور لاحق۔ چنانچہ اس عبارت کی توضیح میں "صاحب مجمع الانھر" شمولیت مسبوق کی تصریح فرماتے ہوئے لکھتے ہیں :

وسترة الامام مجزئة اى كافية (عن القوم) و ان كان مسبوقا

(مجمع الانھر فی شرح ملتقی الابحر ج ۱، ص ۱۲۲)

(۵) علامہ علاء الدین الحصکفی رحمہ اللہ (المتوفی ۱۰۸۸ھ) فرماتے ہیں:

(وکفت سترة الامام) للکل (شرح تنویر الابصار ج۱، ص ۶۳۸)

مذکورہ عبارت میں لفظ "کل" شمولیت مسبوق میں سابقہ عمومی الفاظ سے بھی زیادہ واضح ہے۔

گزشتہ جملہ عبارات میں اگرچہ تعمیم الفاظ تمام مقتدیوں کو محیط ہے، لیکن تمام مقتدیوں کی شمولیت کے صریح الفاظ نہیں ہیں۔ معروف فقیہہ علامہ ابن عابدین شامی (المتوفی ۱۲۵۲ھ) نے یہ کسر بھی پوری فرمادی اور انہوں نے مذکورہ عبارت کی تشریح میں تمام مقتدیوں کی شمولیت کی صراحت فرمادی، چنانچہ فرماتے ہیں:

(قوله للکل) ای للمقتدین به کلهم (ردالمحتار ج۱، ص ۶۳۸)

اگر مسبوق فقط سلام امام تک ہی مستتر رہتا، بعدہ غیر مستتر ہوجاتا تو اس مقصد کی تعبیر کیلئے "وکفت سترة الامام لمن خلفه" یا "للماموین" یا "للمقتدین" کے الفاظ کافی ہوتے، اس سے زائد تعمیمی الفاظ کی چنداں حاجت نہیں تھی۔ یقیناً "اصحاب، قوم" اور "کل" جیسے حد درجہ تعمیمی الفاظ اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ مسبوق حسب سابق اپنی نماز کے آخر تک مستتر رہے گا۔

باقی رہی مذکورہ عبارات میں وہ تاویل جو فاضل مفتی صاحب نے ایک عبارت کا مستفاد بتاتے ہوئے بیان فرمائی کہ:

"مسبوق مقتدی صرف اس حد تک مدرک کی طرح ہے کہ جماعت میں شمولیت کے وقت وہ سترہ کا اہتمام نہیں کرے گا، یعنی دخول فی الصلوۃ سے پہلے اس سے نصب سترہ کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا...... لیکن امام کے سلام پھیرنے یعنی امام کے نماز سے فراغت کے بعد وہ اب منفرد ہے اور بلا سترہ ہے (لہذا اس کے آگے گزرنے والے کو محتاط رہنا ہوگا، احتراز کرنا ہوگا، کیونکہ یہ موجب گناہ ہے)۔"

چونکہ یہ تاویل مذکورہ فقہاء کرام اور جمہور ائمہ احناف کی منشاء کے خلاف تھی (کیونکہ ان کے نزدیک مقتدیوں کا سترہ امام نہیں کہ اس کی غیر موجودگی میں مسبوق مقتدی

بلاسترہ ہو جائیں، بلکہ تمام مقتدیوں کا وہی سترہ ہے جو امام کا سترہ ہے امام اگرچہ موجود نہیں لیکن وہ سترہ تو موجود ہے جس کے ساتھ امام اور تمام مقتدی مستتر تھے۔ اس لئے ان کے نزدیک مسبوق فراغت امام کے بعد بھی مستتر ہے بلاسترہ نہیں)۔

اس لئے خاتمۃ المحققین علامہ ابن عابدین (المتوفی ۱۲۵۲ھ) نے انتہائی زوردار انداز سے مسلک جمہور کی توضیح وتائید فرماتے ہوئے مذکورہ تاویل کی تضعیف فرمائی ہے، چنانچہ فرماتے ہیں:

(۶) وکفت سترة الامام للكل (قوله للكل)...... وظاهره التعميم شمول المسبوق وبه صرح القهستانی وظاهره الاكتفاء بها ولو بعد فراغ امامه والا فما فائدته؟...... لان العبرة لوقت الشروع وهو وقته كان مستترا بسترة امامه تامل ۱۲ (ردالمحتار ج۱، ص ۶۳۸)

یعنی امام کا سترہ تمام مقتدیوں کیلئے کافی ہے اور (متن کے لفظ "کل" کے) عموم سے ظاہر ہے کہ مقتدیوں میں مسبوق مقتدی بھی شامل ہے، چنانچہ "قہستانی" میں اس (شمول مسبوق) کی صراحت ہے اور اس (شمول مسبوق) کے ظاہر کا تقاضا یہی ہے کہ امام کے فارغ ہونے کے بعد بھی یہی سترہ مسبوق کیلئے کافی ہو، ورنہ پھر اس شمول و عموم کا کیا فائدہ؟ کیونکہ اعتبار نماز شروع کرنے کے وقت کا ہے اور اس وقت امام کا سترہ اس (مسبوق) کیلئے کافی تھا پس اب بھی وہی سترہ اس کیلئے کافی رہے گا۔

علامہ ابن عابدین شامی (المتوفی ۱۲۵۲ھ) نے مذکورہ بحث فرماتے ہوئے درمیان میں بطور جملہ معترضہ اس تاویل کو بصیغہ مجہول ذکر فرمایا۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

وقد يقال فائدته التنبيه على انه كالمدرك لايطلب منه سترة قبل الدخول فی الصلوة وان كان يلزم ان يصير منفرداً بلا سترة بعد سلام امامه (حوالہ بالا)

یعنی اور کبھی کہا جاتا ہے کہ اس (لفظ "کل" کے عموم وشمول) کا فائدہ یہ ہے کہ (اس عموم وشمول سے) اس بات پر تنبیہ کرنا مقصود ہے کہ مسبوق مدرک کی طرح ہے بایں طور کہ نماز میں داخل ہونے سے قبل اس سے نصب سترہ کا مطالبہ نہیں کیا جائے

گا، اگرچہ امام کے سلام پھیرنے کے بعد یہ مسبوق منفرد بلا سترہ سمجھا جائے گا۔

دراصل متن کے عموم کی یہ تاویل ان بعض فقہاء کی جانب سے کی گئی ہے جو مقتدیوں کیلئے امام کو بذاتہ سترہ تسلیم کرتے ہیں، چنانچہ علامہ شامی نے اس تاویل کو بصیغہ مجہول ذکر کر کے اس کی تضعیف کرتے ہوئے مسلک جمہور کو بے غبار بنادیا۔

یا یہ کہ چونکہ متن کی عبارت سے انہیں بعض فقہاء کا مسلک بھی ایک گونہ مفہوم ہو سکتا تھا تو علامہ شامی نے وہ مفہوم بصیغۂ مجہول ذکر کر کے تضعیف کر دی، تاکہ مسلک جمہور کی صحت میں کوئی شبہ نہ رہے۔

یاد رہے کہ جو کلام بصیغۂ مجہول ذکر کیا جائے، ارباب فتاویٰ کے نزدیک اس سے اس کلام کی تضعیف مقصود ہوتی ہے (اور ایسے مجہول کلام پر عمل اور فتویٰ جائز نہیں ہوتا) اِلّا یہ کہ مصنف کتاب کی یہ جبلت خاصہ ہو کہ وہ صحیح اقوال بھی صیغِ مجہولہ سے بیان فرماتے ہوں یا یہ کہ سیاق وسباق سے اس کی تصحیح معلوم ہوتی ہو، 'قیل' اور 'یقال' سے ذکر کیئے گئے کلام کے ضعیف ہونے کی تو تصریح بھی موجود ہے۔

چنانچہ سید عمیم الاحسان مجددی "ادب المفتی" میں رقم طراز ہیں:

ولا یجزم بالضعیف بصیغة التمریض کقیل ویقال الا بقرینة السیاق او التزام قائله کمئولف الملتقی

(ادب المفتی مع المجموعة ص ۵۷۴)

جبکہ یہاں نہ تو علامہ شامی کی یہ عادت ہے کہ وہ صحیح اقوال کو بھی صیغ مجہولہ سے ذکر کرتے ہیں اور نہ ہی سیاق وسباق اس کلام مجہول کی تائید کرتا ہے، خصوصاً جبکہ یہ ضعف کی ادنیٰ سے ادنیٰ قسم ہے، جس میں قائلین کے اسماء گرامی بھی ضبط تحریر میں لانا مناسب نہیں سمجھے گئے۔

(۷) جمہور ائمہ احناف کا مسلک صحیحین کی درج ذیل احادیث سے ماخوذ ہے:

ا...... عن ابن عباس انه قال اقبلت راکباً علی حمار اتان یومئذ قد ناهزت الاحتلام ورسول الله صلی الله علیه وسلم یصلی بالناس

بمنى الى غير جدار فمررت بين يدى بعض الصف فنزلت وارسلت الاتان ترتع ودخلت فى الصف فلم ينكر علىٰ ذلك احد

(بخاری ج ا، ص ا ۷، مسلم ج ا، ص ۱۹۶)

۲...... عن ابى جحيفة ان اباه را'ى رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم فى قبة حمراء من ادم (الى ان قال) وخرج رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم فى حلة حمراء مشمرا فصلى الى العنزة بالناس ركعتين ورايت الناس والدواب يمرون بين يدى العنزة

(مسلم ج ا، ص ۱۹۶)

۳...... عن ابى جحيفة قال سمعت ابى يقول ان النبى صلى اللّٰه عليه وسلم صلى بہم بالبطحاء بين يديه عنزة الظهر ركعتين والعصر ركعتين تمربين يديه المرأة والحمار (بخاری ج ا، ص ا ۷، مسلم ج ا، ص ۱۹۶ وقال ابن همام متفق عليه فتح القدیر ج ا، ص ۳۵۵)

چنانچہ علامہ ابن نجیم الحنفی (المتوفی ۹۷۰ھ) نے جمہور کے مسلک کا مستدل بیان فرماتے ہوئے انہی احادیث کی جانب اشارہ فرمایا ہے۔ فرماتے ہیں:

ان سترة الامام تجزیٔ عن اصحابه كما هو ظاهر الاحاديث الثابتة فى الصحيحين (البحر الرائق ج ۲، ص ۱۸)

نیز شیخ الاسلام برہان الدین علی ابن ابی بکر المرغینانی (۵۹۳ھ) نے جمہور کے مسلک کا مستدل تیسری حدیث کو بتایا ہے (ھدایہ ج ا، ص ۱۳۹)

صاحب "مجمع الانھر" نے بھی جمہور کا مسلک ذکر کرنے کے بعد انہی احادیث کا حوالہ دیا ہے، چنانچہ جمہور کا مسلک بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

كما هو ظاهر الاحاديث الثابتة فى الصحيحين من الاقتصار على سترة عليه السلام وهو سترة للقوم

(مجمع الانھر شرح ملتقی الابحر ج ا، ص ۱۲۲)

الحاصل جمہور کا مسلک یہ ہے کہ امام کا سترہ امام کیلئے اور تمام مقتدیوں کیلئے کافی ہے، خواہ وہ مسبوق ہوں یا مدرک اور لاحق، اور فراغ امام کے بعد بھی مسبوق مستتر رہیں گے، کیونکہ امام اگرچہ موجود نہیں لیکن وہ سترہ موجود ہے جس کے ساتھ امام اور تمام مقتدی (بشمول مسبوق) مستتر تھے اور بوجہ استتار مسبوق کے آگے گزرنا صحیح ہوگا اور اسی کو ہی کتب فقہ و فتاویٰ میں اختیار کیا گیا ہے اور متاخرین اربابِ فتاویٰ نے بھی اسی کو ترجیح دی ہے۔ (کمامر)

جبکہ بعض فقہاء کرام کا مسلک یہ ہے کہ امام کا سترہ فقط امام کیلئے کفایت کرے گا اور باقی مقتدیوں کیلئے امام بذاتہ سترہ ہوگا، یہ مسلک چونکہ بلا دلیل تھا اس لئے اس کو متون میں تو بالکل نظر انداز کر دیا تاہم کتب فتاویٰ میں اس کا قدرے تذکرہ ملتا ہے لیکن وہاں بھی اس کو صیغ مجہولہ سے ذکر کر کے اس کی تضعیف کر دی گئی ہے۔

(۱) چنانچہ علامہ سید احمد طحطاوی نے اس کو بایں الفاظ ذکر فرمایا ہے:

وقيل السترة له وهو بنفسه سترة لمن خلفه

(حاشیۃ الطحطاوی علی الدرج ۱، ص ۲۶۷)

(۲) علامہ ابن عابدین شامی (المتوفی ۱۲۵۲ھ) نے تنویر الابصار اور درمختار کی عبارت ”(وكفت سترة الامام) للكل“ کے تحت ان بعض فقہاء کے مسلک کی جانب یوں اشارہ فرمایا:

وقد يقال فائدته التنبيه على انه كالمدرك لايطلب منه سترة قبل الدخول فى الصلوة وان كان يلزم ان يصير منفرداً بلا سترة بعد سلام امامه (ردالمحتار ج ۱، ص ۴۳۸)

الحاصل بعض فقہاء کے نزدیک امام بذاتہ تمام مقتدیوں کیلئے سترہ ہے تو فراغ امام کے بعد مسبوق بلا سترہ ہوگا اور اس کے آگے سے گزرنا ناجائز ہوگا۔

ان بعض فقہاء کا مسلک درج ذیل وجوہ کی بنا پر غیر مفتیٰ بہ ضعیف اور مرجوح ہے:

(۱) کتب فقہ و فتاویٰ میں ان کے مسلک کو صیغ مجہولہ سے ذکر کیا گیا جبکہ اصول افتاء کے

مطابق صیغہ مجہول ضعف عبارت کی نشاندہی کرتا ہے خصوصاً قیل اور یقال سے ذکر کئے گئے کلام کے ضعیف ہونے کی تو تصریح بھی موجود ہے۔ (کمامر تفصیله من ادب المفتی)

(۲) یہ مسلک جمہور کے مسلک کے خلاف ہے۔ (کما یفہم من کتب الفقه)

(۳) کسی بھی معتبر و مستند فقیہہ سے اس کی تصحیح یا تائید ثابت نہیں۔

(۴) یہ دعویٰ بلا دلیل ہے۔

(۵) متون میں اس کو نظر انداز کر دیا گیا۔

(۶) فقہاء احناف نے اسکو مرجوح قرار دیا (کما هو الظاهر من العبارات الماضیه)

(۷) علامہ ابن عابدین شامی (المتوفی ۱۲۵۲ھ) نے اس کو حاشیہ در میں ضعیف قرار دیا جبکہ حاشیہ علامہ شامی کو "خاتمة التحقیقات والترجیحات فی المذهب الحنفی" تسلیم کیا گیا ہے (کماسیاتی من الفقه الاسلامیة وادلته)

جمہور کا مسلک درج ذیل وجوہ کی بناء پر راجح اور مفتیٰ بہ ہے۔

(۱) فقہاء احناف نے اسی کو راجح قرار دیا ہے، چنانچہ علامہ ابن نجیم (۹۷۰ھ) نے اولاً جمہور کا مسلک اور ثانیاً بعض فقہاء کا مسلک ذکر فرمایا (مر عبارته فی الصفحات الماضیة) بعدہ ان الفاظ میں فیصلہ فرمایا:

فظاهر کلام ائمتنا الاول ولهذا قال فی الهدایة وسترة الامام سترة للقوم (البحر الرائق ج۱، ص ۱۸)

ہمارے ائمہ احناف کے کلام سے پہلا ہی مسلک ظاہر ہوتا ہے (یعنی وہ اول مسلک رکھتے ہیں) یہی وجہ ہے کہ (متن حنفیہ) ہدایہ میں (اسی مسلک کو اختیار کرتے ہوئے) صاحب ہدایہ نے اس مسئلہ کو یوں تعبیر کیا ہے:

"امام کا سترہ پوری قوم (تمام مقتدی بشمول مسبوق) کیلئے کافی ہے۔"

علامہ ابن نجیم رحمہ اللہ نے جہاں "فظاهر کلام ائمتنا الاول" کہہ کر مسلک جمہور کو ترجیح دی ہے، وہاں موصوف کا جملہ "کلام ائمتنا" بھی غور طلب ہے جس میں

انہوں نے ایک لطیف انداز میں بعض فقہاء کے مسلک کی تضعیف فرمائی ہے۔

صاف ظاہر ہے کہ "کلام ائمتنا" کی بجائے "کلام بعض ائمتنا" تو اس لئے نہیں فرمایا کہ یہ جملہ اس مسلک کے حاملین کی قلت کی جانب مشعر تھا، حالانکہ یہ جمہور ائمہ فقہاء کرام کا مسلک ہے۔

تاہم اس میں ایک لطیف نکتہ یہ بھی ہے کہ اگر "کلام بعض ائمتنا" کہا جاتا تو اس کا یہ مطلب نکالا جاسکتا تھا کہ وہ فقہاء کرام جو اس کا برعکس مسلک رکھتے ہیں وہ بھی شاید ائمہ احناف ہیں، تو موصوف نے "کلام ائمتنا" کہہ کر اس جانب اشارہ فرمایا کہ جو فقہاء مذہب حنفیہ میں امامت کا درجہ رکھتے ہیں وہ تمام کے تمام اول مذہب رکھتے ہیں، جبکہ بعض فقہاء جو دوسرا مسلک رکھتے ہیں، انہیں ائمہ احناف نہیں کہا جاسکتا بلکہ وہ کم درجہ کے فقیہہ ہیں۔

نیز اگر "کلام بعض ائمتنا" کہا جاتا تو اس میں یہ احتمال ہوتا کہ شاید اس کے برخلاف مسلک کے حاملین فقہاء کرام بھی اتنی ہی تعداد میں ہوں گے، حالانکہ حقیقت ایسے نہیں تھی تو علامہ ابن نجیم رحمہ اللہ نے "وظاھر کلام ائمتنا" کہہ کر اس جانب اشارہ فرمایا کہ دوسرا مسلک رکھنے والے اتنا قلیل ہیں کہ ان کا ذکر و عدم ذکر مساوی ہے، "القلیل کالمعدوم" کے تحت انہوں نے تمام ائمہ احناف کا مسلک اول قرار دے دیا اور یہی دو نکتے "ظاھر کلام اکثر ائمتنا" نہ کہنے میں ہیں۔

اور اگر ائمہ سے مراد ائمہ مجتہدین ہوں اور اس کو ائمہ ثلاثہ کے مقابلہ میں لایا گیا ہو تو پھر تو بات ہی ختم ہے کہ ہمارے تمام ائمہ احناف کا یہی مسلک ہے جبکہ ائمہ ثلاثہ امام شافعی، امام مالک اور امام احمد بن حنبل اس کے برخلاف دوسرا مسلک رکھتے ہیں، اور پھر موصوف نے مسلک احناف کو صحیحین کی احادیث سے مدلل کہہ کر ترجیح دی۔

(۲) جمہور فقہاء کرام نے اسی کو ترجیح دی ہے۔

(۳) علامہ ابن عابدین شامی (المتوفی ۱۲۵۲ھ) نے اسی کو ترجیح دی ہے اور حاشیہ علی الدر میں اس کو خوب وضاحت سے بیان کیا، جبکہ حاشیہ ابن عابدین علی الدر کو "خاتمة التحقیقات والترجیحات" تسلیم کیا گیا ہے۔

چنانچہ علامہ وھبۃ الزحیلی فرماتے ہیں :

تعتبر حاشیة ابن عابدین (۱۲۵۲ھ) علامة الشام وهی (ردالمحتار علی الدرالمختار) خاتمة التحقیقات والترجیحات فی المذهب الحنفی ۱۲ (الفقہ الاسلامی وادلتہ ج ۱، ص ۷۵)

نیز سید عمیم الاحسان مجددی صاحب 'ادب المفتی'' نے ردالمحتار کو معتبر فتاوی میں شمار کیا ہے (ادب المفتی مع المجموعہ ص ۵۷۳)

(۴) اس مسلک کو فقہاء نے ''وظاھر ''یا اس کے ہم معنی الفاظ سے ذکر کیا ہے :

(راجع الی البحرالرائق ج ۲، ص ۱۸ ومجمع الانهر ج ۱، ص ۱۲۲ وردالمحتار ج ۱، ص ۶۳۸) جبکہ اس قسم کے الفاظ ترجیح کی علامت ہوا کرتے ہیں۔

چنانچہ علامہ عبدالحئی لکھنوی رحمہ اللہ رقم طراز ہیں :

فی خزانة الروایات نقلاً عن جامع المضمرات شرح مختصرالقدوری اما العلامات المعلمة علی الافتاء فقوله وعلیه الفتویٰ وبه یفتی (الی ان قال) هوالظاهر وهوالاظهر

(عمدۃ الرعایۃ ص ۱۶)

خصوصاً اختلاف کی صورت میں ظاہر پر ہی بناء کی جاتی ہے تاوقتیکہ اس کا خلاف واضح نہ ہو جائے۔

چنانچہ قاعدہ فقہیہ ہے :-

لبناء علی الظاهر واجب مالم یتبین خلافه

(اصول المسائل الاخلافیہ ص ۶۵ مع المجموعۃ)

(۵) متن حنفیہ میں اسی کو اختیار کیا گیا ہے۔ (کذا قال ابن نجیم فی البحر کمامر)

(۶) یہ مسلک لوگوں کیلئے اوسع اور ایسر ہے اور اسکی ترجیح قاعدہ فقہیہ کے عین مطابق ہے۔

المشقة تجلب التیسیر (اصول المسائل الخلافیہ ص ۱۲۲)

یاد رہے کہ اس مسلک جمہور کو اختیار کرنے والوں میں شیخ الاسلام برھان الدین علی بن

ابی بکر الفرغانی (المتوفی ۵۹۳ھ) اصحاب الترجیح اور علامہ ابن نجیم الحنفی (المتوفی ۹۷۰ھ) اصحاب التمیز میں سے ہیں' جبکہ علامہ ابن عابدین شامی (المتوفی ۱۲۵۲ھ) خاتم المحققین تسلیم کیے گئے ہیں۔

الحاصل مسلک جمہور ہر لحاظ سے راجح اور مفتی بہ ہے۔

باقی موصوف مفتی صاحب نے جو بندہ کے فتویٰ سے متعلق درج ذیل کلام کی ہے کہ :

مفتی صاحب محترم نے اپنے فتویٰ کو فتاویٰ شامی کی عبارت سے مزین کیا ہے، لیکن قابل افسوس بات یہ ہے کہ انہوں نے علامہ شامی کی نا تمام عبارت پیش کی ہے اور اس کا تکملہ یعنی آخری حصہ نظر انداز کردیا۔

تو اسکے متعلق عرض یہ ہے کہ علامہ شامی کی عبارت کی تقطیع درج ذیل ہے وکفت سترۃ الامام للکل متن کی عبارت ہے، وظاھرہ سے علامہ شامی نے اس کا پہلا مطلب بیان فرمایا جبکہ وقد یقال سے بطور جملہ معترضہ دوسرا مطلب ذکر فرمایا اور آخر میں لان العبرۃ سے مطلب اول کی دلیل بیان فرمائی۔ اول مطلب راجح جبکہ ثانی مطلب مرجوح ہے۔

بندہ نے مستفتی کے سوال پر حضرت مولانا سید زوار حسین شاہ صاحب کی عبارت کا ماخذ وظاھرہ سے وقد یقال کی عبارت تک بتایا اور حقیقت بھی یہی ہے کہ حضرت شاہ صاحب کی عبارت کا ماخذ یہی عبارت شامیہ ہے۔

راجح مطلب کو ذکر کرنے اور مرجوح مطلب ترک کرنے پر "افسوس کا اظہار" نا قابل فہم ہے جبکہ مرجوح پر فتویٰ ناجائز ہے (کما سیاتی) باقی موصوف مفتی صاحب نے مسئلہ کی وضاحت فرماتے ہوئے راجح مطلب ترک کرکے مرجوح پر فتویٰ کیوں دیا؟ واللہ اعلم بحقیقتہ۔

نیز اگر بقول مفتی صاحب یہ مکمل ایک عبارت ہے تو مسئلہ کی وضاحت کرتے ہوئے بندہ کا تحریر کردہ حصہ عبارت تحریر کرکے اس کا مستفاد کیوں واضح نہیں کیا گیا؟ اور نا معلوم اس کو کس حکمت کی بناء پر نظر انداز کردیا گیا؟

اس کے بعد موصوف مفتی صاحب نے بندہ کی ترک کردہ عبارت اور اس کا مستفاد بیان فرمایا ہے، چنانچہ فرماتے ہیں۔

مفتی صاحب موصوف نے فتاویٰ شامی کی جو عبارت چھوڑی ہے وہ یہ ہے:

وقد يقال فائدته التنبيه على انه كالمدرك لايطلب منه نصب سترة قبل الدخول فى الصلوة وان كان يلزم ان يصير منفردا بلاسترة بعد سلام امامه لان العبرة لوقت الشروع وهو وقته كان مستتراً بسترة امامه تامل۔

(ردالمحتار علی الدر المختار ج ۱، ص ۴۲۰، دار احیاء التراث العربی)

اس عبارت کا مستفاد یہ ہے کہ مسبوق مقتدی صرف اس حد تک مدرک کی طرح ہے کہ جماعت میں شمولیت کے وقت وہ سترہ کا اہتمام نہیں کرے گا یعنی "دخول فی الصلوۃ" سے پہلے اس سے نصب سترہ کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا۔

کیونکہ اعتبار (اہتمام سترہ کے مسئلہ میں) وقت شروع کا ہے اور اس وقت وہ اپنے امام کے سترہ کے ساتھ مستتر ہے لیکن امام کے سلام پھیرنے یعنی امام کے نماز سے فراغت کے بعد وہ اب منفرد ہے اور بلاسترہ ہے۔

موصوف مفتی صاحب کی مندرجہ بالا تحریر میں درج ذیل امور قابل غور ہیں:

(۱) عبارت کا مستفاد بیان فرماتے ہوئے لفظ "وقد يقال" کا مستفاد بیان نہیں کیا گیا، جس سے اس عبارت کا ضعف واضح ہو جاتا۔

(۲) لان العبرة الخ جو ظاهره الخ کی علت تھی، اس کو وقد يقال الخ کی علت بنادیا گیا، حالانکہ اگر لان العبرة الخ اس مطلب ثانی کی علت بنائی جائے تو علت اور معلول میں کوئی جوڑ اور ربط نہیں بنتا۔

کیونکہ معلول کا حاصل یہ ہے کہ مسبوق مقتدی سلام امام کے بعد منفرد بلاسترہ ہو جائے گا، جبکہ علت کا حاصل یہ ہے کہ سترہ کے مسئلہ میں وقت شروع کا اعتبار ہے، اگر شروع نماز میں مقتدی سترہ کے ساتھ مستتر تھا تو (اپنی) آخر نماز تک مستتر رہے گا اور اگر شروع نماز میں (امام کے آگے سترہ نہ ہونے کی بناء پر) مستتر نہیں تھا تو شروع نماز کی طرح (اپنی) آخر نماز تک غیر مستتر رہے گا۔

جبکہ یہاں مسبوق مقتدی کے متعلق اتنی بات پر تو اتفاق ہے کہ وہ شروع نماز میں سترہ کے ساتھ مستتر ہے (دریں صورت کہ امام کے آگے سترہ موجود ہے) تو مذکورہ اصول (الماخوذ من العلۃ) کے تحت مسبوق مقتدی اپنی آخر نماز تک سترہ کے ساتھ مستتر ہونا چاہیے۔

اگر سید زوار حسین شاہ صاحب کی اردو عبارت پر بھی غور کر لیا جاتا (جو شامی ہی کی عبارت سے ماخوذ ہے) تو اس سے بھی یہ بات واضح ہو جاتی کہ لان العبرة الخ کا تعلق وظاھرہ الخ سے ہے اور یہ فحش غلطی معرض وجود میں نہ آتی۔

واضح رہے کہ "ان العبرة لوقت الشروع" صغریٰ ہے جبکہ "وھو وقتہ کان مستتراً بسترة امامہ" کبریٰ ہے تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا، "فیکون مستترا لسترة امامہ"

(۳) ضعیف عبارت پر فتویٰ دیا گیا ہے کیونکہ "قیل" اور "یقال" سے ذکر کی گئی عبارت ضعیف ہوتی ہے، الّا یہ کہ مصنف کی عادت یا سیاق و سباق سے اس کی تصحیح ثابت ہو (کما مر من ادب المفتی) حالانکہ بلا ضرورت شدیدہ ضعیف پر فتویٰ ناجائز ہے۔

چنانچہ "ادب المفتی" میں ہے

لا یجوز العمل والافتاء بالضعیف والمرجوح الاعن ضرورة

(ادب المفتی ص ۵۷۶ مع المجموعۃ)

(۴) نیز گزشتہ دلائل و ترجیحات کی بنا پر یہ مرجوح قول ہے اور مرجوح پر فتویٰ خلاف اجماع ہے کیونکہ مرجوح راجح کے مقابلہ میں کالعدم ہے اور متقابلات میں ترجیح بلا مرجح ممنوع ہے۔

چنانچہ علامہ ابن عابدین شامی (م ۱۲۵۲ھ) نے علامہ قاسمؒ کا درج ذیل قول نقل کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

عن العلامة قاسم ان الحکم والفتیا بما ھو مرجوح خلاف الاجماع وان المرجوح فی مقابلة الراجح بمنزلة العدم والترجیح بغیر مرجح فی المتقابلات ممنوع

(شرح عقود رسم المفتی ص ۴۱)

آگے مفتی صاحب فرماتے ہیں:

مسبوق کو حسب درجہ جماعت کا اجر تو ملے گا، انشاء اللہ العزیز لیکن جب وہ اپنی بقیہ نماز کی تکمیل کرتا ہے تو اس پر منفرد کے احکام کا اطلاق ہوتا ہے۔

اس کے بعد موصوف مفتی صاحب نے چند مثالیں پیش کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ مسبوق امام کی فراغت کے بعد منفرد ہو جاتا ہے حالانکہ امام کے سلام پھیرنے کے بعد مسبوق کے بالاطلاق منفرد ہو جانے کا دعویٰ صحیح نہیں ہے، کیونکہ درج ذیل نظائر سے آپ کو علم ہوگا کہ مسبوق بعض احکام میں منفرد نہیں ہے۔

(۱) مسبوق اپنی بقیہ نماز میں ترتیب قرأۃ کے لحاظ سے اگرچہ منفرد ہے لیکن تشہد کے اعتبار سے منفرد نہیں ہے۔ چنانچہ اگر مسبوق نے مغرب کی فقط ایک رکعت پائی ہے تو سلام امام کے بعد کھڑے ہو کر قرأت میں علی ترتیب المنفرد ہوگا' قرأت کے اعتبار سے اس کی گزشتہ رکعتیں آخری دو رکعتیں تصور کی جائیں گی، لیکن ایک رکعت پڑھنے کے بعد اس پر قعدۂ اولی واجب ہوگا، کیونکہ تشہد کے اعتبار سے یہ منفرد نہیں بلکہ اس کا تعلق امام سے باقی ہے، امام کے ساتھ پڑھی ہوئی رکعت اور اس کی اپنی پڑھی ہوئی رکعت کل دو رکعتیں ہو گئیں اور دو رکعتوں کے بعد قعدہ اولی واجب ہوتا ہے، بخلاف منفرد کے وہ اگر ایک پڑھ کر قعدۂ اولی کی مقدار بیٹھ گیا تو قیام میں تاخیر کی بنا پر اس پر سجدۂ سہو واجب ہوگا۔

(۲) اسی طرح اگر مسبوق قضاء ماسبق کیلئے کھڑا ہو گیا، لیکن امام پر اس کے دخول سے قبل سجدہ سہو واجب ہو گیا تھا، تو اس میں صورت میں اگر امام سجدہ سہو کرے تو اس کو چاہئے کہ اپنی رکعت کو مقید بالسجدۃ کرنے سے قبل لوٹ آئے اور امام کے ساتھ سجدہ سہو میں شریک ہو اور اگر اس نے اپنی رکعت کو مقید بالسجدۃ کر لیا اور سجدہ سہو کیلئے نہیں لوٹ سکا تو اس کو چاہئے کہ اپنی نماز کے آخر میں سجدہ سہو کرے بخلاف منفرد کے کہ اس پر کسی دوسرے کے سہو کی بناء پر سجدہ سہو واجب نہیں ہوتا۔

(۳) مسبوق پر بالاتفاق تکبیرات تشریق واجب ہیں، بخلاف منفرد کے کہ امام اعظم ابو حنیفہ کے نزدیک اس پر تکبیرات تشریق واجب نہیں (ماخوذ من الھندیہ)

(۴) مسبوق کیلئے قضاء ما سبق پر افتتاح کیلئے رفع یدین مسنون نہیں، بخلاف منفرد کے اس پر ابتداء صلوٰۃ کیلئے رفع یدین مسنون ہے۔

اس طرح کی کئی مثالیں دی جاسکتی ہیں جن میں مسبوق منفرد کے حکم میں نہیں، اگرچہ بعض احکام داخلیہ میں وہ منفرد کے حکم میں بھی ہے۔"

لیکن علی الاطلاق اس پر منفرد کا حکم نہیں لگایا جاسکتا، یادرہے کہ سترہ ایک خارجی عمل ہے اس کو کسی حال میں بھی داخلی احکام پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔

موصوف مفتی صاحب آگے فرماتے ہیں:

(مسبوق) جب اپنی بقیہ نماز کی تکمیل کیلئے کھڑا ہوگا تو اصل ترتیب کا لحاظ کرے گا۔

یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ وہ مسبوق قرأت میں اگرچہ اصل ترتیب کا لحاظ کرے گا' لیکن تشہد کے اعتبار سے وہ اصل ترتیب کا لحاظ نہیں کرے گا بلکہ اس کا حکم منفرد سے مختلف ہوگا (کمامر)

مزید فاضل مفتی صاحب رقم طراز ہیں:

اس کی جب اپنی دو رکعت مکمل ہوں گی تو قعدۂ اولی بھی اس پر واجب ہوگا۔ ۱۲

یادرہے کہ یہ حکم مسبوق کیلئے ہر حال میں نہیں، کیونکہ مثلاً اگر اس نے مغرب کی ایک رکعت پائی ہے تو سلام امام کے بعد ایک رکعت پڑھ کر مسبوق پر قعدۂ اولی واجب ہوگا' یہاں اس کو دو رکعت مکمل کر کے قعدۂ اولی کرنے کی ضرورت نہیں جیساکہ منفرد کیلئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ دو رکعت مکمل کر کے قعدۂ اولی کرے۔

آخر میں موصوف صاحب نے غیر حنفی محدثین کے تراجم ابواب کو مستدل بنایا ہے جن کا عنوان "سترة الامام سترة لمن خلفه" ہے

یہاں اتنی بات تو بالکل واضح ہے کہ اس ترجمۃ الباب سے فقط اتنا ثابت ہوتا ہے کہ قبل از سلام خلف الامام مقتدیوں کیلئے امام کا سترہ کافی ہے اور اس میں تو کسی کا بھی اختلاف نہیں، اختلاف تو اس میں ہے کہ امام کے سلام پھیرنے کے بعد اس کا سترہ مسبوق مقتدی کیلئے کافی ہے یا نہیں؟ اور اس مسئلہ میں محدثین خاموش ہیں۔

چنانچہ اس کی وضاحت فقہاء احناف نے انہی ابواب کی احادیث سے استنباط کر کے کی ہے کہ فراغ امام کے بعد بھی مسبوق امام کے ...... سترہ کے ساتھ ...... مستتر رہے گا۔

چنانچہ اس پر "مجمع الانہر" کی عبارت تو بالکل واضح ہے۔

(وسترة الامام مجزئة) ای کافیة (عن القوم) و ان کان مسبوقا کما هو ظاهر الاحادیث الثابتة فی الصحیحین من الاقتصار علی سترته علیه الصلاة والسلام وهو سترة للقوم۔

(مجمع الانھر شرح ملتقی الابحر ج۱، ص ۱۲۲)

نیز "شامی" کے حوالہ سے "فراغ امام کے بعد" اسی سترہ کے کافی ہونے کی تصریح بھی گزر چکی ہے، ورنہ یہ کہنا تو مشکل ہو گا کہ فقہاء احناف کا یہ مسلک ان ابواب کی احادیث کے خلاف ہے یا یہ کہ انہوں نے ان ابواب کی احادیث سے استنباط میں غلطی کی ہے۔

آخر میں موصوف مفتی صاحب نے ایک فقہی ضابطہ بیان فرمایا ہے کہ "جب حکم مشتق پر لگے تو اس حکم کی علت ماخذ اشتقاق ہوتا ہے" موصوف نے ترجمۃ الباب کی عبارت میں "امام" پر حکم لگا کر اس کے ماخذ اشتقاق "امامت" کو علت قرار دیتے ہوئے اپنا مدعا یوں ثابت فرمایا:

"تو اس قاعدہ کی رو سے امام کا سترہ مقتدی کیلئے اس وقت تک سترہ ہے جب تک وہ امامت میں ہے، جب امامت سے فارغ ہو گیا، تو اب اس کا سترہ مقتدی کیلئے سترہ نہ رہا چہ جائیکہ وہ فارغ ہو کر گھر چلا گیا ہو"

یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ یہاں حکم امام پر مقصود نہیں کہ "امام کا سترہ امام کیلئے کافی ہے" بلکہ اس کے "خلف" پر حکم مقصود ہے کہ "امام کا سترہ اس کے خلف کے لئے بھی سترہ ہے" اور "خلف" مشتق منہ ہے جبکہ مذکورہ فقہی ضابطہ کا انطباق وہاں صحیح ہو گا، جہاں حکم مشتق پر لگے، لہذا یہاں اس فقہی ضابطہ کا انطباق درست نہیں معلوم ہوتا۔

امید ہے کہ مفتی غیب الرحمٰن صاحب احادیث اور اقوال فقہاء و دیگر حجج شرعیہ کی

روشنی میں اپنے فتویٰ پر نظر ثانی فرمائیں گے۔

هذا ما فهمت والله سبحانه وتعالیٰ اعلم

حررہ

محمد نصر اللہ احمد پوری

دار الافتاء جامعہ دار العلوم زکریا الخیریہ

نزد فلاح مسجد الیف۔ ٹی ایریا بلاک نمبر ۱۴۔ کراچی

بسم الله الرحمن الرحيم، اقول وبالله التوفيق

دار العلوم زکریا کے محترم مفتی محمد نصر اللہ احمد پوری نے "سترہ" کے مسئلہ پر ایک فتویٰ تحریر کیا تھا، جس میں انہوں نے اپنے موقف پر "فتاویٰ شامی" کی ایک عبارت سے استدلال کیا تھا۔ مستفتی وہ فتویٰ ہمارے پاس لائے تو ہم نے مفتی صاحب سے اختلاف کیا اور اپنے موقف کے حق میں فتاویٰ شامی کو محولہ بالا عبارت ہی کا تکملہ پیش کیا، جسے مفتی صاحب نے نظر انداز کر دیا تھا اور تائید مزید کے طور پر چند دیگر فقہی شواہد کی جانب انہیں متوجہ کیا اور اپنے موقف پر نظر ثانی کا مشورہ دیا۔ اس کے بعد تقریباً دو ماہ کی محنت شاقہ کے بعد مفتی صاحب نے پندرہ صفحات پر مشتمل ایک مبسوط فتویٰ تحریر فرمایا اور ہمیں اپنے موقف پر نظر ثانی کا مشورہ دیتے ہوئے اپنے موقف کی صحت پر اصرار کیا۔

ہم نے مفتی صاحب کی تحریر کا خالص معروضی انداز میں بغور مطالعہ کیا ہے اور اس پر ہماری گزارشات حسب ذیل ہیں:

۱۔ ہم جب کسی دینی و فقہی مسئلے پر کسی صاحب علم کے ساتھ تحریراً یا تقریراً بحث اور تبادلۂ خیال کرتے ہیں تو عجبِ نفس، انانیت اور فتح و شکست ہمارے پیش نظر نہیں ہوتی بلکہ طلب حق اور صواب و خطا کے درمیان تمیز مقصود ہوتی ہے، ہم اگر کسی شرعی مسئلے میں صواب کو پانے میں کامیاب ہو جائیں تو یہی ہماری منزل مقصود ہوتی ہے۔

۲۔ مفتی و فقیہہ کی شان اور پہچان یہ ہوتی ہے کہ وہ اصل مبحث کے دائرے میں رہ کر گفتگو کرے۔ علامہ شامی کی عبارت کا مستفاد کیا ہے؟ یہی مسئلہ مختلف فیہ ہے۔ اس کے علاوہ

مفتی محمد نصر اللہ احمد پوری صاحب نے جو حوالہ جات لکھے ہیں وہ سترہ سے متعلق تو ہیں، مبحث سے متعلق نہیں ہیں۔ مثلاً (۱) یہ کہ امام کا سترہ، مقتدی کیلئے بھی سترہ ہوتا ہے۔ خواہ وہ مدرک ہو، لاحق ہو یا مسبوق...... یہ اصولی مسئلہ مجمع علیہ ہے اور بناءِ بحث نہیں ہے۔ (۲) امام کا سترہ مقتدی کا سترہ ہوتا ہے یا امام بذات خود مقتدی کیلئے سترہ ہوتا ہے؟ یہ مسئلہ بھی بنائے بحث نہیں ہے۔ لہذا ان امور کی بابت حوالہ جات یا گفتگو جس کی زحمت مفتی صاحب نے اٹھائی، خارج از بحث ہے۔

۳- مبحث یہ ہے کہ: "امام اپنی نماز پڑھ کر چلا گیا اور مسبوق اپنی بقیہ نماز پوری کر رہا ہے، آیا اس وقت مسبوق کے سامنے سے بغیر سترہ کے گزرنا جائز ہے؟، کیونکہ امام کا سترہ تمام مقتدین کیلئے سترہ ہوتا ہے یا اب مسبوق کے سامنے سے بغیر سترہ کے گزرنا جائز نہیں ہے کیونکہ امام کے چلے جانے کے بعد امام کا سترہ جو مقتدین کا بھی سترہ تھا، اب باقی نہ رہا۔" اس مسئلے میں ہمارا موقف ثانی الذکر ہے جبکہ جناب مفتی محمد نصر اللہ احمد پوری کا موقف اول الذکر ہے۔ اور ان کی پیش کردہ عبارات ان کے موقف پر دلیل نہیں ہیں، لہذا ان کا ذکر مبحث سے غیر متعلق ہے۔

۴- ہمارے موقف پر دلائل حسب ذیل ہیں:

علامہ شامی فرماتے ہیں:

"وظاهر التعميم شمول المسبوق وبه صرح القهستانى وظاهره الاكتفاء بها ولو بعد فراغ امامه والا فما فائدته؟ وقد يقال فائدته التنبيه على انه كالمدرك لايطلب منه نصب سترة قبل الدخول فى الصلوة وان كان يلزم ان يصير منفردا بلاسترة بعد سلام امامه لان العبرة لوقت الشروع وهو وقته، كان مستترا بسترة امامه فتامل، (ردالمحتار ج۱، ص ۴۲۹ مطبوعہ بیروت)"

میرے اس استدلال پر مفتی محمد نصر اللہ صاحب نے یہ اعتراض کیا ہے کہ ضعیف قول پر فتویٰ دیا ہے کیونکہ قیل اور یقال سے ذکر کی گئی عبارت ضعیف ہوتی ہے الآیہ کہ مصنف

کی عادت یا سیاق وسباق سے اس کی تصحیح ثابت ہوئے' فتوٰی صفحہ ۱۲۔

اس کا جواب یہ ہے کہ علامہ شامی کا مختار یہی ہے کہ امام کے سلام پھیرنے کے بعد مسبوق منفرد ہو جاتا ہے:

درالمختار میں مذکور ہے: "ولو سلم ساهیا ان بعد امامه لزمه السهو" اس عبارت پر علامہ شامی نے لکھا ہے:

"لانه منفرد فی هذه الحالة" ردالمحتار ج ۱، ص ۴۰۲۔

اس عبارت کا مفہوم یہ ہے کہ امام کے سلام پھیرنے کے بعد اگر مسبوق سہواً سلام پھیر دے تو اس پر سجدۂ سہو لازم ہے، علامہ شامی اس کا سبب یہ بیان فرماتے ہیں: کیونکہ مسبوق اس حالت میں منفرد ہے۔ اس عبارت سے علامہ شامی کا یہ نظریہ روز روشن کی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ ان کے نزدیک امام کے سلام پھیرنے کے بعد مسبوق منفرد کے حکم میں ہوتا ہے اور جب وہ منفرد ہوتا ہے تو امام کا سابقہ سترہ اس کا سترہ کیسے ہوگا؟

۵- اگر بر سبیل تنزل یہ تسلیم کر لیا جائے کہ اس مسئلے میں دو اقوال ہیں، ایک قول کی بناء پر امام کے نماز سے فراغت کے بعد بھی مسبوق مقتدی کے آگے سے بلا سترہ گزرنا بلا تردد جائز ہے، جو مفتی محمد نصر اللہ صاحب کا مختار ہے، اور دوسرے قول کی بناء پر فراغت امام کے بعد مسبوق نمازی کے سامنے سے بلا سترہ گزرنا ناجائز اور موجب گناہ ہے، یہ ہمارا موقف ہے، کیونکہ نمازی کے آگے سے گزرنے کی بابت احادیث مبارکہ میں سخت وعید آئی ہے اور جب ایک مسئلے میں دو قول ہوں، ایک کا تقاضا اباحت ہو اور دوسرے کا تحریم، تو تحریم کو ترجیح دی جائے گی، کیونکہ یہ اصول فقہ میں مقرر ہے کہ جب اباحت اور تحریم میں تعارض ہو تو تحریم کو اباحت پر ترجیح دی جائے گی، لہذا ایسی قول راجح قرار پائے گا جس کے مطابق فراغت امام کے بعد مسبوق کے سامنے سے بغیر سترہ کے گزرنا جائز نہیں ہے، احتیاط کا تقاضا بھی یہی ہے۔ پس معلوم ہوا کہ یہاں تقابل اباحت و تحریم میں ہے نہ کہ عسر و یسر میں جیسا کہ مفتی احمد پوری صاحب نے سمجھا۔ احوط یہی ہے کہ احادیث میں مذکور وعید کا خطرہ مول نہ لیا جائے۔

۶- امام کا سترہ مقید ہے اور مقید کا تحقق اپنی قید کے ساتھ ہوتا ہے، لہذا امام کا سترہ قوم کیلئے سترہ اسی وقت ہوگا، جب امام موجود ہو اور نماز پڑھا رہا ہو اور جب نماز سے فارغ ہو کر جا چکا، تو جب امام ہی نہیں تو اس کا سترہ کہاں ہوگا، کیونکہ مقید کا تحقق اپنی قید کے ساتھ ہوتا ہے، کسی دیوار، درخت، ستون یا لکڑی کا نام تو "سترۃ الامام" نہیں ہے کہ اسے "علیٰ کل حال" اور "فی جمیع الاحیان" سترۃ الامام کہا اور سمجھا جائے گا، بلکہ یہ تو اس کا ایک عارضی وصف ہے، اضافی صفت ہے اور کوئی بھی چیز امام کا سترہ اس وقت کہلائے گی جب امام بالفعل نماز میں ہو اور وہ چیز اس کیلئے ساتر ہو۔ اس دلیل کی بابت محترم مفتی احمد پوری صاحب نے ہم پر یہ پھبتی کسی ہے کہ ہم نے غیر حنفی محدثین کے ترجمۃ الباب سے استدلال کیا ہے، یہ بات مفتی صاحب سے بہتر کون جانتا ہے کہ ہماری درسیات تفسیر و حدیث کی اکثر کتب غیر حنفی محدثین کی ہیں اور ہمارا اصل مستدَل تو حدیث رسول ہے، اور زیر بحث "ترجمۃ الباب" کو ہماری معلومات کے مطابق کسی حنفی محدث وفقیہ نے احناف اور دوسرے ائمہ کے درمیان مختلف فیہ قرار نہیں دیا۔

اس سلسلے میں مزید گزارش یہ ہے کہ عوام فقہی اختلافات اور فقہی دلائل کی باریکیوں سے واقف نہیں ہیں، تو مسائل کی توجیہہ و ترجیح اس انداز میں کرنی چاہئے کہ عوام کے ذہنوں میں عبادت صلوٰۃ کی جلالت و عظمت جاگزیں ہو، دینی شعائر کی حرمت و عظمت ان کے دلوں میں پیدا ہو اور یہ تب ہی ہوگا کہ اس مسئلے میں احتیاط کو معمول بنایا جائے اگر امام کی فراغت کے بعد مسبوق کے سامنے سے بلا تردد گزرنے کو رواج دیا جائے تو اس سے نماز کی بے وقعتی اور بے حرمتی لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوگی۔

۷- مفتی محمد نصر اللہ احمد پوری صاحب سے اپنے زیر بحث فتوئی میں متعدد زلات و اغلاط سرزد ہوئی ہیں جن میں سے بعض کو ہم غلط فاحش کہہ سکتے ہیں، ان میں سے چند درج ذیل ہیں:

علامہ شامی کی مسلسل عبارت ہے:

لان العبرة لوقت الشروع وهو وقتهٗ كان مستترا بسترة امامه

"اس عبارت میں لان العبرة لوقت الشروع ایک جملہ ہے اور وهو وقته الیٰ آخرہ یہ دوسرا جملہ ہے اور "وقتہ" کی ضمیر مسبوق کی طرف راجع ہے اور ان دونوں جملوں کا معنیٰ اس طرح ہے: کیونکہ (اہتمام سترہ کے مسئلہ میں) اعتبار (نماز) شروع کرنے کے وقت کا ہے اور وہ (وقت شروع) مسبوق کا وہ وقت ہے جب وہ امام کے سترہ کے ساتھ مستتر تھا۔"

مفتی احمد پوری صاحب نے ان دونوں جملوں کو صغریٰ اور کبریٰ بنایا ہے چونکہ ان جملوں میں حد اوسط صغریٰ میں محمول اور کبریٰ میں موضوع ہے، اس لئے شکل اول بنی۔ لیکن مفتی صاحب کو شاید یہ معلوم نہیں کہ نتیجہ دینے کی دو شرطیں ہیں (۱) ایجاب صغریٰ (۲) کلیۃ کبریٰ۔ اور اس صورت میں کبریٰ کلیہ نہیں ہے بلکہ ھو ضمیر کے موضوع ہونے کی وجہ سے یہ قضیہ شخصیہ ہے۔ اگر مفتی صاحب ان دو جملوں کو صغریٰ اور کبریٰ قرار دے کر ان سے نتیجہ نکالنے سے پہلے منطق کی ابتدائی کتب ایساغوجی اور مرقاۃ ہی کو پڑھ لیتے تو ان سے یہ فاحش غلطی سرزد نہ ہوتی۔

۸- مفتی صاحب نے اس عبارت کا ترجمہ یا مفہوم اس طرح بیان کیا ہے کہ سترہ کے مسئلے میں وقت شروع کا اعتبار ہے، اگر نماز کے شروع میں مقتدی سترہ کے ساتھ مستتر تھا تو اپنی نماز کے آخر تک مستتر رہے گا، ملاحظہ ہو فتویٰ صفحہ نمبر ۱۲۔ یہاں وقتہ' کی ضمیر مطلقاً مقتدی کی طرف نہیں بلکہ مسبوق کی طرف راجع ہے جیسا کہ چند سطور بعد مفتی صاحب نے بھی اس سے اتفاق کیا ہے۔ لیکن مفتی صاحب سے تسامح ہوا ہے یا انہوں نے دانستہ معنوی تحریف کرتے ہوئے لکھا ہے:

"تو اپنی آخر نماز تک مستتر رہے گا" علامہ شامی کی زیر بحث عبارت میں آخر کا لفظ نہیں ہے، یہ لفظ مفتی صاحب نے اپنا موقف ثابت کرنے کیلئے اپنی طرف سے بڑھا دیا ہے، اگر ہے تو دکھائیں۔

۹- مفتی صاحب کو معلوم ہونا چاہئے کہ فقہاء جب یہ لکھتے ہیں کہ: "اس عبارت کا ظاہر مطلب یہ ہے" تو اس کا معنیٰ یہ ہوتا ہے کہ تحقیق یا نظر دقیق اس کے خلاف ہے، جبکہ مفتی صاحب نے ظاہر کا مقابل مرجوح سمجھا۔

۱۰- ”لان العبرة الیٰ آخرہ“ کو مفتی صاحب نے اس سے متصل عبارت کی علت قرار دینے کے بجائے ابتدائی عبارت ”وظاھر التعمیم“ کی علت قرار دیا ہے، یہ ان کی فاحش غلطی ہے اس کی وضاحت یوں ہے کہ :

جب علامہ شامی نے یہ لکھا: ”در مختار کی ظاہر عبارت کا تقاضا یہ ہے کہ امام کے فارغ ہونے کے بعد بھی مسبوق کیلئے امام کا سترہ برقرار رہے گا، ورنہ اسے مسبوق کیلئے سترہ قرار دینے کا کیا فائدہ؟“

پھر بتایا کہ: ”یہ کہا جائے گا کہ اس کا فائدہ اس بات پر متنبہ کرنا ہے کہ مسبوق مدرک کی طرح ہے اور نماز میں داخل ہونے سے پہلے اس سے سترہ نصب کرنے کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا، اگرچہ یہ لازم ہے کہ امام کے سلام پھیرنے کے بعد وہ بغیر سترہ کے رہ جائے۔“

پھر بتایا کہ نماز میں داخل ہونے سے پہلے اس سے سترہ نصب کرنے کا مطالبہ کیوں نہیں کیا جائے گا؟ تو اس کی دلیل یہ دی کہ: ”اعتبار شروع وقت کا ہے اور اس وقت مسبوق امام کے سترہ سے مستتر تھا۔“

امید ہے کہ ہماری اس تشریح سے حضرت مفتی صاحب پر بخوبی یہ امر عیاں ہو جائے گا کہ: ”لان العبرۃ الخ“، ”قد یقال الخ“ کی علت ہے، نہ کہ ”وظاھر التعمیم“ کی، جیسا کہ انہوں نے سمجھا اور متبادر بھی یہی ہے کہ وہ قریب کے جملے کی علت ہو نہ کہ بعید کی۔

۱۱- مفتی صاحب نے اپنے فتویٰ کے صفحہ نمبر ۳ پر لکھا ہے:

”مسبوق اپنی بقیہ نماز میں ترتیب قرأت کے لحاظ سے اگرچہ منفرد ہے لیکن تشہد کے لحاظ سے منفرد نہیں ہے، چنانچہ اگر مسبوق نے مغرب کی ایک رکعت پائی ہے تو سلام امام کے بعد کھڑے ہو کر قرأت میں علی ترتیب المفرد ہو گا' قرأت کے اعتبار سے اس کی گزشتہ رکعتیں آخری دو رکعتیں تصور کی جائیں گی، لیکن ایک رکعت پڑھنے کے بعد اس پر قعدۂ اولیٰ واجب ہو گا، کیونکہ تشہد کے اعتبار سے یہ منفرد نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق امام سے باقی ہے۔“

یہ انہوں نے نرالی منطق پیش کی ہے اور عجیب دلیل وضع کی ہے، کیونکہ ہمارا موقف یہ ہے کہ امام کے سلام پھیرنے کے بعد مسبوق منفرد کی طرح ہو جاتا ہے، اس کا یہ مطلب

توہم نے بیان نہیں کیا کہ اس کا پچھلی پڑھی ہوئی نماز سے کوئی تعلق نہیں رہتا۔ مفتی صاحب نے جو چند تفریعات اس ضمن میں درج کی ہیں، وہ سعی لاحاصل ہے اور ان کی اسی غلط فہمی پر مبنی ہیں۔

۱۲۔ مفتی صاحب کے فتوٰی میں املا کی جو اغلاط ہیں ہم ان کی نشاندہی ضروری نہیں سمجھتے، انہیں خود ہی اپنی تحریر بغور پڑھ لینی چاہیے۔

آخر میں ہم ایک بار پھر گزارش کرتے ہیں کہ مفتی صاحب کا سارا زور اس بات پر ہے کہ ہم نے "قد یقال" پر مشتمل قول ضعیف سے استدلال کیا ہے، ہمارا ان سے مطالبہ ہے کہ وہ کسی معتبر و مستند فقیہ کا صریح قول نقل فرمائیں کہ امام سلام پھیر کر اور نماز سے فارغ ہو کر چلا گیا، پھر بھی اس کا سترہ مسبوق کیلئے سترہ رہے گا اور لوگ اس کے سامنے سے گزرنے پر گناہگار نہیں ہوں گے، لہذا جو چاہے بلاتردد گزرتا رہے۔ فتاوٰی شامی کی عبارت تو ہمارے درمیان مفہوم کے اعتبار سے مختلف فیہ ہے اور اصل مبحث ہے، اور یہ مسئلہ نادر الوقوع تو نہیں ہے کہ ہمارے اجلہ فقہاء کرام کو یہ صورت مسئلہ درپیش نہ آئی ہو لہذا تصریح نہ ملنے کا یہ سبب ہے، یہ مسئلہ تو ہر مسجد میں دن میں پانچ بار پیش آتا ہے۔

فقط هذا ماعندی واللّٰه تعالیٰ اعلم بالصواب وعلمهٗ اتم و اکمل

مفتی منیب الرحمٰن

مہتمم دارالعلوم نعیمیہ

بلاک ۱۵، فیڈرل بی ایریا، کراچی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مولانا المکرم الفاضل المحتشم حضرت مولانا مفتی منیب الرحمٰن صاحب زید مجدھم

بعد سلام مسنون! خیر وعافیت مزاج گرامی

آپ کے حسبِ امر میں نے آپ کا جواب استفتاء اور جواب الجواب اور مفتی نصر اللہ احمد پوری کی ہر دو تحریر اول سے آخر تک پڑھیں۔ بحمدہٖ تعالیٰ آپ کا موقف حق وصواب موافق عبارات فقہیہ وحدیثیہ ہے۔ مخالف نے پردہ عناد سے اپنی غلط کہی ہوئی بات کو صحیح ثابت کرنے

کیلئے مرتبط جملوں کو کھینچ تان کر بے ربط جملوں سے جوڑنے کی سعی لاحاصل کی ہے۔

ماشاء اللہ آپ نے حق واضح فرمادیا ہے اس قدر کافی ہے مخالف شاید اس کے جواب میں مزید لکھے مگر مجھے آپ سے توقع ہے کہ آپ اپنے قیمتی اوقات اس سے زیادہ اہم امور میں صرف فرمائیں گے۔

والسلام

آپ کا مخلص

محمد ابراہیم القادری غفرلہٗ

خادم جامعہ غوثیہ رضویہ باغ حیات علی شاہ، سکھر

نمازی کے آگے کا فاصلہ

سوال: نمازی کے آگے کتنی لمبائی اور چوڑائی والی چیز ہونی چاہئے کہ اس سے آگے گزرنے والا گنہگار نہ ہو؟ (عبدالغفور، ملیر توسیعی کالونی، کھوکھراپار۔ کراچی)

جواب: حالت نماز میں نمازی کے آگے سے گزرنے والے کے بارے میں حدیث شریف میں بڑی وعید آئی ہے، یہ شدید گناہ ہے۔ نمازی کے آگے کسی ایسی چیز کا ہونا جو اس کے لئے آڑ اور اوٹ بن جائے اور جس کے بعد نمازی کے سامنے یا آگے گزرنے والا گنہگار نہ ہو، اسے فقہی اصطلاح میں "سترہ" کہتے ہیں۔ اس کی مقدار یہ ہے کہ لمبائی ایک سے تین ہاتھ کے برابر ہو اور موٹائی کم از کم ایک انگلی کے برابر۔ نمازی کو چاہئے کہ سترہ اپنے مقام سجدہ کے آگے نصب کردے، اگر زمین سخت ہو اور لگانا دشوار ہو تو رکھ دے، بعض فقہاء نے کہا ہے کہ سترے کے لئے اگر کچھ بھی دستیاب نہ ہو تو نمازی اپنے آگے خط کھینچ دے یا محراب کی ہیئت بنالے، یہ گویا محض علامتی سترہ ہوگا۔ اگر کسی کھلے میدان میں باجماعت نماز ہورہی ہے تو صرف امام کے آگے سترہ کافی ہے، سب مقتدیوں کے لئے ضروری نہیں، چھوٹی مسجد میں نمازی کے آگے دیوار محراب تک کسی کو نہیں گزرنا

چاہئے۔ بڑی مسجد میں نمازی کے مقام سجدہ سے دو یا تین صفوں کا فاصلہ چھوڑ کر گزر سکتے ہیں۔

نفل نماز بیٹھ کر پڑھنا

سوال: بعض نوجوان اور تندرست لوگ بھی نفل نماز بیٹھ کر پڑھتے ہیں کیا یہ درست ہے؟ جبکہ نماز میں قیام فرض ہے؟

جواب: نوافل میں قیام فرض نہیں ہے، البتہ کھڑے ہو کر نفل پڑھنا افضل ہے اور بیٹھ کر نفل پڑھنے کے مقابلے میں اس کا ثواب دگنا ہے تاہم نوافل بلا عذر بھی بیٹھ کر پڑھنا جائز ہیں، بس ثواب میں کمی ہوگی، یعنی قیام کے بہ نسبت نصف ثواب ملے گا۔ بعض لوگ قدرت واستطاعت کے باوجود بیٹھ کر نوافل پڑھتے ہیں، خاص طور پر عشاء کے بعد کے دو نوافل اور دلیل کے طور پر یہ کہتے ہیں کہ حضور علیہ ﷺ نے بیٹھ کر نوافل پڑھے تھے۔ یہ استدلال غلط ہے، حضور علیہ ﷺ کا بیٹھ کر نفل پڑھنا آپ کی خصوصیات میں سے ہے اور آپ کے ثواب میں بھی کمی نہیں ہوتی تھی۔

فوجی ٹوپی اور ہیٹ پہن کر نماز پڑھنا

سوال: کیا فوجی ٹوپی، ہیٹ اور کرکٹ کیپ وغیرہ میں نماز ہو جاتی ہے؟ یاد رہے یہ تمام چیزیں یہودیوں اور عیسائیوں کی پیداوار ہیں۔ (انور حسین، کیماڑی۔ کراچی)

جواب: بہت سی ایسی اشیاء ہم روزمرہ زندگی میں استعمال کرتے ہیں جو اہل مغرب کی ایجاد ہیں۔ جن امور سے ”تشبہ بالکفار“ (کفار، غیر مسلموں یا بد مذہبوں سے مشابہت) لازم آتی ہے اور جو مکروہ تحریمی کے درجے میں ہے وہ ایسے امور ہیں جو کسی مذہب کا شعار یا امتیازی علامت ہوں، جسے دیکھ کر عام آدمی کا ذہن اس طرف منتقل ہو جائے، جیسے سینے پر صلیب کا نشان لٹکانا عیسائیوں کا شعار ہے، زُنّار ہندوؤں کی مذہبی شناخت ہے، وغیرہ۔ فوجی ٹوپی یا ہیٹ یا کرکٹ ہیٹ یہ چیزیں کسی کا مذہبی شعار نہیں ہیں۔ لہذا فوجی ٹوپی یا کرکٹ کے سامنے کے چھجے کو پیچھے موڑ کر نماز

پڑھ لی جائے یا ہیٹ کے ارد گرد کا چھجہ ایسے موڑا جاسکتا ہو کہ سجدے کے وقت پیشانی کے زمین پر جمنے میں حارج نہ ہو تو نماز ہو جائے گی۔ یہ امر ذہن میں رہے کہ یہاں لباس مسنون یا افضلیت و استحباب کی بات نہیں ہو رہی بلکہ محض یہ چیزیں پہن کر نماز کے جواز یا عدم جواز کی بات ہو رہی ہے۔ باقی لباس مسنون کیا ہے یا مستحب کیا ہے؟ نماز کے آداب اور وقار کا شرعی تقاضا کیا ہے؟ یہ مسئلہ یہاں زیر بحث نہیں ہے، آخر لوگ پینٹ پہن کر بھی نماز پڑھتے ہیں۔ ہاں افضل یہی ہے کہ مسنون لباس خارج نماز بھی پہنا جائے اور اس کو پہن کر نماز پڑھی جائے۔

نماز میں ٹوپی پہننے کا حکم

سوال: نماز میں ٹوپی پہننے کا شرعی حکم کیا ہے؟ کیا ننگے سر نماز پڑھنا جائز ہے؟ عموماً دیکھنے میں آیا ہے کہ بعض لوگ نماز کے وقت سر پر چھوٹا سا رومال باندھ لیتے ہیں یا مساجد میں باریک جالی دار ٹوپیاں رکھی ہوتی ہیں وہ پہن لیتے ہیں اور نماز کے بعد اتار دیتے ہیں، ان سب کا حکم کیا ہے؟ (سید ذاکر شاہ، بلدیہ ٹاؤن۔ کراچی)

جواب: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ "اے اولاد آدم! ہر نماز کے وقت اپنا لباس زیب تن کر لیا کرو۔" (الاعراف-۳۱)

اس آیت مبارکہ میں اللہ جل شانہ نے لباس کے لئے زینت کا لفظ استعمال فرما کر اپنے عبادت گزار بندوں کو یہ حکم فرمایا ہے کہ نماز کے وقت ان کا لباس اپنی استطاعت کے مطابق عمدہ اور صاف ستھرا ہونا چاہئے کیونکہ اس وقت بندہ اللہ کے دربار میں اس کے حضور کھڑے ہو کر نذرانہ بندگی بجالاتا ہے اور اپنی التجائیں پیش کرتا ہے۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی عادت مبارکہ یہ تھی کہ نماز کے وقت اپنا سب سے بہتر لباس پہنتے تھے اور فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ جمال کو پسند فرماتا ہے، اس لئے میں اپنے رب کی رضا کے لئے زیب و زینت اختیار کرتا ہوں اور پھر مندرجہ بالا آیت کی تلاوت فرماتے، اس کی روشنی میں ہمارے فقہاء کرام نے جو مسائل بیان فرمائے ہیں وہ یہ ہیں:

۱- نماز میں صرف بقدر واجب، ستر پوشی پر اکتفا نہیں کرنا چاہئے بلکہ اپنی وسعت کے مطابق صاف، عمدہ اور مکمل لباس پہننا چاہئے۔

۲- بعض مخصوص شعبوں یا محنت و مشقت سے وابستہ لوگوں کو کام کاج کے لئے الگ لباس پہننا پڑتا ہے، اس پر داغ دھبے بھی لگ جاتے ہیں اور دیکھنے میں باوقار نہیں لگتا ہے، وہ لباس اگر پاک ہے اور مکمل ستر پوش ہے تو اس سے نماز تو ادا ہو جائے گی لیکن افضل یہ ہے کہ نماز کے وقت صاف ستھرا اور باوقار لباس پہن لیا کریں۔

۳- ننگے سر نماز پڑھنے سے ادا ہو جاتی ہے لیکن افضل یہ ہے کہ عمامہ یا ٹوپی پہن کر نماز پڑھی جائے۔

۴- نماز کے وقت سر پر چھوٹا سا رومال باندھ لینا یا جالی کی ٹوپی پہن لینا اور پھر اسے اتار پھینکنا، ایسی ہر وضع جسے اختیار کر کے بندہ کسی معزز آدمی کے سامنے یا کسی باوقار محفل میں نہیں جاتا، اللہ تعالیٰ کی بارگاہ اور نماز کے وقار کے منافی ہے۔

۵- کم از کم اتنا تو ضرور کریں کہ کپڑے کی صاف ستھری عمدہ ٹوپی اپنے پاس رکھیں اور نماز و تلاوت وغیرہ کے وقت پہن لیا کریں۔

سلام کے الفاظ

سوال: ہماری مسجد میں امام صاحب نماز باجماعت میں سلام پھیرتے وقت "السلام علیکم ورحمۃ اللہ" کے بجائے "سلام علیکم رحمۃ اللہ" کہتے ہیں کیا یہ جائز ہے؟

(حکیم محمود علی بیگ پی سی ایچ ایس، کراچی)

جواب: نماز کے اختتام پر "السلام" کہنا واجب ہے اور "السلام علیکم ورحمۃ اللہ، کہنا سنت ہے اگر کسی نے صرف السلام یا سلام علیکم یا علیکم السلام کہا تب بھی نماز ہو جائے گی لیکن اس سے ترک سنت لازم آئے گا جو اجر و ثواب میں کمی کا سبب ہے، اس لئے افضل یہ ہے کہ سنت کے مطابق "السلام علیکم ورحمۃ اللہ، کہے ممکن ہے امام صاحب یہی مسنون کلمات کہتے ہوں آپ کے سننے میں فرق ہو بہتر یہ ہے کہ انہیں علیحدگی میں توجہ دلا دیں۔ اس مسئلہ کی تفصیل حاشیۃ الطحطاوی علی الدر المختار جلد اول ص ۲۳۰ پر درج ہے۔

قضانمازوں کا حکم

سوال: قضا نمازیں کس طرح ادا کی جائیں؟ کیا ہر فرض نماز کے ساتھ دو نفل پڑھ سکتے ہیں؟ (محمد عامر شیخ، لطیف آباد۔ حیدر آباد)

جواب: کوئی بھی مسلمان (مرد یا عورت) جس دن سے بلوغت کی عمر کو پہنچا ہے اس دن سے روزانہ پانچ وقت کی نماز اس کے مقررہ شرعی وقت کے اندر اس پر فرض ہے، اگر وہ اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ادا کرتا رہا ہے تو الحمد للہ، اسے اس سعادت پر اپنے رب کریم کا شکریہ ادا کرنا چاہئے اور اگر کوئی نماز اپنے مقررہ وقت کے اندر نہیں پڑھی جا سکی تو اسے "قضاء" کہتے ہیں اور ایسی قضا نمازوں کا حساب رکھنا اور ان کا بطور قضاء پڑھنا فرض ہے۔ اگر ایسی قضاء نمازیں بد قسمتی سے اتنی زیادہ ہو جائیں کہ ان کو باقاعدہ وقت کے تعین کے ساتھ ساتھ دن اور تاریخ کے بھی تعین کے ساتھ پڑھنا مشکل ہو گیا ہے یعنی نمازوں کی تعداد، اوقات، ایام اور تواریخ کا حساب رکھنا دشوار ہو گیا ہے تو اسے عرف عام میں "قضائے عمری" کہتے ہیں۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ ان تین اوقات (طلوع، زوال، غروب) کے علاوہ جو مکروہ تحریمی ہیں، جب بھی فرصت ملے قضا نمازیں پڑھتے رہیں اور ہر وقت کی نماز کے ساتھ یعنی وقتی نماز سے پہلے یا بعد میں کم از کم اس وقت کی ایک قضا بھی پڑھ لیں اور نیت اس طرح کریں کہ مثلاً فجر یا ظہر یا عصر یا مغرب یا عشاء اور وتر کی پہلی یا آخری نماز جو میرے ذمے باقی ہے، اسے بطور قضا ادا کرتا ہوں، اس طرح اگر بالفرض ہماری پڑھی ہوئی قضا نمازیں، اس تعداد سے زیادہ ہو گئیں جو ہمارے ذمے باقی ہیں تو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں نفل شمار ہوں گی اور انشاء اللہ ان کا بھی اجر ملے گا۔ ہر فرض نماز کے ساتھ دو یا زیادہ نفل پڑھنا بہت اچھی بات ہے لیکن نفل فرضوں کا بدل نہیں ہو سکتے، البتہ فرضوں کے اندر کچھ کمی رہ گئی ہو تو اس کی تلافی کا سبب بن سکتے ہیں۔

بہت سی قضا نمازوں کو تخفیف کے ساتھ پڑھنے کا مسئلہ

سوال: جس شخص کے ذمے کئی سال کی مثلاً پانچ دس سال کی نمازیں قضا ہوں، وہ پڑھنا چاہے تو بعض علماء نے جو قضاء عمری کی نمازوں میں تخفیف کا مسئلہ لکھا ہے وہ یہ ہے کہ پہلی تخفیف ہر رکوع اور ہر سجدہ میں تین تین بار "سبحان ربی العظیم"، "سبحان ربی الاعلیٰ" کی جگہ صرف ایک ایک بار کہے دوسری تخفیف یہ کہ فرضوں کی تیسری اور چوتھی رکعت میں "الحمد شریف" کی جگہ فقط "سبحان اللّٰہ" تین بار کہہ کر رکوع کرلے، تیسری تخفیف یہ کہ پچھلی التحیات کے بعد مکمل درود ابراہیمی اور دعا کی جگہ صرف "اللھم صلّ علی محمد والہ" کہہ کر سلام پھیر دے، چوتھی تخفیف یہ کہ وتروں کی تیسری رکعت میں دعا قنوت کی جگہ اللہ اکبر کہہ کر فقط ایک یا تین بار "رب اغفرلی" کہے۔ لیکن جن کتابوں میں یہ مسئلہ لکھا ہے وہاں کسی فقہ کی کتاب کا حوالہ نہیں ہے۔ آپ سے التماس ہے کہ بتائیں یہ کونسی حدیث یا فقہ سے ثابت ہے؟

(احمد بخش سکندری، جامع مسجد قبا۔ لیاقت آباد۔ کراچی)

جواب: صاحب در مختار علامہ علاؤالدین حصکفی نے واجبات صلوٰۃ کا بیان کرتے ہوئے ان میں "تعدیل ارکان" کو بھی شمار کیا ہے اور لکھا ہے کہ رکوع و سجود میں ایک تسبیح سکون کے ساتھ ٹھہرے رہنا واجب ہے، اس سے اشارۃً معلوم ہوا کہ رکوع و سجود میں تسبیحات کا پڑھنا، تعداد سے قطع نظر، واجبات صلوٰۃ میں سے نہیں ہے، (رد المحتار علی الدر المختار ج ۲، ص ۹۳ المطبوعہ دار احیاء التراث العربی) اسی کتاب کے صفحہ ۱۵۲ پر علامہ ابن عابدین شامی نے رکوع و سجود میں تین بار تسبیح پڑھنے کو نماز کی سنتوں میں شمار کیا ہے اور لکھا ہے کہ اگر رکوع و سجود میں تسبیح مطلقاً نہ پڑھی یا تین سے کم پڑھیں تو کراہت تنزیہی لازم آئے گی، اسی کتاب کے صفحہ ۱۷۵ پر مزید لکھا ہے کہ اگرچہ قواعد مذہب کی رو سے رکوع و سجود میں تین تسبیح پڑھنا واجب ہونا چاہئے لیکن روایت سے ان کا سنت ہونا ہی ثابت ہے اور تین سے زیادہ

طاق مرتبہ پڑھنا مستحب ہے۔ لہذا اگر قضاء نمازوں کی کثرت کی بناء پر تخفیف کر کے رکوع وسجدے میں صرف ایک بار تسبیح پڑھ لی تو نماز صحیح طور پر ادا ہو جائے گی صرف کراہت تنزیہی لازم آئے گی، لیکن اسے عام معمول نہیں بنانا چاہئے۔ فرض کی پچھلی دو رکعات میں قرأت فرض یا واجب نہیں ہے لہذا نمازی اگر کچھ بھی نہ پڑھے اور ایک تسبیح کی مقدار سکوت کر کے کھڑا رہے یا محض ایک بار "سبحان اللہ" پڑھے تو نماز صحیح طور پر ادا ہو جائے گی، اور اگر قضاء شدہ نمازیں کثیر ہوں تو فریضۂ شرعی سے سبکدوش ہونے کے لئے فرض کی تیسری اور چوتھی رکعت میں قضا پڑھتے ہوئے تخفیف کر سکتا ہے، یا کبھی نیند کا غلبہ ہو یا بھوک و پیاس کا غلبہ ہو یا کوئی ضرورت شدیدہ لاحق ہو یا بچہ چلا رہا ہو اور ماں نماز پڑھتے ہوئے بے چین ہو جائے یا کوئی مدد کے لئے پکار رہا ہو تو ادا نماز میں بھی تخفیف کر سکتا ہے، لیکن اسے معمول نہیں بنانا چاہئے کیونکہ افضل تو قرأت ہی ہے اور رسول اللہ ﷺ نے اس پر دوام فرمایا ہے (ہدایہ اولین ص ۱۴۸ مطبع شرکت علمیہ)۔ علامہ علاؤالدین حصکفی نے الدر المختار میں لکھا ہے کہ نماز وتر میں جو دعائے قنوت واجب ہے اس سے کوئی معین دعا مراد نہیں ہے بلکہ مطلق دعا مراد ہے اس کے تحت علامہ شامی نے لکھا ہے کہ کسی بھی دعاء کے پڑھنے سے واجب ادا ہو جائے گا۔ البتہ مخصوص دعا "اللھم انا نستعینک" کا پڑھنا سنت ہے۔ آگے چل کر علامہ شامی نے لکھا ہے کہ جو مسنون دعا قنوت کو صحیح طور پر نہ پڑھ سکتا ہو تو وہ "ربنا اتنا فی الدنیا حسنۃ" والی دعا پڑھ لے، اور ابو اللیث سمرقندی کے حوالے سے انہوں نے لکھا ہے کہ "اللھم اغفرلی" تین بار پڑھ لے اور ایک قول یہ بھی ہے کہ "یارب" تین بار پڑھ لے۔ (فتاویٰ شامی طبع جدید ص ۱۴۳، ۳۸۵، جلد ۲) لہذا اگر کسی کے ذمے قضا نمازیں کثیر تعداد میں ہوں تو وہ اس تخفیف سے فائدہ اٹھا سکتا ہے اور کسی ضرورت شدیدہ کے موقع پر ادا نماز پڑھتے وقت بھی تخفیف کر سکتا ہے لیکن اسے عادت اور معمول نہ بنائے۔ افضل دعاء مسنون ہی کا پڑھنا ہے اور اسی میں کامل اجر ہے۔

قضا نمازیں ادا کرنا

سوال: ایک آدمی سے بہت سی نمازیں قضا ہو گئیں مگر اسے تعداد معلوم نہیں۔ اگر وہ ہر وقت کی نماز کے ساتھ ایک نماز قضا ادا کرے تو فجر اور عصر میں کس طرح ادا کرے گا کیونکہ وہ مکروہ وقت ہوتا ہے؟ (محمد مختار احمد۔ ڈیرہ غازیخان)

جواب: علماء نے فرمایا ہے کہ ایسی صورتحال میں جب بھی اسے توفیق ہو اور موقع ملے، قضا نمازیں پڑھتا رہے، فرض کی قضا فرض ہے اور وتر کی نماز چونکہ واجب ہے، اس لئے اس کی قضا بھی واجب ہے، سنتوں کی قضا نہیں ہے۔ ایک ترتیب سے پڑھتا چلا جائے یعنی فجر کے دو فرض، ظہر کے چار فرض، عصر کے چار فرض، مغرب کے تین فرض، عشاء کے چار فرض اور تین وتر۔ ذہن میں یہ نیت کرے کہ وہ پہلی نماز فجر یا ظہر یا عصر یا مغرب یا عشاء یا وتر جو میرے ذمے باقی ہے ادا کر رہا ہوں، جو ادا کرتا چلا جائے گا وہ منہا ہو جائے گی اور اس کے بعد والی پہلی ہو جائے گی۔ اذان فجر یعنی صبح صادق سے فرائض فجر تک، اس کے بعد سے طلوع آفتاب تک اور فرائض عصر کے بعد ان تین اوقات میں نوافل پڑھنے منع ہیں لیکن قضا نمازیں پڑھ سکتے ہیں اور سجدۂ تلاوت بھی کر سکتے ہیں۔ صرف تین اوقات جو مکروہ تحریمی ہیں ان میں قضا نمازیں نہیں پڑھنی چاہئیں یعنی طلوع آفتاب (آفتاب کی پہلی کرن نمودار ہونے سے بیس منٹ تک)، غروب آفتاب (یعنی غروب آفتاب سے پہلے کے ۲۰ منٹ) اور ضحوۂ کبریٰ (زوال سے پہلے کا وقت)۔

قضائے عمری سے کیا مراد ہے؟

سوال: ایک مولانا صاحب نے ایک اخبار میں اس سوال کے جواب میں کہ قضا عمری کیسے ادا کی جائے؟ فرمایا کہ قضا عمری کچھ نہیں ہے۔ بس توبہ و استغفار کریں، اللہ تعالیٰ معاف فرمانے والا ہے، اس جواب سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ قضا شدہ نمازوں کی قضا لازم نہیں ہے، بس توبہ کر لینا کافی ہے۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ اگر کسی

کی ایک یا کئی نمازیں قضا ہو گئی ہوں تو کیا محض توبہ واستغفار سے ان کی تلافی اور بارگاہِ الٰہی سے معافی ہو جائے گی یا قضا پڑھے بغیر انسان بری الذمہ نہیں ہو سکتا؟

(عزیز الحسن برنی، محمد فرحان' دستگیر کالونی)

جواب: نماز ہر عاقل وبالغ مسلمان مرد وعورت پر فرض قطعی اور فرض عین ہے حتیٰ کہ اگر کھڑے ہو کر پڑھنے پر قدرت نہیں ہے تو بیٹھ کر پڑھے، بیٹھنے پر بھی قادر نہیں ہے تو لیٹے لیٹے اشارے سے رکوع وسجود کرے، الغرض جب تک ہوش وحواس قائم ہیں، نماز کا فریضہ ساقط نہیں ہوتا۔ ایک نماز بھی بلا عذر اپنے وقت کے اندر نہ پڑھنا، غفلت سے چھوڑ دینا گناہِ کبیرہ ہے اور گناہ کبیرہ کا مرتکب فاسق کہلاتا ہے۔ ہاں کبھی بھولے سے وقت نکل جائے یا انسان بے اختیار سو یا رہ جائے، یعنی یہ عادت ومعمول نہ ہو، تو اس کے لئے رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے "جس کی نماز سوتے میں رہ جائے یا بھولے سے رہ جائے تو جیسے ہی اسے یاد آئے (یا بیدار ہو) فوراً پڑھ لے (بشرطیکہ وہ تین اوقات نہ ہوں جن میں ہر قسم کی نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہے)۔" نماز اپنے وقت کے اندر نہ پڑھی ہو، کوئی عذر بھی نہ ہو اور فوت ہو جائے تو اس کی قضا لازم ہے، قضا پڑھنے کے باوجود، بلا عذر وقت کے اندر نہ پڑھنے کا جو گناہ ہے اس پر رب تبارک وتعالیٰ سے توبہ کرتے رہنا چاہئے۔ رب کا مطالبہ ادائے کامل (وقت کے اندر پڑھنے) کا تھا، بندے نے اپنی کوتاہی کی بناء پر ادائے ناقص کی (یعنی وقت مقررہ گزرنے کے بعد پڑھی) لہٰذا قضا پڑھنے کے باوجود اللہ تعالیٰ قبول فرمالے تو اس کا کرم ہے اور وہ رد فرما دے تو یہ اس کا حق ہے۔ بندے پر لازم ہے کہ قضا بھی پڑھے، اپنی تقصیر کی معافی بھی مانگتا رہے اور اس کی رحمت سے قبولیت کی آس بھی لگائے رکھے۔ بالغ ہونے کے بعد سے جتنی بھی نمازیں فوت ہوئی ہیں، ایک ایک کر کے ان سب فرائض کی قضا (مع وتر عشاء) لازم ہے اور قضا پڑھنے میں تاخیر نہیں کرنی چاہئے کیونکہ کسی کے علم میں نہیں کہ زندگی کے کتنے ماہ وسال اور کتنی سانسیں باقی ہیں اور کیا خبر زندگی کا چراغ کب گل ہو جائے۔ اگر بدقسمتی سے فوت

شدہ نمازیں اتنی زیادہ ہیں کہ ان کا کوئی حساب ہی نہیں ہے اور ان سب کو اکٹھا پڑھنا دشوار ہو تو یہ معمول بنالے کہ ہر نماز کے ساتھ ایک ایک دن کی نمازیں یا کم از کم ایک وقت کی نماز بطور قضا پڑھے۔ قضا پڑھنے کے لئے سنتیں چھوڑنی پڑیں تو چھوڑ دے۔ فتوح الغیب میں شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانی رضی اللہ عنہ کا یہ قول نقل فرمایا ہے "جو شخص فرض چھوڑ کر نفل وسنت میں مشغول ہوگا تو یہ اس کی جانب سے قبول نہیں کیے جائیں گے اور وہ رسوا ہوگا۔" (فتاویٰ رضویہ طبع جدید)، اسی مقام پر عوارف المعارف کے حوالے سے شیخ شہاب الدین سہروردی کا یہ قول درج ہے "ہمیں یہ روایت پہنچی ہے کہ جب تک فرض ادا نہ کیا جائے، اللہ تعالیٰ کوئی نفل بھی قبول نہیں فرماتا۔ (ایسے لوگوں کو) اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ "تمہاری مثال اس بندۂ سوء کی سی ہے جو قرض ادا کرنے سے پہلے تحفے بانٹتا پھرے۔" عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں "ہمیں نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور جو زکوٰۃ نہ دے اس کی نماز بھی قبول نہیں۔" (فتاویٰ رضویہ۔ حوالہ الجامع الکبیر)۔ رسول اللہ ﷺ کی حیات مبارکہ میں غزوۂ خندق کے موقع پر دشمن کے خوف اور یلغار کے خطرے کے پیش نظر ایک دن مسلمانوں کو نماز پڑھنے کی مہلت بھی نہ مل سکی۔ سنن ترمذی میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ بیان کرتے ہیں کہ غزوۂ خندق کے موقع پر ایک دن مشرکین نے رسول اللہ ﷺ کو اس حد تک جنگ میں مشغول رکھا کہ آپ کی چار نمازیں فوت ہو گئیں۔ جب رات کا کچھ حصہ گزر گیا جتنا بھی اللہ نے چاہا پھر آپ نے بلال کو حکم فرمایا، انہوں نے اذان واقامت کہی اور آپ نے ظہر کی نماز پڑھی، پھر انہوں نے اقامت کہی اور آپ نے عصر کی نماز پڑھی، (یعنی رسول اللہ ﷺ نے باجماعت قضا نمازیں پڑھیں۔) اسی سے علماء نے یہ مسئلہ اخذ کیا ہے کہ جو صاحب ترتیب ہو یعنی جس کی مسلسل چھ نمازیں قضا نہ ہوئی ہوں اور کسی سبب سے اس کی ایک دو نمازیں قضا ہو جائیں تو وہ پہلے اپنی فوت شدہ نماز پڑھے اور

پھر اس وقت کی نماز پڑھے۔ بشرطیکہ وقت میں گنجائش ہو، جیسا کہ حضور ﷺ نے پہلے ظہر، عصر اور مغرب کی فوت شدہ نمازوں کی قضا پڑھی اور پھر عشاء کی نماز پڑھی جس کا وقت ابھی باقی تھا۔ تاہم اگر کسی کے ذہن میں قضا عمری کا تصور یہ ہے کہ کسی خاص دن یا خاص موقع و مقام پر ایک ایک یا چند نمازیں قضا پڑھ لے گا تو اس سے زندگی بھر کی ساری فوت شدہ نمازوں کی تلافی ہو جائے گی، تو یہ تصور بالکل فاسد اور باطل ہے، اس کی شریعت میں کوئی اصل نہیں ہے' اور یہ تصور بھی باطل ہے کہ فوت شدہ نمازوں کی قضا پڑھے بغیر محض توبہ و استغفار سے معافی ہو جائے گی۔ یہ اسلام کے تصور توبہ کی بالکل باطل تشریح اور لوگوں کو گناہ پر قائم رہنے کا حوصلہ دلانا ہے۔ توبہ کی تو لازمی شرط یہ ہے کہ انسان شریعت کے مقرر کئے ہوئے ضابطے کے مطابق اپنے گناہ کی تلافی کرے اور اس کے ساتھ ساتھ اپنی کوتاہی و غفلت پر اللہ تعالیٰ سے معافی بھی مانگے۔

سوال: میری عمر ۷۵ سال کے لگ بھگ ہے، ۲۲ سال سے متواتر نماز پڑھ رہی ہوں، اندازاً چالیس سال کی نمازیں میرے ذمے باقی ہیں، مختلف امراض لاحق ہیں، قضا نمازوں اور روزوں کا فدیہ اپنی نادار اولاد کو دے سکتی ہوں؟ (عزیزہ۔ کراچی)

جواب: سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی اس نعمت پر اس کا شکر ادا کیجئے کہ اس نے آخرت کی جولدہی اور عذاب آخرت کا خوف آپ کے دل میں پیدا کیا۔ اب آپ گزشتہ گناہوں کی تلافی کرنا چاہتی ہیں، یہ اس بات کی علامت ہے کہ آپ کا ضمیر ابھی زندہ ہے اور ایمان کی حرارت باقی ہے۔ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کے حضور صدق دل سے توبہ کریں، اس کے بعد حسب توفیق پانچ وقت کے فرائض اور وتر کی قضا پڑھیں۔ کھڑے ہو کر نہیں پڑھ سکتیں تو بیٹھ کر پڑھیں، رکوع و سجود کرنے کی بھی طاقت نہیں ہے تو اشارے سے پڑھیں۔ اگر بیٹھ کر اشارے سے پڑھنے کی بھی قدرت نہ ہو تو لیٹ کر اشارے سے پڑھیں۔ جب نماز اشارے سے پڑھی جائے تو حسب استطاعت سجدے کے لئے رکوع کے بہ نسبت زیادہ جھکیں۔ اور اگر لیٹ کر اشارے سے پڑھنے کی بھی قدرت نہ ہو تو پھر عذر کی بناء پر نماز چھوڑ دے اور صحت

یاب ہونے پر قضاء کرے۔ زندگی میں قضا نمازوں کی تلافی فدیے سے نہیں ہو سکتی، پڑھنی لازمی ہیں۔ البتہ انتہائی ضعیف العمر شخص یا دائمی مریض یا انتہائی کمزور جو روزے رکھنے کی جسمانی طاقت نہیں رکھتا، وہ فدیہ دے، ایک روزے کا فدیہ دو کلو گرام ۵۰ اگرام گندم کا آٹا یا اس کی قیمت ہے۔ نماز کے فدیے کے بارے میں قرآن و حدیث میں کوئی حکم وارد نہیں ہوا، تاہم فقہاء نے روزے پر قیاس کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ مرض وفات میں وفات سے پہلے بقائمی ہوش و حواس، اگر کوئی سمجھتا ہے کہ اس کے ذمے نمازیں باقی ہیں تو فدیۂ نماز کی وصیت کرے، اس کے ورثاء اس کے ترکے سے فدیہ ادا کریں، اگر قضا نمازیں بہت زیادہ ہیں اور ترکے کی ایک تہائی سے فدیہ پورا نہیں ہوتا تو باقی وارثوں کی مرضی پر ہے۔ ایک دن کی پانچ نمازوں (فرائض) اور وتر کو ملا کر چھ روزوں کے فدیے کے برابر دینا ہوں گے۔ اگر اللہ تعالیٰ اپنی شان کریمی سے نمازوں کے بدل کے طور پر قبول فرمالے تو اس کا کرم ہوگا، ورنہ مالی صدقے کا اجر ضرور ملے گا، انشاء اللہ۔ نماز روزے کا فدیہ، کفارۂ صوم، کفارۂ قسم، زکوٰۃ اور نذر کی رقوم اپنے باپ، دادا، ماں، دادی، نانی، نانا (یعنی اصول) اور بیٹا، بیٹی، پوتا، پوتی، نواسی، نواسا (یعنی فروع) کو دینے سے ادا نہیں ہوگی۔

سوال: پچھلے دنوں میں نے آپ کا جواب پڑھا جس میں آپ نے لکھا تھا کہ قضائے عمری پڑھنے کے لئے اگر سنت بھی چھوڑنی پڑے تو چھوڑ دینا چاہئے کیا سنت مؤکدہ بھی چھوڑ سکتے ہیں؟ اگر ایک شخص کو دس سال کی نماز پڑھنی ہے تو کیا وہ دس سال تک سنت نہیں پڑھے گا؟

جواب: جی ہاں! جب آپ گزشتہ قضا نمازیں پڑھ رہے ہوں تو سنت مؤکدہ بھی چھوڑ سکتے ہیں، (نوٹ: اس جواب پر اشکال اور اس کا تفصیلی جواب جلد ثانی میں آرہا ہے)۔

سوال: نماز قضائے عمری پڑھنے کا کوئی خاص طریقہ ہے یا عام نماز کی طرح پڑھی جائے گی یعنی جو سورتیں عام نماز میں پڑھی جاتی ہیں ویسے ہی پڑھی جائیں گی؟

جواب: قضا نماز عام نمازوں کی طرح ہی پڑھی جائے گی اگر بہت زیادہ ہوں تو قرأت اور تسبیحات میں تخفیف کر سکتے ہیں۔

سوال : کیا فجر اور عصر کی نماز سے پہلے نفل اور قضا عمری نماز پڑھ سکتے ہیں۔

جواب : صبح صادق کے بعد اور فجر کی فرض نماز سے پہلے نفل نماز نہیں پڑھنی چاہئے۔ فجر کی دو سنتیں اور قضا نمازیں پڑھ سکتے ہیں اور عصر سے پہلے نفل اور قضا دونوں پڑھ سکتے ہیں۔

سوال : کیا وتر کی بھی قضائے عمری پڑھی جائے گی؟

جواب : چونکہ وتر کی نماز واجب ہے اس لئے اس کی قضا پڑھنا بھی واجب ہے۔

سوال : فجر کی نماز قصر اور قضاء عمری میں دو رکعت فرض سے پہلے دو سنت پڑھنا ضروری ہے یا نہیں؟ (عبدالسمیع خان۔ کراچی)

جواب : حالتِ سفر میں فجر کی سنتیں پڑھ لینا افضل ہے کیونکہ فجر کی سنتیں زیادہ مؤکدہ ہیں۔ فجر کی گزشتہ نمازیں پڑھی جارہی ہوں تو سنتیں پڑھنا ضروری نہیں ہے۔

سوال : میں فجر اور عصر کی نمازیں نمازوں کے اوقات میں پڑھنے سے پہلے قضا عمری نمازیں پڑھتا ہوں کیا یہ صحیح ہے؟

جواب : اگر آپ کے ذمے قضا نمازیں باقی ہیں تو یہ طریقہ صحیح ہے بلکہ اگر فجر اور عصر کے وقت نماز ادا کرنے کے بعد وقت میں گنجائش ہے تو اس میں بھی قضا نماز پڑھ سکتے ہیں۔

سوال : چار سنت اور چار فرض پڑھتے وقت اگر دو رکعت کے بعد بیٹھ کر التحیات پڑھنا بھول جائیں تو سجدہ سہو ادا کر کے نماز ہو جائے گی یا دوبارہ پڑھنی ضروری ہے؟

جواب : جی ہاں! اس صورت میں سجدہ سہو ادا کرنے سے نماز صحیح طور پر ادا ہو جائے گی۔

ظہر یا جمعہ کی ابتدائی چار سنتیں رہ جائیں تو کب پڑھے؟

سوال : ظہر کی جماعت کھڑی ہو گئی اور آنے والا نمازی امام کی اقتداء میں جماعت میں شامل ہو گیا، اس طرح اس کی فرضوں سے پہلے کی چار سنتیں رہ گئیں یا امام خطبہ جمعہ کے لئے کھڑا ہو گیا اور اس وقت آنے والا نمازی ابتدائی چار سنتیں چھوڑ کر خطبہ سننے کے لئے بیٹھ گیا اور پھر نماز جمعہ ادا کی گئی۔ اب ان دونوں صورتوں میں دریافت طلب امر یہ ہے کہ آیا وہ نماز کی ابتدائی چھوٹی ہوئی سنتیں پہلے پڑھے یا انہیں فرائض کے بعد والی سنتوں کے بعد پڑھے؟ (جاوید خان، کیماڑی۔ کراچی)

جواب : علامہ علاؤالدین حصکفی نے اپنے فتاویٰ الدر المختار میں لکھا ہے کہ اگر ظہر کی پہلی چار سنتیں رہ جائیں تو انہیں فرض کے بعد والی دو سنتوں سے پہلے پڑھے، یہ امام محمد کا قول ہے اور اسی پر فتویٰ ہے۔ اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی نے ردالمحتار میں لکھا ہے کہ اگرچہ فقہ کی عام متون میں یہی ہے، لیکن فتح القدیر میں اسے ترجیح دی گئی ہے کہ پہلے کی چھوٹی ہوئی چار سنتوں کو فرض کے بعد والی دو سنتوں کے بعد پڑھے، الامداد اور فتاویٰ العتابی میں اسی کو مختار قرار دیا گیا ہے اور مبسوط شیخ الاسلام میں بھی اسی کو صحیح ترین قرار دیا گیا ہے۔ لہٰذا ظہر یا جمعہ کی پہلی چھوٹی ہوئی سنتوں کو دونوں طرح پڑھنا درست ہے، لیکن میری رائے میں علامہ شامی نے جسے مختار اور صحیح ترین قرار دیا ہے، وہی زیادہ بہتر اور راجح ہے، یعنی یہ کہ پہلے فرض کے بعد والی سنتوں کو اپنے مقام پر پڑھا جائے اور پھر پہلے کی چھوٹی ہوئی سنتیں پڑھ لی جائیں کیونکہ پہلے والی تو اپنے مقام سے ہٹ چکی ہیں، کم از کم بعد والی تو اپنے مقام پر پڑھ لی جائیں، اور سنن ابن ماجہ کی ایک حدیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ حضرت عائشہ بیان کرتی ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ سے فرض ظہر سے پہلے والی چار سنتیں رہ جاتیں تو آپ انہیں بعد والی دو رکعتوں کے بعد پڑھتے (سنن ابن ماجہ باب من فاتتہ الاربع قبل الظہر)، یہ ساری بحث فتاویٰ شامی جلد اص ۴۸۳ پر موجود ہے۔

کیا عبادت میں نیابت جائز ہے؟

سوال : حج بھی، نماز اور روزے کی طرح جسمانی عبادت ہے، کیا عبادات میں نیابت جائز ہے، کیونکہ "حج بدل" تو سنتے رہتے ہیں، نماز اور روزے کے بارے میں سننے میں نہیں آیا؟

(قاری مختار احمد، گوہر آباد۔ کراچی)

جواب : "بدل" سے مراد ہے: عبادت میں نیابت، یعنی کسی شخص کا دوسرے کی طرف سے عبادت ادا کرنا، اس طرح کہ وہ فرض سے سبکدوش ہو جائے۔ اس معنی میں یہ مسئلہ فرض عبادت سے متعلق ہے۔ شریعت کا اصول یہ ہے کہ بدنی عبادت

میں نیابت یا بدل کی گنجائش نہیں ہے جس عاقل و بالغ مسلمان مرد یا عورت کے ذمے شریعت نے فرض عائد کیا ہے اسی کے ادا کرنے سے وہ عہدہ بر آ ہوگا اور فرض ساقط ہوگا۔ کسی اور کے ادا کرنے سے فرض ساقط نہیں ہوگا۔ روزہ بلا عذر یا عارضی سبب (سفر یا مرض) سے چھوٹ جائے تو اس کا بدل قضا ہے، دائمی عذر (ضعف یا مرض) ہو تو اس کا بدل فدیہ ہے۔ حدیث پاک میں ہے کہ "کوئی شخص وفات پا جائے اور اس کے ذمے فرض روزے رہ گئے ہوں، تو اس کا ولی اس کی جانب سے روزے رکھے۔" اس حدیث پاک کا منشا یہ ہے کہ اس کا ولی اس کی جانب سے قضا شدہ روزوں کا فدیہ ادا کرے، اگر وفات پانے والے نے وصیت کی ہو تو یہ حکم وجوب پر محمول ہوگا؟ ورنہ یہ حکم استحبابی ہے اور ولی یا ورثاء کی مرضی پر موقوف ہے۔ نماز میں بدل یا نیابت کا کوئی تصور نہیں ہے، بصورت عذر بیٹھ کر، لیٹ کر اور اشارے سے بھی پڑھ سکتا ہے اور بلا عذر نہ پڑھے تو قضا ہے۔ مالی عبادت میں بدل اور نیابت کی شریعت نے اجازت دی ہے۔ یعنی ایک مالدار شخص اپنی زکوٰۃ یا فطرہ ادا کرنے کے لئے کسی کو اپنا نائب بنا سکتا ہے۔ حج میں چونکہ بدنی اور مالی دونوں پہلو ہیں، اس لئے اس میں شریعت نے نیابت اور بدل کی گنجائش رکھی ہے لیکن جو مالدار شخص تندرست ہے اور خود حج ادا کرنے پر قادر ہے تو زندگی میں اس کے لئے بدل کی گنجائش نہیں ہے۔ اگر بیمار ہے، ضعیف ہے یا معذور ہے تو کسی کو اپنی طرف سے 'حج بدل' کرنے پر مامور کرے یا عذر و مرض کوئی سبب مانع تو نہیں تھا لیکن بد قسمتی اور لاپرواہی کی بناء پر زندگی میں فریضۂ حج ادا نہیں کر سکا، تو موت سے پہلے "حج بدل" کی وصیت کرے اور کسی وارث یا غیر وارث کو اس پر مامور کرے۔ اگر کوئی عذر مانع بھی نہیں تھا اور بد قسمتی سے موت سے پہلے وصیت بھی نہیں کی تو ورثاء اگر اس پر رحم کرتے ہوئے رضاکارانہ طور پر خود اس کا حج بدل ادا کر دیں یا کرا دیں تو اللہ کی رحمت اور کرم سے مقبولیت کی امید کرنی چاہئے کہ شاید وہ فرض کو ساقط فرما دے، ورنہ اجر سے تو یقیناً محروم نہیں فرمائے گا۔

کیا بخار کی حالت میں نماز قضا کی جا سکتی ہے؟

سوال: اگر طبیعت زیادہ خراب ہو جائے (مثلاً تیز بخار ہو جائے) تو کیا نماز قضا کی جا سکتی ہے؟ گناہ تو نہیں ملے گا؟ (دانیال۔ کراچی)

جواب: طبیعت خراب ہونے یا تیز بخار کی صورت میں نماز قضا کرنا جائز نہیں ہے اگر کھڑے ہو کر نہیں پڑھ سکتا تو بیٹھ کر پڑھے، رکوع و سجود کی ادائیگی پر قادر نہیں ہے تو اشارے سے رکوع و سجدہ کرے، تکلیف زیادہ ہے تو سنتیں چھوڑ دے صرف فرض پڑھ لے، ترک کرنے پر گناہ گار ہوگا توبہ کرے اور بعد میں قضا پڑھے۔

نماز میں صاحب ترتیب کون ہے؟

سوال: صاحب ترتیب نمازی کون کہلاتا ہے جس کی فجر کی نماز قضا ہوتی رہتی ہے کیا وہ صاحب ترتیب رہتا ہے؟ (ابو اللحم شہزاد۔ کراچی)

جواب: جس خوش نصیب مومن کی بلوغت کے بعد کبھی چھ نمازیں مسلسل قضا نہ ہوئی ہوں وہ "صاحب ترتیب" کہلاتا ہے۔ جس کی بد قسمتی سے فجر کی یا کوئی ایک نماز قضا ہو جاتی ہے مگر وہ اسے دوسری نماز سے پہلے قضا پڑھ لیتا ہے تو وہ بدستور "صاحب ترتیب" رہتا ہے۔

صاحب ترتیب پہلے قضا پڑھے

سوال: اگر بد قسمتی سے کسی کی فجر اور ظہر کی نماز قضا ہو گئی ہے اور عصر کی جماعت کھڑی ہونے والی ہے تو وہ کیا کرے؟ (شہزاد۔ کراچی)

جواب: اگر وہ "صاحب ترتیب" ہے تو پہلے فجر اور ظہر کی قضا نماز پڑھے پھر عصر کی نماز ادا کرے، ہاں اگر وقت تنگ ہے اور صرف اتنی گنجائش ہے کہ ایک وقت کی فرض نماز پڑھ لے تو اس صورت میں اس وقت کی نماز کی ادا کو مقدم کرلے اور قضا بعد میں پڑھے۔

نمازی کے آگے جوتے رکھنا ☆ فجر کی سنتوں کی قضا

سوال: (الف) کیا نمازی اپنے جوتے سامنے رکھ کر نماز پڑھ سکتا ہے؟

(ب) کیا نماز فجر کی قضاء پڑھتے وقت سنتوں کی قضا بھی ضروری ہے؟

(سید محبوب شاہ، قائد آباد۔ کراچی)

جواب: (الف) حفاظت کے نقطۂ نظر سے نمازی اپنے جوتے سامنے رکھ کر نماز پڑھ سکتا ہے، اس طرح جوتے چوری ہونے کا خدشہ نہیں رہے گا اور نماز میں اس کی توجہ نہیں بٹے گی، خاص طور پر جبکہ جوتے نئے اور قیمتی ہوں، البتہ ادب کا تقاضا یہ ہے کہ مسجد میں داخل ہوتے وقت جوتے جھاڑ لینے چاہئیں تاکہ مسجد آلودہ نہ ہو۔ اگر دوسرے نمازیوں کی طبعی ناگواری کا اندیشہ ہو تو آج کل پلاسٹک کے شاپنگ بیگ عام ہیں، نمازی ساتھ لیتا آئے اور جوتے اس میں ڈال کر سامنے رکھ لے۔

(ب) فجر کی سنتوں کی تاکید دیگر اوقات کی مؤکدہ سنتوں کے مقابلے میں زیادہ ہے بلکہ فقہاء نے انہیں واجب سے قریب تر قرار دیا ہے، لہذا اگر فجر کی قضا اسی روز طلوع آفتاب کے ۲۰ منٹ بعد پڑھی جائے تو ساتھ سنتیں بھی پڑھ لیں، یہ افضل ہے، بعد میں ضرورت نہیں ہے۔

جماعت کھڑی ہو چکی اور فجر کی سنتیں

سوال: جب مسجد میں فجر کی جماعت کھڑی ہو چکی ہو تو مقتدی سنتیں پڑھے یا جماعت میں شامل ہو جائے؟ (محمد ناصر خان چشتی، ٹانک، صوبہ سرحد)

جواب: مسجد میں فجر کی جماعت کھڑی ہو چکی ہو اور اس دوران نمازی مسجد میں آئے تو اگر مسجد چھوٹی ہے اور امام کی قرأت کی آواز ساری مسجد میں سنائی دیتی ہے تو نمازی کو چاہئے کہ جماعت میں شامل ہو جائے کیونکہ قرأت کا سننا واجب ہے، اور سورج نکلنے کے ۲۰ منٹ بعد سنتیں پڑھ لے، لیکن اگر کسی وجہ سے اس دن نہ پڑھ سکے تو پھر ان کی قضا نہیں ہے، اور اگر مسجد بڑی ہے اور نمازی پیچھے دور کھڑا ہو تو اس تک امام کی قرأت کی آواز نہیں پہنچتی اور اگر اس کا خیال ہے کہ سنتیں پڑھ کر جماعت کو پالے گا تو سنتیں پڑھ کر جماعت میں شامل ہو، ورنہ جماعت میں شامل ہو جائے اور سنتیں سورج نکلنے کے ۲۰ منٹ بعد پڑھ لے۔

اوقات مکروہہ

سوال: وہ کون سے اوقات ہیں جن میں نفل پڑھنے کی ممانعت ہے، مگر فرض کی قضا پڑھ

سکتے ہیں؟ (ریاض حسین، رحیم یار خان)

جواب: مندرجہ ذیل اوقات میں نفل پڑھنے کی ممانعت ہے مگر فرض کی قضا پڑھ سکتے ہیں:

۱- طلوع فجر (صبح صادق) سے فجر کے فرض تک، سوائے فجر کی دو سنتوں کے نفل پڑھنا منع ہے۔

۲- فجر کے فرض کے بعد سے طلوع آفتاب تک۔

۳- نماز عصر کے بعد سے غروب آفتاب تک۔

۴- جب امام خطبۂ جمعہ کے لئے کھڑا ہو (اس وقت سنتوں کی بھی ممانعت ہے)

۵- عید کے دن نماز عید سے پہلے گھر پر اور عید گاہ میں دونوں جگہ۔ البتہ جس شخص کا اشراق کے نوافل پڑھنے کا معمول ہو، مسجد میں یا گھر پر، تو وہ پڑھ لے۔

۶- نماز عید کے بعد مسجد یا عید گاہ میں نوافل پڑھنا منع ہے، شاید اس ممانعت کی وجہ یہ ہو کہ لوگ نماز عید سے فراغت کے بعد منتشر ہوتے ہیں، آپس میں ملتے ہیں، مصافحہ یا معانقہ کرتے ہیں تو اگر کوئی وہاں نفل کی نیت باندھ کر کھڑا ہو جائے تو لوگوں کو دشواری ہوگی یا نماز کی بے حرمتی ہوگی۔ البتہ نماز عید سے واپس گھر آکر پڑھنے کی کوئی ممانعت نہیں ہے۔

۷- عرفات میں جب ظہر اور عصر کی نمازیں ملا کر پڑھی جائیں تو دونوں نمازوں کے درمیان نفل پڑھنا منع ہے۔

۸- مزدلفہ میں جب مغرب و عشاء کی نمازیں ملا کر پڑھی جائیں تو دونوں نمازوں کے درمیان نفل پڑھنا منع ہے۔

۹- جب فرض کا وقت تنگ ہو رہا ہو تو وقتی فرض کے سوا ہر نماز یہاں تک کہ فجر و ظہر کی سنتیں بھی مکروہ ہیں۔

رمضان میں فرض جماعت سے نہ پڑھے، وتر جماعت سے پڑھے یا نہیں؟

سوال: رمضان المبارک میں نماز عشاء میں بعض اوقات آدمی دیر سے پہنچتا ہے اور اس دوران میں فرض کی جماعت نکل جاتی ہے تو کیا ایسی صورت میں آدمی وتر باجماعت پڑھے یا تنہا پڑھے؟ (عمران، خداداد کالونی۔ کراچی)

جواب: نمازی کو چاہئے کہ مسجد میں پہنچنے کے بعد پہلے اپنی فرض نماز تنہا پڑھے اور پھر تراویح کی جماعت میں شریک ہوجائے اور وتر بھی جماعت کے ساتھ پڑھے کیونکہ جماعت کا اجر تنہا نماز کے مقابلے میں زیادہ ہے۔ جب فرض کی جماعت ترک ہوجانے کے باوجود تراویح باجماعت پڑھتے ہیں جبکہ تراویح کی نماز سنت مؤکدہ ہے اور اس کی جماعت کو فرض کی جماعت کے تابع نہیں سمجھتے تو وتر کی نماز جو واجب ہے اس کی جماعت فرض کی جماعت کے تابع کس طرح ہوگی؟۔

نماز میں بلا ضرورت امام کو لقمہ دینا اور امام کا لقمہ لینا

سوال: مغرب کی جماعت ہورہی تھی، تیسری رکعت میں قعدہ (التحیات) کے بعد امام صاحب دوسری رکعت سمجھ کر کھڑے ہوئے تو کسی نمازی نے لقمہ دیا اور امام صاحب واپس قعدہ میں لوٹ گئے اور سجدۂ سہو کر کے نماز ختم کردی، کیا یہ نماز درست ہے یا دہرانی پڑے گی؟ (محمد ممتاز کشمیری، گلشن اقبال۔ کراچی)

جواب: نماز میں امام سے سہو ہوجائے تو مقتدی کے امام کو غلطی پر متنبہ کرنے کو فقہی اصطلاح میں "تلقین" کہتے ہیں اور امام کی طرف سے مقتدی کی اصلاح قبول کرنے کو "تلقُّن" کہتے ہیں، اسے ہم اردو میں لقمہ دینے سے تعبیر کرتے ہیں۔ لقمہ دیتے وقت مقتدی "اللہ اکبر" یا "سبحان اللہ" کہتا ہے، یہ کلمات لفظاً تو تسبیح ربانی کے کلمات ہیں لیکن معنیً کلام ہے اور کلام مفسد نماز ہے، لیکن چونکہ نماز کی صحت کے ساتھ تکمیل شرعاً مطلوب ہے اور امام و مقتدی دونوں کا مفاد بھی اس سے وابستہ ہے اس لئے شرعاً خلاف قیاس لقمہ دینے اور لینے کی اجازت دی گئی ہے مگر صرف ضرورت کی حد تک، یعنی صرف اس حد تک کہ نماز فاسد نہ ہوجائے اور نماز کے اندر رہتے ہوئے اس کی تلافی ہوسکے، لہٰذا اگر ضرورت شرعی کے بغیر مقتدی نے لقمہ دیا تو اس کی نماز بھی فاسد ہوجائے گی۔ اب صورت مسئولہ میں چونکہ امام نے تیسری رکعت کا قعدہ کرلیا ہے اور نماز کے ارکان مکمل ہوگئے ہیں اس لئے امام کے کھڑے

ہونے سے نماز فاسد نہیں ہوگی۔ لہذا مقتدی اسے لقمہ نہ دیں، اور امام کی پیروی کریں، اگر امام چوتھی رکعت کا سجدہ کر لینے سے پہلے واپس آکر بیٹھ گیا تو وہ سجدۂ سہو کر کے نماز مکمل کر لے اور مقتدی بھی اس کی پیروی کریں، اور اگر امام نے (نماز مغرب میں) چوتھی رکعت کا سجدہ کر لیا تو وہ ایک رکعت اور ملالے تاکہ دو نفل ہو جائیں اور آخر میں سجدۂ سہو کر کے نماز مکمل کر لے۔ واضح رہے کہ یہ سجدۂ سہو سلام میں تاخیر کی وجہ سے ہوگا اگر امام صورت مسئولہ میں چوتھی رکعت کا رکوع کر کے سجدے میں جارہا ہے تو اس وقت مقتدی کا لقمہ دینا اور امام کا لقمہ لینا دونوں صحیح ہیں۔ فتاویٰ در مختار میں لکھا ہے کہ امام نماز کے قعدۂ اخیرہ (تشہد) کے بعد بھول کر کھڑا ہو جائے تو مقتدی امام کی پیروی کرنے کے بجائے بیٹھے بیٹھے امام کی واپسی کا انتظار کریں اگر وہ کھڑے کھڑے سلام پھیر دے یا واپس لوٹ آئے تو اس کی پیروی کریں اور اگر امام اگلی رکعت زائد کے سجدے میں چلا گیا تو مقتدی بیٹھے بیٹھے سلام کر لیں اور امام کا ساتھ نہ دیں۔ لیکن علامہ شبلی نے اس کی شرح میں ایک قول لکھا ہے کہ امام لوٹ کر آئے یا نہ آئے مقتدی ہر صورت میں اس کی پیروی کریں اور یہی قول زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے ہم نے اسی کے موافق لکھا ہے۔

فتاویٰ رضویہ جلد ۳، صفحہ نمبر ۴۰۲ پر ہے کہ آپ سے ایک مسئلہ دریافت کیا گیا کہ: ”اگر امام کو قعدۂ اولیٰ میں اپنی عادت سے دیر لگی اور مقتدی نے خیال اس امر کے کہ امام کو سہو ہوا ہوگا، تکبیر بآواز بلند بناء بر اطلاع امام کہی تو نماز مقتدی کی فاسد ہوئی یا نہیں؟“ اس کے جواب میں اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی نے لکھا: ”ہمارے امام رضی اللہ عنہ کے نزدیک اصل ان مسائل میں یہ ہے کہ بتانا اگرچہ لفظاً قرأت یا ذکر مثلاً تسبیح و تکبیر ہے اور یہ سب اجزاء و اذکار نماز سے ہیں مگر معنیً کلام ہے کہ اس کا حاصل امام سے خطاب کرنا اور سکھانا ہوتا ہے یعنی تو بھولا، اس کے بعد تجھے یہ کرنا چاہئے، پر ظاہر کہ اس سے یہی غرض مراد ہوتی ہے اور سامع کو بھی یہی معنیٰ مفہوم، تو اس کے کلام ہونے میں کیا شک رہا۔ اگرچہ

صورتاً قرآن یاد کر قرآن ہے ولہذا اگر نماز میں کسی یحییٰ نامی کو خطاب کی نیت سے یہ آیت کریمہ: "یٰیَحییٰ خُذِالکِتٰبَ بِقُوَّۃٍ" پڑھی، بالاتفاق نماز جاتی رہی، حالانکہ وہ حقیقتاً قرآن ہے۔

اس بناء پر قیاس یہ تھا کہ مطلقاً بتانا اگرچہ بر محل ہو مفسدِ نماز ہو کہ جب وہ بلحاظ معنی کلام ٹھہرا، تو بہر حال افساد نماز کرے گا، مگر حاجت اصلاحِ نماز کے وقت یا جہاں خاص نص وارد ہے ہمارے ائمہ نے اس قیاس کو ترک فرمایا اور حکم استحسان جس کے اعلیٰ وجوہ سے نص وضرورت ہے جواز کا حکم دیا، ولہذا صحیح یہ ہے کہ جب امام قرأت میں بھولے مقتدی کو مطلقاً بتانا روا اگرچہ قدر واجب پڑھ چکا، اگرچہ ایک سے دوسرے کی طرف انتقال ہی کیا ہو کہ صورت اولیٰ میں واجب ادا ہو چکا، مگر احتمال ہے کہ رکنے الجھنے کے سبب کوئی لفظ اس کی زبان سے ایسا نکل جائے جو مفسد نماز ہو لہذا مقتدی کو اپنی نماز درست رکھنے کیلئے بتانے کی حاجت ہے...... آگے کافی تفصیلی کلام کرنے کے بعد اعلیٰ حضرت لکھتے ہیں...... جب یہ اصل ممہد ہوئی، حکم صورت مسئولہ واضح ہو گیا، ظاہر ہے کہ جب امام کو قعدۂ اولیٰ میں دیر ہوئی اور مقتدی نے اس گمان سے یہ قعدۂ اخیرہ سمجھا ہے تنبیہ کی تو دو حال سے خالی نہیں یا تو واقع میں اس کا گمان غلط ہوگا۔ یعنی امام قعدۂ اولیٰ ہی سمجھا ہے اور دیر اس وجہ سے ہوئی کہ اس نے اس بار التحیات زیادہ ترتیل سے ادا کی، جب تو ظاہر ہے کہ مقتدی کا بتانا نہ صرف بے ضرورت بلکہ محض غلط واقع ہوا تو یقیناً کلام ٹھہرا اور مفسد نماز ہوا، "لقول الحلية ان ماوراء ذلك يعمل فيه بقضية القياس ولقوله المعدول به عن القياس لايقاس عليه ولقول الفتح يبقى ماوراء على المنع ولقول التبيين لايقاس عليه غيره وهذا واضح جدا"، یا اس کا گمان صحیح تھا غور کیجئے تو اس صورت میں بھی اس بتانے کا محض لغو بے حاجت واقع ہونا اور اصلاح نماز سے اصلاً تعلق نہ رکھنا ثابت کہ جب امام قعدۂ اولیٰ میں اتنی تاخیر کر چکا جس سے مقتدی اس کے سہو پر مطلع ہوا تو لاجرم یہ تاخیر بقدر کثیر ہوئی اور جو کچھ ہونا تھا یعنی ترک واجب ولزومِ سجدۂ سہو ہو چکا اب اس کے بتانے سے مرتفع نہیں ہو سکتا اور اس سے زیادہ کسی دوسرے خلل کا اندیشہ نہیں جس سے بچنے کو یہ فعل کیا جائے کہ غایت درجہ وہ بھول کر سلام پھیر دے گا پھر اس سے نماز تو نہیں جاتی وہی سہو کا سہو رہے گا، ہاں جس وقت سلام شروع

کرتا اس وقت حاجت متحقق ہوتی اور مقتدی کو بتانا چاہئے تھا کہ اب نہ بتانے میں خلل و فساد نماز کا اندیشہ ہے کہ یہ تو اپنے گمان میں نماز تمام کر چکا عجب نہیں کہ کلام وغیرہ کوئی قاطعِ نماز اس سے واقع ہو جائے، اس سے پہلے نہ خلل واقع کا ازالہ تھا نہ خلل آئندہ کا اندیشہ، تو سوا فضول و بے فائدہ کے کیا باقی رہا، لہذا اقتضائے نظر فقہی پر اس صورت میں بھی فساد نماز ہے، نظیر اس کی یہ ہے کہ جب امام قعدۂ اولی چھوڑ کر پورا کھڑا ہو جائے تو اب مقتدی بیٹھنے کا اشارہ نہ کرے ورنہ ہمارے امام کے مذہب پر مقتدی کی نماز جاتی رہے گی کہ پورا کھڑا ہونے کے بعد امام کو قعدۂ اولی کی طرف عود نا جائز تھا، تو اس کا بتانا محض بے فائدہ رہا اور اپنے اصلی حکم کی رو سے کلام ٹھہر کر مفسد نماز ہوا۔

اُلٹی شلوار اور قمیص پہن کر نماز پڑھنا

سوال: ایک شخص نماز کی نیت کر کے کھڑا ہو گیا اور نماز پڑھنا شروع کر دی، نماز کے دوران اس کی نظر پڑی تو اسے پتا چلا کہ اس نے شلوار یا قمیص اُلٹی پہن رکھی ہے تو اب وہ کیا کرے، نماز مکمل کرے یا نماز توڑ کر کپڑے صحیح کر کے پہنے اور پھر نماز پڑھے۔ پہلی صورت میں اگر اس نے نماز جاری رکھی اور مکمل کر لی تو کیا حکم ہے؟

(کامران قریشی، گلستان جوہر۔ کراچی)

جواب: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "اے بنی آدم! ہر نماز کے وقت اپنا لباس (زینت) پہن لیا کرو" (الاعراف: ۳۱) آیت مبارکہ میں اس جانب اشارہ ہے کہ نماز میں محض ستر عورت (ستر پوشی) کافی نہیں بلکہ انسان ایسا لباس پہن لے جو باوقار ہو اس میں زینت و جمال بھی ہو اور ستر پوشی بھی شرعی تقاضوں کے مطابق پوری ہو، لہذا الٹا لباس پہن کر نماز پڑھنا احترام نماز کے منافی ہے لیکن چونکہ ایسا سہواً ہو گیا اور یہ "مفسدات صلوٰۃ" میں سے نہیں ہے بلکہ وجوہ تحسین میں سے ہے۔ لہٰذا نماز ادا ہو گئی، اعادہ کی ضرورت نہیں۔

لباس کو ٹخنوں کے نیچے تک لٹکانے کا شرعی حکم

سوال: بعض اوقات لباس (تہبند، شلوار وغیرہ) ٹخنوں کے نیچے تک لٹکا ہوتا ہے اس کا شرعی حکم کیا ہے؟ بہت سے لوگوں کا لباس عام حالات میں تو لٹکا ہوتا ہے لیکن

جب نماز کیلئے کھڑے ہوتے ہیں تو شلوار کو اڑس لیتے ہیں یا پینٹ وغیرہ کے پائینچے کی تہیں بنا کر اونچا کر لیتے ہیں، اس کا شرعی حکم کیا ہے؟ بعض لوگ ہاف کٹ کی آستین پہنتے ہیں، کیا ایسی قمیص پہن کر نماز پڑھنا، جس کی آستین ہاف سائز کی ہو جائز ہے؟ (سید عمیر الحسن برنی، فیڈرل بی ایریا)

جواب: یہ سوال تفصیل طلب ہے، اس لئے پہلے چند احادیث مبارکہ ذکر کی جاتی ہیں، اس کے بعد چند اصطلاحات کا مفہوم اور فقہی مسائل درج کئے جائیں گے۔

۱- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”جس کے تہبند کا جو حصہ ٹخنوں کے نیچے ہوگا، وہ جہنمی ہوگا۔“ (صحیح بخاری)

۲- حضرت جابر بن سلیم رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”اپنا تہبند آدھی پنڈلیوں تک اونچا رکھو اور اگر ایسا نہ کرو تو ٹخنوں تک اونچا رکھو اور تہبند لٹکانے سے اجتناب کرو، کیونکہ یہ تکبر کی علامت ہے اور اللہ تعالیٰ نے تکبر کو پسند نہیں فرمایا۔“ (سنن ابو داؤد)

۳- حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ”جو شخص تکبر کی وجہ سے اپنا کپڑا گھسیٹ کر چلے گا، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس پر نظر رحمت نہیں فرمائے گا۔“ (یہ سن کر) حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کیا ”یا رسول اللہ ﷺ! اگر میں خیال نہ رکھوں (یعنی میری توجہ ہٹ جائے) تو میرے تہبند کی ایک جانب ڈھلک جاتی ہے۔“ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ”تم ان لوگوں میں سے نہیں جو تکبر کی وجہ سے ایسا کرتے ہیں۔“ (صحیح بخاری)

۴- حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم نبی ﷺ کے پاس بیٹھے تھے کہ سورج کو گہن لگ گیا، آپ جلدی سے اٹھے، اس حال میں کہ آپ کا تہبند زمین پر گھسٹ رہا تھا۔ یہاں تک کہ آپ مسجد میں آئے اور لوگ بھی پلٹ کر آگئے، پھر آپ نے دو رکعت نماز (کسوف) پڑھائی۔“ (صحیح بخاری)

اس موضوع پر احادیث تو بہت ہیں لیکن ہم نے اختصار کے پیش نظر چند احادیث پر

اکتفا کیا ہے۔ البتہ ایک اور حدیث، جس کا زیر بحث مسئلے سے تعلق ہے، کا ذکر ضروری ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "مجھے سات ہڈیوں پر سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور یہ کہ (نماز میں) نہ بالوں کو سنواروں اور نہ کپڑوں کو موڑوں۔" (صحیح مسلم)

مندرجہ بالا احادیث مبارکہ میں بعض جگہ ٹخنوں کے نیچے کپڑا لٹکانے کی مطلقاً ممانعت فرمائی گئی ہے اور بعض جگہ اسے تکبر، خیلاء اور بطرا کی قید کے ساتھ متقید کر کے منع فرمایا گیا ہے، اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا بعض اوقات بے خیالی میں جو کپڑا لٹک جاتا تھا رسول اللہ ﷺ نے اس کی رخصت ورعایت عطا فرمائی اور فرمایا "تم ان لوگوں میں سے نہیں جو تکبر کی وجہ سے ایسا کرتے ہیں۔" دونوں طرح کی احادیث میں تطبیق کرنے کے بعد محدثین کرام اور فقہاء عظام نے جو مسائل بیان کیے ہیں، وہ یہ ہیں:

۱- افضل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی متابعت کی جائے اور کپڑا ٹخنوں سے اوپر رکھا جائے، اس کے افضل و اولیٰ ہونے میں کسی کا اختلاف نہیں ہے۔

۲- اگر کوئی شخص تکبر کی بنا پر کپڑا ٹخنوں سے نیچے لٹکاتا ہے تو یہ مکروہ تحریمی ہے اور تکبر کی نیت سے ایسا کرنے والے کی نماز واجب الاعادہ ہے۔

۳- اگر کسی شخص کا کپڑا ٹخنوں سے کبھی کبھار یا عادتاً نیچے لٹک جاتا ہے لیکن وہ تکبر کی نیت سے ایسا نہیں کرتا تو یہ مکروہ تنزیہی ہے اور خلاف اولیٰ ہے۔ امام ہو یا منفرد یا مقتدی نماز صحیح ادا ہو جاتی ہے۔

۴- لباس کا ٹخنوں سے نیچے نہ لٹکنا، بنیادی طور پر آداب لباس میں سے ہے اور جو لوگ اس کا اہتمام کرتے ہیں، انہیں ہر وقت کرنا چاہیے، نہ کہ صرف نماز کی حد تک تاہم یہ امر مسلم ہے کہ جو عمل خارج نماز مکروہ یا ممنوع ہے۔ نماز میں بر طریق اولیٰ ممنوع ہے۔

۵- کپڑوں کو نیفے کی جانب سے سمیٹنا، جسے اردو میں اڑسنا کہتے ہیں یا پائنچے کی جانب سے موڑنا اور تہیں چڑھانا، "کفِ ثوب" کہلاتا ہے اور از روئے حدیث یہ ممنوع ہے۔ لہٰذا جو لوگ نماز سے پہلے "لٹکانے" کی ممانعت سے بچنے کیلئے کپڑا اڑس لیتے ہیں یا نیچے کی

جانب سے موڑ لیتے ہیں، جسے پائنچے چڑھانا کہتے ہیں، یہ شرعاً "کفِ ثوب" ہے اور ازروئے حدیث ممنوع ہے اور یہ ایک ممانعت سے بچنے کیلئے دوسری ممانعت کا ارتکاب کرنا ہے۔

۶- آستین موڑ کر یا چڑھا کر بھی، جسے فقہ میں تشمیر کہتے ہیں، نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہے، اگر یہ عمل نماز شروع کرنے سے پہلے کیا جائے، اور اگر یہ عمل نماز کے اندر کیا جائے تو فقہی اعتبار سے عمل کثیر کی تعریف میں آتا ہے اور اس سے نماز فاسد ہو جائے گی۔

۷- اگر کسی کی آستین ہاف کٹ ہے یعنی وضع اور ساخت کے اعتبار سے ہی ایسی بنی ہوئی ہے تو اس سے نماز بلا کراہت ادا ہو جائے گی۔

یہ مسئلہ "یعنی شلوار یا تہبند کا بہ نیت تکبر ٹخنوں سے نیچے لٹکانا مکروہ تحریمی ہے اور بلا نیت تکبر لٹک جانا یا لٹکانا مکروہ تنزیہی ہے جو خلاف اولیٰ کے درجے میں ہے، جن محدثین کرام اور فقہاء عظام نے بیان فرمایا ہے ان کے اسماء گرامی وحوالہ جات حسب ذیل ہے:

امام یحییٰ بن شرف نووی شافعی متوفی ۶۷۶ھ شرح صحیح مسلم ج ۲، ص ۱۹۵۔ (۲) حافظ ابن حجر عسقلانی متوفی ۸۵۲ھ فتح الباری ج ۱۰، ص ۲۶۳۔ (۳) علامہ موفق الدین ابن قدامہ حنبلی متوفی ۶۲۰ھ المغنی ج ۱، ص ۳۴۱۔ (۴) علامہ بدر الدین عینی حنفی متوفی ۸۵۵ھ عمدۃ القاری ج ۱، ص ۲۹۵۔ (۵) ملا علی قاری حنفی متوفی ۱۰۱۴ھ مرقات ج ۸، ص ۲۳۸۔ (۶) ملا نظام الدین متوفی ۱۱۶۱ھ فتاویٰ ہندیہ (عالمگیری) ج ۵، ص ۳۳۳۔ (۷) امام احمد رضا بریلوی متوفی ۱۳۴۰ھ، فتاویٰ رضویہ مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن ج ۷، ص ۳۸۸۔ (۸) مولانا محمد ادریس کاندھلوی دیوبندی، التعلیق الصبیح ج ۴، ص ۳۹۵۔ (۹) شیخ عبد الحق محدث دہلوی، متوفی ۱۰۵۲ھ لمعات ج ۴، ص ۱۷۵۔ (۱۰) نماز میں کپڑا اڑسنے یا کپڑا موڑنے کو بعض فقہاء نے مکروہ تحریمی کہا ہے اور بعض نے مکروہ تنزیہی۔ علامہ ابن عابدین شامی نے رد المحتار ج ۱، ص ۷۶۷ میں اسے مکروہ تحریمی قرار دیا ہے۔

ان مسائل کی تفصیلی بحث شرح صحیح مسلم ج ۶، مصنفہ علامہ غلام رسول سعیدی اور فتاویٰ رضویہ ج ۷ میں موجود ہے۔

رکوع میں بھول کر سجدے کی تسبیح پڑھنا

سوال: اگر نمازی اپنی نماز میں رکوع میں "سبحان ربی العظیم" کے بجائے "سبحان ربی الاعلیٰ" پڑھ لے یا سجدے میں "سبحان ربی الاعلیٰ" کے بجائے "سبحان ربی العظیم" پڑھ لے تو کیا اس سے سجدۂ سہو لازم آئے گا؟ (نور نبی، شاہ پور چاکر، سندھ)

جواب: رکوع و سجود کی تسبیحات سنت ہیں لہٰذا اگر یہ بھولے سے رہ جائیں یا رکوع میں بھول کر سجدے کی تسبیح اور سجدے میں بھول کر رکوع کی تسبیح پڑھ لی جائے تو نماز ادا ہو جاتی ہے اور اس سے سجدۂ سہو لازم نہیں ہوتا۔ البتہ اگر رکوع یا سجدے میں جھکا اور سر اٹھالیا اور ایک تسبیح کی مقدار بھی نہ رکا تو تعدیل رکن کا واجب فوت ہو جائے گا اور سجدۂ سہو لازم آئے گا۔

تکبیر بھول جائے تو؟

سوال: اگر امام نماز عید میں عید کی زائد تکبیریں بھول جائے؟ دعائے قنوت کی تکبیر بھول جائے یا رکوع و سجود کی تکبیرات بھول جائے تو کیا اس سے سجدۂ سہو لازم آئے گا؟ (پیر عبدالحلیم سرہندی، گلشن معمار۔ کراچی)

جواب: نماز میں رکوع و سجود کی جو تکبیرات ہیں، انہیں تکبیرات انتقال کہا جاتا ہے کیونکہ نمازی اللہ اکبر کہہ کر ایک رکن سے دوسرے رکن کی طرف منتقل ہوتا ہے، یہ تکبیرات سنت ہیں، اسی طرح رکوع سے اٹھتے ہوئے سمع اللّٰه لمن حمده، ربنا لك الحمد جو تسبیح پڑھی جاتی ہے، یہ بھی سنت ہے لہٰذا اگر تکبیرات انتقال یا رکوع سے اٹھنے کی تسبیح بھولے سے رہ جائے تو نماز ادا ہو جاتی ہے اور سجدۂ سہو لازم نہیں آتا۔ البتہ نماز عیدین کی زائد تکبیرات، نماز وتر میں دعائے قنوت شروع کرنے کیلئے تکبیر، جسے تکبیر قنوت کہتے ہیں، نماز عید کی دوسری رکعت میں رکوع کی تکبیر، یہ سب تکبیریں واجب ہیں اور اگر یہ بھولے سے رہ جائیں تو ان کی تلافی کیلئے سجدۂ سہو لازم ہوگا اور نہ کیا تو نماز واجب الاعادہ ہوگی۔ تاہم فقہاء

کرام نے لکھا ہے کہ اگر نماز عید میں مجمع کثیر ہو اور امام ان تکبیرات واجب میں سے کوئی ایک یا زائد بھول جائے اور سجدۂ سہو نہ کیا تو کثرت جماعت کی رعایت سے نماز صحیح ادا ہو جائے گی لیکن اگر سجدۂ سہو کر لیا جائے تو افضل ہے۔

نماز میں بھول، سجدۂ سہو

سوال: اگر نماز میں غلطی ہو جائے یا بھول سے کوئی بھی آیت دوبارہ پڑھی جائے تو کیا نماز دوبارہ ادا کرنی چاہئے یا سجدۂ سہو ادا کیا جائے؟ سجدۂ سہو کس طرح ادا کیا جاتا ہے؟

(شہناز شاہد۔ کراچی)

جواب: نماز میں واجب چھوٹ جانے، فرض یا واجب میں تین تسبیحات (سبحان ربی الاعلیٰ) کے برابر تاخیر ہونے سے سجدۂ سہو لازم آتا ہے۔ اگر سجدۂ سہو کر دیا جائے تو اس غلطی کی تلافی ہو جاتی ہے۔ ایک نماز میں ایک سے زیادہ واجب ترک ہو جائیں، تب بھی ایک ہی "سجدۂ سہو" کافی ہے۔ "سجدۂ سہو" کا طریقہ یہ ہے کہ آخری التحیات (تشہد) پڑھ کر دائیں جانب سلام پھیریں اور پھر دو سجدے کریں اور اس کے بعد التحیات، درود شریف اور دعاء پڑھ کر سلام پھیر لیں نماز مکمل ہو جائے گی۔ اگر سجدۂ سہو واجب تھا مگر نماز کے اندر ادا نہیں ہوا تو پھر پوری نماز از سر نو پڑھنی چاہئے۔

نماز وتر میں دعائے قنوت بھول کر رکوع میں چلا گیا تو کیا کرے؟

سوال: کوئی شخص وتر کی نماز پڑھ رہا ہے، تیسری رکعت میں دعاء قنوت پڑھے بغیر بھول کر رکوع میں چلا گیا تو کیا کرے، پلٹ کر واپس آئے یا نماز جاری رکھے؟

(عبداللہ، لانڈھی۔ کراچی)

جواب: اگر کوئی شخص وتر کی نماز پڑھ رہا ہے اور تیسری رکعت میں بھول کر رکوع میں چلا گیا تو پلٹ کر واپس نہ آئے بلکہ نماز کو جاری رکھے اور آخر میں سجدۂ سہو کر لے، سجدۂ سہو سے اس کی تلافی ہو جائے گی۔ اگر رکوع کر لیا اور پھر یاد آنے پر لوٹ کر کھڑا ہو گیا اور دعاء قنوت پڑھ لی تو رکوع کا اعادہ نہ کرے اور سجدۂ سہو کرے۔

کیا سجدۂ سہو کی ضرورت ہے؟

سوال: اگر نماز کے دوران نمازی سے بھول ہو جائے اور اس سے مندرجہ ذیل امور میں سے کوئی ایک ادا کرنے سے رہ جائے تو آیا نماز ادا ہو جائے گی یا نہیں؟ ان کی تلافی کے لئے سجدۂ سہو کی ضرورت ہو گی یا نہیں؟

ا- ثناء (سبحانك اللهم) تعوذ، تسمیہ پڑھنا بھول جائے۔

ب- رکوع و سجود کی تکبیرات انتقال کہنا بھول جائے۔

ج- رکوع میں سجود کی تسبیح (یعنی سبحان ربی العظیم اور سبحان ربی الاعلیٰ) پڑھنا بھول جائے یا رکوع کی تسبیح سجدے میں اور سجدے کی تسبیح رکوع میں پڑھ لی ہو۔

د- آمین کہنا بھول جائے۔

ہ- رکوع سے اٹھتے وقت "سمع الله لمن حمده" کہنا بھول جائے یا اس کی جگہ اللہ اکبر کہہ دیا ہو۔

و- "التحیات" کے بعد "درود شریف" اور "دعاء" پڑھنا بھول جائے۔

(عبدالمتین قریشی، خداداد کالونی)

جواب: یہ تمام امور نماز میں "سنت" ہیں اور اگر ان میں سے کوئی ایک امر یا ایک سے زائد امور سہو (بھول) کے نتیجے میں نمازی سے چھوٹ جائیں تو نماز صحیح طور پر ادا ہو جائے گی اور ان کی تلافی کیلئے "سجدۂ سہو" کی ضرورت نہیں ہو گی، کیونکہ "سجدۂ سہو" فرض رکن کی ادائیگی میں تاخیر اور واجب رکن کے ترک ہو جانے سے لازم آتا ہے۔ تاہم اگر کسی نے دانستہ کسی سنت کو ترک کیا تو گناہ گار ہو گا۔

عیدین میں سجدۂ سہو

سوال: نماز عیدین میں ترک واجب پر سجدۂ سہو کیا جا سکتا ہے؟

(ضیاء اللہ خان ضیاء، نوکوٹ)

جواب: نماز جمعہ اور نماز عیدین میں اگر کوئی ایسا سہو ہو جائے جس سے "سجدۂ سہو" لازم

آتا ہے تو "سجدۂ سہو" ادا کیا جاسکتا ہے البتہ ہمارے فقہاء کرام نے فرمایا ہے کہ اگر مجمع کثیر ہو اور اس کی رعایت سے سجدۂ سہو نہ کیا جائے تو بھی نماز ادا ہو جائے گی۔

سجدۂ تلاوت کا طریقہ

سوال: سجدۂ تلاوت کا طریقہ کیا ہے؟

جواب: قبلہ رخ ہو کر اللہ اکبر کہہ کر سجدے میں چلے جائیں اور تسبیحات سجدہ پڑھ کر اللہ اکبر کہہ کر سجدے سے اٹھ جائیں، بس سجدۂ تلاوت مکمل ہو گیا، سلام پھیرنے یا نماز کی طرح باقاعدہ نیت باندھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بس مقام سجدہ پاک ہونا چاہئے۔ کھڑے ہو کر سجدے میں جائیں تو افضل ہے اور اگر بیٹھے بیٹھے سجدہ کیا تو بھی ادا ہو جائے گا۔

فجر اور عصر کی نماز کے بعد سجدۂ تلاوت کا حکم

سوال: بعض اوقات نماز فجر اور عصر کے بعد لوگ تلاوت کرنے بیٹھ جاتے ہیں۔ ایسی صورت میں اگر آیت سجدہ آجائے تو سجدۂ تلاوت کر سکتے ہیں یا نہیں؟

(نور نبی، شاہ پور چاکرو، سندھ)

جواب: نماز فجر اور نماز عصر کے بعد سجدۂ تلاوت کر سکتے ہیں اور قضا نماز بھی پڑھ سکتے ہیں۔ صرف تین اوقات ایسے ہیں جن میں ہر قسم کی نماز اور سجدہ منع یعنی مکروہ تحریمی ہے۔ (۱) طلوع آفتاب کے بعد ۲۰ منٹ تک (۲) زوال کا وقت (۳) غروب آفتاب سے پہلے تقریباً ۲۰ منٹ کا وقت، البتہ اگر اس دن کی عصر کی نماز کسی کوتاہی یا عذر کے سبب نہیں پڑھی تو پڑھ لے، قضا کی بہ نسبت کراہت کے ساتھ ادا بہتر ہے۔

نوٹ: (۱) ان تینوں اوقات میں اگر اتفاقاً جنازہ آجائے تو نماز جنازہ پڑھ سکتے ہیں۔ البتہ اگر جنازہ پہلے سے موجود ہو تو تاخیر کر کے ان مکروہ اوقات میں پڑھنا منع ہے۔
(۲) صبح صادق، یعنی جب روزہ بند ہوتا ہے، سے نماز فجر تک فجر کی دو سنتوں کے علاوہ نفل پڑھنا منع ہے اور اسی طرح فرائض فجر کے بعد سے طلوع آفتاب تک نفل

پڑھنا منع ہے اور فرض عصر کے بعد سے غروب آفتاب تک نفل پڑھنا منع ہے لیکن ان تینوں اوقات میں قضا نماز بھی پڑھ سکتے ہیں اور سجدۂ تلاوت بھی کر سکتے ہیں۔ البتہ غروبِ آفتاب سے قبل کے آخری بیس منٹ میں قضاء نماز پڑھنا اور سجدۂ تلاوت کرنا بھی منع ہے، لیکن اس دن کی عصر کی نماز رہ گئی ہو تو وہ پڑھ لینی چاہئیے۔

عورت کا باپردہ مسجد میں جاکر مسئلہ پوچھنا، سجدۂ تلاوت

سوال: (ا) کیا عورت باپردہ ہو کر کوئی شرعی مسئلہ پوچھنے کیلئے مسجد میں جا سکتی ہے جبکہ گھر میں کوئی دینی مسائل نہ جانتا ہو؟

(ب) نماز میں آیت سجدہ کی تلاوت کی جائے تو سجدہ کس طرح ادا ہوگا؟

(ن-خ، کراچی)

جواب: (ا) صحابیات نبی کریم ﷺ سے دینی مسائل پوچھنے آتی تھیں لہٰذا خواتین باپردہ ہو کر کسی عالم دین سے شرعی مسئلہ معلوم کرنے کیلئے جا سکتی ہیں، ان کیلئے ایک صورت یہ بھی ہے کہ گھر کے کسی مرد کے ذریعے مسئلہ معلوم کرالیں، تحریری طور پر بھی معلوم کر سکتی ہیں۔ آج کل ٹیلیفون کا آسان ذریعہ بھی ہے، ویسے مسلمانوں کے گھر میں دینی مسائل کی آسان اور عام فہم کتابیں بھی ہونی چاہئیں، تاہم پیچیدہ مسائل کیلئے عالم سے رجوع ضروری ہے۔

(ب) نماز میں آیت سجدۂ تلاوت کی جائے تو آیت کے اختتام پر اللہ اکبر کہہ کر سجدے میں چلا جائے اور سجدے کی تسبیحات پڑھ کر اللہ اکبر کہہ کر کھڑا ہو جائے اور مزید چند آیات پڑھ کر رکوع اور حسب معمول نماز مکمل کرے۔ اگر آیت سجدہ پڑھتے ہی اللہ اکبر کہہ کر رکوع میں چلا جائے اور رکوع ہی میں سجدۂ تلاوت کی بھی نیت کرے تو اس صورت میں بھی سجدۂ تلاوت ادا ہو جائے گا۔ اگر بروقت سجدۂ تلاوت کرنا بھول گیا، رکوع میں بھی نیت نہ کی، لیکن نماز کے دوران ہی یاد آگیا یا سلام پھیرتے ہی فوراً یاد آگیا اور کوئی ایسا عمل ابھی نہیں کیا جو مفسد صلوٰۃ ہے تو فوراً سجدۂ تلاوت کرے اور سجدۂ سہو بھی کرے۔ نماز کے بعد یاد آیا تو اب بیرون نماز

اس کی قضاء نہیں ہے، نماز کے اندر سجدۂ تلاوت قصداً چھوڑا تو گناہ گار ہے، اللہ تعالیٰ سے توبہ کرے۔

کیسٹس پر تلاوت سننا اور سجدۂ تلاوت

سوال: کوئی شخص آڈیو یا ویڈیو کیسٹس پر تلاوت سنتا ہے اور آیت سجدہ آجاتی ہے، کیا سننے والے پر سجدۂ تلاوت واجب ہوگا، اسی طرح ان کیسٹس میں دینی تقاریر یا نعتیں بھری ہوتی ہیں جن میں رسول اللہ ﷺ کا نام نامی بار بار آتا ہے، کیا سننے والے پر درود شریف پڑھنا واجب ہے؟ (حافظ ہدایت واجد حسین، دستگیر کالونی۔ کراچی)

جواب: آڈیو / ویڈیو کیسٹس پر ریکارڈنگ کی صورت میں دوران تلاوت آیت سجدہ آجائے تو کیسٹ سننے والے پر سجدۂ تلاوت واجب نہیں ہے، اسی طرح کیسٹ سنتے ہوئے سید المرسلین ﷺ کا نام نامی اسم گرامی آجائے تو درود پاک پڑھنا واجب نہیں ہے۔ البتہ اگر کوئی صاحب ذوق خوش نصیب آیت سجدہ سن کر سجدۂ تلاوت کرلیتا ہے یا رسول اللہ ﷺ کا نام نامی اسم گرامی سن کر درود پاک پڑھ لیتا ہے تو وہ یقیناً عند اللہ ماجور ہوگا۔

سجدۂ شکر کی شرعی حیثیت

سوال: کیا سجدۂ شکر شرعاً جائز ہے؟ اس کا طریقہ کیا ہے؟

(عنایت اللہ، اورنگی ٹاؤن۔ کراچی)

جواب: متعدد مواقع پر رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام سے "سجدۂ شکر" ادا کرنا ثابت ہے، ابوداؤد اور ابن ماجہ میں حدیث شریف ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو جب کسی اچھی بات کی خوشخبری سنائی جاتی تو آپ اس پر رب ذوالجلال کا شکر ادا کرنے کیلئے سجدے میں گر جاتے۔ ایک موقع پر ایک لنجے اور ایک ناقص الخلقت شخص کے پاس سے آپ کا گزر ہوا تو آپ سواری سے اترے اور سجدۂ شکر ادا کیا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس عیب، معذوری اور مصیبت سے محفوظ رکھا ہے۔

جب نبی کریم ﷺ کو دشمن اسلام ابو جہل کے قتل کی خبر دی گئی تو ایک روایت میں ہے کہ آپ نے نماز شکرانہ ادا کی اور ایک روایت میں ہے کہ آپ نے پانچ بار سجدۂ شکر ادا کیا، حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو جب یہ خبر ملی کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کریم ﷺ کو ان سے نکاح کا حکم دیا ہے تو انہوں نے اس نعمت پر سجدۂ شکر ادا کیا۔ تاہم سجدۂ شکرنہ فرض ہے، نہ واجب اور نہ سنت، بلکہ یہ مستحب ہے، اس کا طریقہ یہ ہے کہ باوضو ہو کر اللہ اکبر کہہ کر سجدے میں جائے اور حسب توفیق تسبیح پڑھ کر اللہ اکبر کہتے ہوئے سجدے سے اٹھ جائے۔ کسی مسرت کے موقع پر یا دفع بلا کے موقع پر نماز شکرانہ ادا کرنی ہو تو دو نوافل یا حسب توفیق زیادہ نوافل تنہا ادا کرنے چاہئیں، نماز شکرانہ کی جماعت نہیں۔

ترجمۂ قرآن پڑھنے سے تلاوت کا ثواب

سوال: بدقسمتی سے کسی شخص کو ناظرہ قرآن پڑھنا نہیں آتا تو اگر وہ ترجمہ قرآن (اردو زبان میں) مسلسل تلاوت کی نیت سے پڑھے تو کیا اسے تلاوت قرآن مجید کا اجر و ثواب ملے گا؟ بعض لوگ قرآن مجید کھول کر سطروں پر انگلی پھیرتے ہوئے صرف "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" پڑھتے رہتے ہیں اور اس طرح صفحے پلٹتے پلٹتے مکمل کر لیتے ہیں اور اسے ختم بسم اللہ کہتے ہیں، کیا "ختم بسم اللہ" کی شریعت میں کوئی اصل ہے؟ (بلال خان، گارڈن ویسٹ۔ کراچی)

جواب: قرآن مجید کی بابت اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

إِنَّآ أَنزَلْنَٰهُ قُرْءَٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ۝ "ہم نے اسے واضح عربی زبان میں نازل کیا ہے تاکہ تم سمجھو۔" (یوسف: ۲)

قرآن مجید کی تلاوت بزبان عربی یہ الگ اور مستقل عبادت ہے، اس کے معنی کو سمجھنا اور اس پر عمل کرنا یہ بلاشبہ بہت بڑی سعادت بلکہ نزول قرآن کا مدعاء و مقصود ہے۔ ترجمۂ قرآن کو مطالب قرآن سمجھنے کیلئے پڑھنا، اجر و سعادت کی بات ہے لیکن ترجمۂ قرآن، کلام اللہ نہیں ہے۔ اس لئے اسے اردو، انگریزی یا کسی اور زبان میں بہ نیت تلاوت پڑھنے سے تلاوت

قرآن مجید کا ثواب نہیں ملے گا۔ ترجمۂ قرآن بندے کا کلام ہے، اللہ تعالیٰ کا نہیں۔ رسول اللہ ﷺ پر پہلی وحی قرآنی چالیس سال کی عمر میں نازل ہوئی اور ۲۳ سال کی مدت میں اس کی تکمیل ہوئی۔ لہٰذا اگر کسی کی عمر چالیس سال یا اس سے بھی زائد ہے تو اس عمر میں قرآن مجید کو پڑھنا سنت رسول ﷺ ہے۔ صحابہ کرام مختلف عمروں میں مشرف بہ اسلام ہوئے اور انہوں نے قرآن اور دین اسلام کی تعلیم حاصل کی، لہٰذا آپ عمر کے کسی بھی حصے میں ہوں، بلا تاخیر قرآن کی تعلیم و تعلم کا سلسلہ شروع کر دیں، دنیا کے کسی بھی مذہب یا نظام حیات میں حصول علم کیلئے عمر کی قید نہیں ہے۔ اس لئے جہل دائمی اور ابدی عذر نہیں۔ صورت مذکورہ میں "ختم بسم اللہ" کی شریعت میں کوئی اصل نہیں ہے۔ تاہم جتنی بار کوئی "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" پڑھے گا، چونکہ یہ اسمائے الٰہیہ پر مشتمل ہے، اس لئے اسے اس کا اجر و ثواب ضرور ملے گا۔

نماز کی قصر

سوال: نماز قصر سے کیا مراد ہے؟ قصر پڑھنے کیلئے کم از کم مسافت کتنی ہے؟ قصر کہاں سے شروع کرے اور کہاں ختم کرے اور قصر کب تک پڑھے؟

(سید اکرم شاہ، اوگی۔ مانسہرہ)

جواب: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَإِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْأَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَقْصُرُوا مِنَ الصَّلٰوةِ ﴿﴾

"اور جب تم زمین میں سفر کیلئے نکلو تو تمہارے لئے اس بات میں کوئی حرج نہیں کہ تم قصر نماز پڑھو" (النساء: ۱۰۱)

قصر

اللہ تعالیٰ نے حالت سفر میں فرض نماز میں اپنے بندوں کیلئے تخفیف فرمائی ہے یعنی یہ کہ ظہر، عصر اور عشاء کی چار رکعات کے بجائے دو پڑھی جائیں۔ فجر و مغرب اور وتر کی رکعات بغیر تخفیف کے پڑھی جائیں گی کیونکہ رسول اللہ ﷺ سے اسی طرح منقول ہے۔ مسافر اگر حالتِ سفر میں ہے یعنی دورانِ سفر مسافتِ سفر طے کر رہا ہے تو وہ فرائض کو قصر کے ساتھ پڑھے اور سنتیں چھوڑ دے۔ اور اگر ہے تو وہ مسافر لیکن کسی منزل پر چودہ دن یا

اس سے کم مدت کے لئے قیام کرلیا ہے تو وہ فرض تو قصر کے ساتھ پڑھے اور سنت مؤکدہ پوری پڑھے۔ البتہ فجر کی سنتیں ہر حال میں پڑھنی ضروری ہیں کیونکہ یہ قریب بہ وجوب ہیں، یہی وجہ ہے کہ باقی اوقات کی سننِ مؤکدہ تو بلاعذر بھی بیٹھ کر پڑھی جاسکتی ہیں، اگرچہ کھڑے ہو کر پڑھنی افضل ہیں، لیکن فجر کی سنتیں بلاعذر بیٹھ کر پڑھنی جائز نہیں ہیں۔ فرض نمازوں میں اس اختصار کو قرآن وسنت اور فقہ اسلامی کی اصطلاح میں "قصر" کہا جاتا ہے۔ یہ "قصر" اللہ تعالیٰ کی جانب سے اپنے بندوں کیلئے ایک طرح کی رخصت ورعایت ہے جسے حدیث پاک میں "تصدق" سے تعبیر کیا گیا ہے، اس سے استفادہ "شکرِ نعمت" اور اسے نظر انداز کرنا "کفرانِ نعمت" کی ایک صورت ہے لہٰذا حالتِ سفر میں قصر واجب ہے۔

مسافتِ قصر

کم از کم "مسافتِ سفر" جس کا سفر شروع کرنے سے "قصر" واجب ہو جاتی ہے وہ مقدارِ سفر ہے جو انسان اوسط رفتار سے یا اونٹ کی متوسط رفتار سے اپنی طبعی ضروریات ولوازمات (اس سے مراد مناسب آرام، کھانے اور دیگر حاجات کی تکمیل ہے) اور شرعی فرائض (یعنی نمازوں) کی ادائیگی کے ساتھ تین دن میں طے کرے۔ اس میں آرام کے وقفے کے ساتھ دن کا سفر اور رات کا قیام بھی شامل ہے۔ جدید پیمانے کے مطابق ۹۸.۷۳۴ کلومیٹر کی مسافت یا اس سے زائد کا سفر کرنے کا ارادہ ہو تو قصر پڑھنا چاہیے۔

آغازِ قصر

فقہاء نے لکھا ہے کہ جب اپنی بستی کی شہری حدود سے نکل جائے تو قصر شروع کردے اور سفر سے واپسی پر جب حدودِ شہر میں داخل ہو جائے تو پوری نماز پڑھے۔

رہا یہ مسئلہ کہ حدودِ شہر کہاں ختم ہوتی ہیں تو فقہائے کرام نے شہر سے باہر قبرستان کو اس کی حد قرار دیا ہے، جیسا کہ اب بھی عموماً دیہات میں ہوتا ہے۔ تاہم بڑے شہروں اور قصبوں میں (جہاں بلدیاتی ادارے قائم ہیں، جیسے کارپوریشن، میونسپل کمیٹی وغیرہ) باقاعدہ حدودِ شہر کی نشاندہی کا اہتمام کیا جاتا ہے۔

قصر کب تک پڑھے؟

احناف کے نزدیک دورانِ سفر اگر کسی مقام پر پندرہ دن یا اس سے زیادہ ٹھہرنے کا ارادہ ہو

تو وہاں پوری نماز پڑھے، ایسے مقام کو "وطنِ اقامت" کہتے ہیں۔ اگر پندرہ دن سے کم ٹھہرنے کا ارادہ ہو تو قصر پڑھے، خواہ خلافِ ارادہ قیام پندرہ دن سے طویل ہی کیوں نہ ہو جائے۔

مسلسل تین جمعوں کی نماز چھوڑنے کا حکم

سوال: اگر کوئی مسلمان متواتر تین جمعوں کی نماز جان بوجھ کر چھوڑ دے تو کیا وہ اسلام سے خارج ہو جائے گا؟

جواب: جامع ترمذی، سنن ابی داؤد، سنن نسائی، ابن ماجہ اور دیگر مستند کتب احادیث میں ارشاد رسول ﷺ ہے: "جو شخص (بلا عذر شرعی) محض سستی اور کاہلی سے تین جمعوں کی نماز چھوڑے گا، (اس گناہ کی پاداش میں) اللہ تعالیٰ اس کے دل پر مہر لگا دے گا۔" تارک جمعہ کیلئے یہ ایک سخت وعید اور تنبیہ ہے۔ صحیح مسلم میں عبداللہ بن عمر اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنھما سے روایت ہے کہ ہم نے سنا، رسول اللہ ﷺ برسرِ منبر ارشاد فرما رہے تھے، "لوگ نماز جمعہ چھوڑنے کی عادت سے باز آجائیں، ورنہ سزا کے طور پر اللہ تعالیٰ ان کے دلوں پر مہر لگا دے گا، پھر وہ غافلوں میں سے ہو جائیں گے۔" ان احادیث کی روشنی میں یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ بلا عذر تارک جمعہ اسلام سے خارج ہو جائے گا، البتہ یہ امر بالکل واضح ہے کہ اگر اس نے توبہ نہ کی اور اپنی اس روش کو نہ بدلا تو خدانخواستہ وہ قبولِ خیر اور توفیقِ اعمالِ صالحہ کی سعادت سے محروم ہو جائے گا اور یہ اس کی نافرمانی کی سزا کے طور پر ہو گا۔ اللہ جل شانہ، سب اہل ایمان کو ایسے انجام سے محفوظ فرمائے۔

فیکٹری، کارخانے میں نمازِ جمعہ

سوال: حکومت کی جانب سے جمعۃ المبارک کی چھٹی ختم ہونے کی وجہ سے بعض اداروں اور اسکولوں میں جہاں مساجد نہیں ہوتیں لوگوں کو دفتر سے باہر جانا پڑتا ہے اور بڑے مسائل پیش آتے ہیں، ان حالات میں فیکٹری، کارخانے یا اسکول کی انتظامیہ نماز جمعہ کیلئے اسکول یا فیکٹری کے اندر ہی انتظام کرتی ہے۔ کیا فیکٹری یا اسکول میں نماز جمعہ ہو جائے گی؟

(قاری محمد صدیق، خطیب مسجد خلفائے راشدین۔ گلشن اقبال)

جواب : اصولی طور پر شرائط جمعہ میں سے ایک شرط "اذنِ عام" ہے اور اس کی تحقیق کیلئے اتنا ہی کافی ہے کہ جامع مسجد کے دروازے سب آنے والوں کیلئے کھلے ہوں۔ علامہ ابن عابدین شامی نے لکھا ہے کہ اگر دشمن کے خوف سے قلعے کا دروازہ بند ہو، جیسے قدیم زمانے میں شہروں کے اردگرد حفاظت کی غرض سے شہر پناہ، قلعے اور فصیلیں ہوا کرتی تھیں، لیکن قلعے کے اندر تمام رہنے والوں کیلئے جامع مسجد کے دروازے کھلے ہوں تو وہاں جمعہ پڑھانا جائز ہے۔

آج کل سیکورٹی کے مسائل نہایت شدید ہیں۔ بڑے بڑے کارخانوں اور اداروں میں غیر متعلقہ لوگوں کا بلا اجازت داخلہ بند ہوتا ہے۔ ایوانِ صدر، ایوانِ وزیر اعظم، گورنر ہاؤسز، کے پی ٹی، پاکستان اسٹیل، سیکورٹی پرنٹنگ پریس اور متعدد سول اور دفاعی ادارے اس کی نمایاں مثالیں ہیں اور اب تو تقریباً تمام کارخانوں اور تعلیمی اداروں حتیٰ کہ جامعات میں بھی غیر متعلقہ لوگوں کا داخلہ بند ہے۔ لہٰذا اگر ان اداروں کے اندر نماز جمعہ کا اہتمام کیا جائے تو جائز ہے کیونکہ ان کے اوقات کار میں اتنا وقفہ نہیں ہوتا کہ لوگ باہر کھلی مساجد میں جا کر نماز جمعہ پڑھیں اور واپس آئیں اور اس میں بہت سی انتظامی دشواریاں ہوتی ہیں۔ کمپنی، کارخانے یا تعلیمی ادارے میں باقاعدہ مسجد ہے تو مسجد اور جماعت دونوں کا ثواب ملے گا اور اگر باقاعدہ مسجد نہیں ہے بلکہ محض کوئی جگہ یا کمرہ نماز کیلئے مختص ہے تو نماز ادا ہو جائے گی۔ جماعت کا بھی ثواب ملے گا لیکن مسجد کا ثواب نہیں ملے گا۔

کیا نماز جمعہ کی قضاء ہے؟

سوال : کیا نماز جمعہ جو کہ فرض ہے اگر کسی وجہ سے فوت ہو جائے تو کیا اس کی قضاء پڑھی جائے گی؟ (محمد سہیل، نارتھ کراچی)

جواب : نماز جمعہ فرض عین ہے اس کی فرضیت کا حکم "سورۃ الجمعہ" کی آیت ۹ میں نازل ہوا ہے۔ نماز جمعہ کے ترک پر احادیث مبارکہ میں بڑی وعید آئی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: "جس شخص نے غیر اہم اور معمولی بات سمجھتے ہوئے تین جمعے ترک کر دیئے اللہ تعالیٰ اس

کے دل پر مہر لگادے گا (ابو داؤد، ترمذی، نسائی)" تاہم اگر کسی شخص کی نماز جمعہ عذر کی بناء پر (مثلاً سفر، بیماری یا معذوری) یا بد قسمتی سے بلا عذر فوت ہو گئی ہے تو اس پر جمعے کی قضا نہیں ہے بلکہ وہ ظہر کی نماز پڑھے۔

کیا شوہر اپنی بیوی کی میت کو غسل دے سکتا ہے؟

سوال: ایک اخبار میں ایک مفتی صاحب کا یہ فتویٰ شائع ہوا ہے کہ شوہر اپنی بیوی کی میت کو کوئی محرم نہ ہونے کی صورت میں غسل دے سکتا ہے کیا از روئے فقہ حنفی یہ مسئلہ درست ہے؟ اور عوام میں یہ بات مشہور ہے کہ حضرت علی نے حضرت فاطمہ کو غسل دیا تھا، کیا صحیح روایت سے یہ بات ثابت ہے؟

(کامران قریشی، خداداد کالونی۔ کراچی)

جواب: اگر کسی خاتون کا انتقال ہو جائے اور کوئی عورت اسے غسل دینے کیلئے دستیاب نہ ہو تو اس کا محرم اسے تیمم کرائے، یعنی بامر مجبوری غسل ساقط ہو جائے گا۔ واضح رہے محرم کسی عورت کے اس مرد قرابت دار کو کہتے ہیں جس کے ساتھ از روئے شرع اس کا نکاح دائمی طور پر حرام ہو جیسے، باپ، بیٹا، دادا، پوتا، چچا، ماموں، بھتیجا، بھانجا وغیرہ۔ اور اسی طرح وہ مرد قرابت دار جو رضاعت اور مصاہرت کے رشتے سے محرم بنتے ہیں۔ اگر مرحومہ عورت کا کوئی محرم دستیاب نہ ہو تو اجنبی شخص ہاتھ پر کپڑا لپیٹ کر اسے تیمم کرائے اور اپنی نگاہیں نیچی رکھے۔ مذکورہ بالا مجبوری کی صورت میں شوہر بھی اپنی بیوی کی میت کو تیمم کرا سکتا ہے، البتہ اس پر اجنبی شخص کی طرح نگاہیں نیچی رکھنے کی پابندی نہیں ہے (فتاویٰ عالمگیری ج ۱، ص ۱۶۰، فتاویٰ شامی ج ۱، ص ۵۷۵)۔ محترم مفتی صاحب نے اخبار مذکور میں یہ مسئلہ غلط لکھا ہے "کہ شوہر اپنی مرحومہ بیوی کی میت کو غسل بھی دے سکتا ہے اگر محرم موجود نہ ہو۔" غالباً مفتی صاحب نے توجہ نہیں فرمائی یا ان سے تسامح ہوا ہے۔ امید ہے کہ وہ اپنے بیان کردہ مسئلے پر نظر ثانی فرما کر اسی اخبار میں تصحیح نامہ شائع کرائیں گے تاکہ لوگوں کو صحیح مسئلہ معلوم ہو جائے۔ اگر بیوی زندگی کے

آخری سانس تک شوہر کے نکاح صحیح میں تھی یا شوہر نے طلاق رجعی دے دی تھی لیکن عدت کے اندر بیوی کا انتقال ہو گیا تو مسئلہ وہی ہے جو ہم نے سطور بالا میں درج کیا ہے اور اگر عدت گزرنے کے بعد بیوی کا انتقال ہوا یا شوہر نے اسے طلاق بائن یا طلاق مغلظہ دے رکھی تھی تو عدت کے اندر انتقال ہونے کی صورت میں بھی شوہر کی حیثیت اجنبی کی سی ہے اور اس کا مسئلہ بھی ہم اوپر درج کر چکے ہیں۔ شوہر تمام صورتوں میں بیوی کی میت کو کندھا دے سکتا ہے کیونکہ اجنبی مردوں پر بھی کسی عورت کی میت کو کندھا دینے کی کوئی ممانعت نہیں ہے۔ البتہ اسے اپنی بیوی کی میت کا چہرہ دیکھنے کی اجازت صرف دو صورتوں میں ہے، ایک اس صورت میں کہ بوقت وفات اس کے نکاح میں تھی اور دوسری اس صورت میں کہ بصورت طلاق رجعی عدت کے اندر اس کا انتقال ہوا ہو۔ بعض لوگوں میں جو مشہور ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو غسل دیا تھا۔ اس کے بارے میں امام احمد رضا خان قادری نے لکھا ہے کہ یہ کسی حدیث صحیح سے ثابت نہیں ہے (فتاویٰ رضویہ ج ۴، ص ۹) مولانا امجد علی نے بھی بہار شریعت ج ۴، ص ۱۲۳ پر یہی مسئلہ درج کیا ہے جو ہم نے تفصیل کے ساتھ لکھ دیا ہے۔

ایک سے زائد میتوں کی نماز جنازہ ایک ساتھ پڑھنے کا حکم

: اگر کسی جگہ کئی جنازے اکٹھے ہو جائیں تو سب کی نماز جنازہ ایک ساتھ پڑھ سکتے ہیں یا نہیں؟ اگر پڑھ سکتے ہیں تو اس کی صورت ترتیب کیا ہو گی؟

(محمد رضوان الحسن، سیکٹر ۱۱-اے، نارتھ کراچی)

: اگر کئی جنازے ایک وقت میں آجائیں تو افضل یہ ہے کہ ان کی نماز جنازہ الگ الگ

انہیں ترتیب کے ساتھ آگے پیچھے رکھ لیا جائے جو سب سے افضل ہے وہ امام کے سامنے قریب ترین ہو اور اس کے بعد اسی ترتیب کے ساتھ یکے بعد دیگرے سب کو رکھ لیا جائے اور نیت باندھتے وقت امام اور مقتدی سب کی نیت کر لیں۔

نماز جنازہ کی تکرار

سوال: کیا میت کی نماز جنازہ کی تکرار جائز ہے، بار بار پڑھی جاسکتی ہے جس نے کسی میت کی نماز جنازہ ایک بار پڑھ لی ہو، کیا وہ اسی میت کی نماز جنازہ دوبارہ پڑھ سکتا ہے؟

(نصیر اور عابد ہجرت کالونی۔ کراچی)

جواب: نماز جنازہ کی تکرار جائز نہیں ہے، فقہاء احناف کا یہی مسلک ہے، البتہ اگر میت کا جو قریب ترین وارث ہے اس نے نہ پڑھی ہو اور کچھ دوسرے لوگوں نے پڑھ لی ہو تو وہ دوبارہ پڑھ سکتا ہے ایسی صورت میں دوبارہ اس کے ساتھ وہ لوگ شریک جنازہ ہو سکتے ہیں جنہوں نے پہلی بار نہ پڑھی ہو۔ ولی اقرب نے نماز جنازہ پڑھ لی ہو یا اس کی اجازت سے کسی نے پڑھا لی ہو تو پھر اس کا اعادہ نہیں ہے۔ البتہ اگر پہلی بار نماز جنازہ پڑھی جا رہی تھی کہ نماز باطل ہو گئی، مثلاً جس نے پڑھائی ہو باوضو نہیں تھا تو اس صورت میں سب اعادہ کریں گے۔

میت کا سوگ

سوال: جب کوئی شخص وفات پاتا ہے تو کچھ لوگ مہینوں تک سوگ مناتے ہیں، کیا یہ شرعاً درست ہے؟ (عبدالحمید بلوچ، آسو گوٹھ ملیر۔ کراچی)

جواب: شرعاً تین دن سے زیادہ سوگ جائز نہیں، اسی طرح تعزیت کیلئے آنے والوں کی خاطر میت کے اہل خانہ کا تین دن تک بیٹھنا جائز ہے اس سے زیادہ نہیں۔ کسی عزیز کی وفات پر بے اختیار رونا آجائے، آنکھوں سے آنسو جاری ہو جائیں تو یہ فطرت کا تقاضا ہے اور جائز ہے۔ جب رسول اللہ ﷺ کے صاحبزادے حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کی وفات ہوئی اور آپ کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری

ہو گئے، اس پر صحابی حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے اظہار تعجب کیا تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: ”آنکھ روتی ہے، دل غمگین ہوتا ہے لیکن ہم اپنی زبان سے اپنے رب کی رضا کے خلاف کوئی کلمہ نہیں کہتے۔“ میت پر نوحہ یا بین کرنا یعنی عورتوں کا اونچی آواز سے رونا منع ہے، اسی طرح سوگ کے طور پر اپنے رخساروں پر تھپڑ مارنا، گریبان پھاڑنا اور زمانۂ جاہلیت کے طریقوں کے مطابق ماتم کرنا یا مبالغہ آرائی کے ساتھ میت کا ذکر کرنا منع ہے۔ بیوہ عورت کیلئے شوہر کے سوگ کی مدت چار ماہ دس دن ہے، جسے عدت وفات کہتے ہیں لیکن یہ صرف اس حد تک ہے کہ اس عرصے میں سادہ لباس پہنے، بناؤ سنگھار اور زیب و زینت نہ کرے، یہ مطلب ہر گز نہیں کہ سوا چار ماہ تک رونے رلانے کا سلسلہ جاری رکھے۔ سوگ کیلئے بیوہ کو سیاہ لباس پہننا ضروری نہیں۔

کیا میت کی آنکھ سے لینس نکالنے ضروری ہیں؟

سوال: میرے ایک عزیز نے آنکھ کا آپریشن کرا کے کنٹیکٹ لینس لگوالئے تھے، ان کے انتقال کے وقت یہ لینس ان کی آنکھوں میں لگے ہوئے تھے، کسی بزرگ نے متوجہ کیا کہ میت کی آنکھوں سے یہ لینس نکال لو ورنہ انہیں قبر میں عذاب ہوگا، چنانچہ ان کے صاحبزادے نے نکال لئے، اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ آیا یہ بات درست ہے؟ کیونکہ آج کل جدید طب اور سرجری نے کافی ترقی کرلی ہے، مصنوعی اعضاء بھی لگائے جاتے ہیں، انسانی جسم کے اندر بھی چیزیں فٹ کی جاتی ہیں، ان سب کا کیا حکم ہے؟ کیا موت کے بعد ان کا نکالنا ضروری ہے؟ اگر نہ نکالیں تو ان کی وجہ سے میت کو قبر میں عذاب ہوگا؟ (علی محمد، کیماڑی)

جواب: ایسے آلات یا اعضاء جو آپریٹ کر کے بدن کے اندر فٹ کئے گئے ہوں جیسے ٹانگوں میں راڈ یا دل کیلئے بیٹری وغیرہ یا جو بدن کے ساتھ جڑے ہوئے یا چپکے ہوئے ہوں، جیسے آنکھوں میں کنٹیکٹ لینس یا دانت یا ایسا شخص جس کی آنکھ کا ڈھیلا نہیں ہوتا آنکھ بند رہتی ہے جس کی وجہ سے دیکھنے میں اس کا چہرہ معیوب لگتا ہے،

اس میں مصنوعی ڈھیلا یا قورنیہ فٹ کر دیتے ہیں، جس سے بینائی تو بحال نہیں ہوتی لیکن چہرے کا حسن بحال ہو جاتا ہے، اسی طرح مصنوعی ٹانگیں ہوتی ہیں، موت کے بعد میت کے بدن سے ان کا جدا کرنا ضروری نہیں ہے اور یہ نظریہ باطل ہے کہ ان کی وجہ سے میت کو قبر میں عذاب ہوگا۔ البتہ اگر مصنوعی ٹانگ ہے جو بدن کے ساتھ جڑی ہوئی یا بندھی ہوئی ہے اور کسی قطع و برید یا آپریشن کے بغیر اسے کھول کر اس لئے جدا کر دیا جائے کہ کسی زندہ ضرورت مند انسان کے کام آجائے تو اس میں حرج نہیں ہے، اور اگر وہ کسی خیراتی ادارے یا مخیّر شخص سے محض برائے استعمال مستعار لی گئی تھی تو پھر تو اسے لازماً جدا کر کے متعلقہ ادارے یا شخص کو واپس کر دینا چاہئے۔ اسی طرح اگر دانت سونے کا ہے اور اسے کسی قطع و برید یا آپریشن کے بغیر (یعنی میت کو ایذا پہنچائے بغیر) وارث مال سمجھ کر نکالنا چاہئے تو نکال سکتا ہے، ورنہ چھوڑ دے۔

نمازِ جنازہ میں تکبیر کا چھوٹنا

سوال: ایک شخص نمازِ جنازہ میں شریک ہونے سے رہ گیا، جب وہ شخص پہنچا تو ایک تکبیر ہو چکی تھی اس کیلئے کیا احکام ہیں؟

جواب: وہ امام کی اگلی تکبیر کا انتظار کرے، اس تکبیر کے ساتھ اللہ اکبر کہہ کر امام کے ساتھ شامل ہو جائے، ایک دو یا جتنی تکبیریں رہ گئی ہیں، امام کے سلام پھیرنے کے بعد، اتنی تکبیریں کہہ کر سلام پھیر دے، نمازِ جنازہ صحیح ادا ہو جائے گی۔

دفن کے بعد میت کو دوسری جگہ منتقل کرنا

سوال: میت کو ایک جگہ دفن کرنے کے بعد اس کی قبر سے نکال کر دوسری جگہ دفن کرنا، جائز ہے یا نہیں؟ ازروئے شرع اس کا حکم بیان کیجئے؟ (ضیاء الدین، چترال)

جواب: فقہائے کرام نے کسی ضرورتِ شرعیہ کے بغیر ایسا کرنے سے منع کیا ہے، کیونکہ تدفین کے بعد میت اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دی جاتی ہے اور وہی اس کے حال کو بہتر جانتا ہے اور تبدیلیٔ احوال پر بھی اسی کو قدرت و اختیار ہے۔ میت کی قبر

کھودنے میں اس کا حال افشا ہو سکتا ہے، کیا خبر وہ کس حال میں ہے؟ ضرورت شرعیہ سے مراد یہ ہے کہ بالفرض میت کو غصب شدہ زمین میں دفن کر دیا یا مالک کی اجازت کے بغیر دوسرے شخص کی زمین میں دفن کر دیا اور اس کا مطالبہ ہے کہ میت کو اس کی زمین سے نکالا جائے تو ایسی صورت میں نکالنا یا منتقل کرنا جائز ہے۔

امانتاً میت کو قبر میں دفن کرنا

سوال: بعض اوقات کسی شخص کا انتقال وطن سے دور ہو جاتا ہے اور اسے وقتی طور پر وہاں امانت کے طور پر دفن کر دیتے ہیں اور نیت یہ ہوتی ہے کہ بعد میں اس میت کو قبر سے نکال کر اپنے وطن منتقل کر کے دوبارہ تدفین کی جائے گی۔ کیا ایسا کرنا از روئے شریعت درست ہے؟ (ذوالفقار علی، آزاد کشمیر)

جواب: فقہائے اسلام نے عذرِ شرعی کے بغیر میت کو قبر سے نکال کر دوسری جگہ دفن کرنے کی اجازت نہیں دی ہے۔ فتاویٰ قاضی خان میں لکھا ہے کہ کسی عورت کا بیٹا دوسرے شہر میں دفن کر دیا گیا ہو اور وہ اس کے لئے بے قرار ہو اور اس کی میت قبر سے نکال کر اپنے شہر منتقل کرانا چاہتی ہو تو اس کی تسکین کیلئے ایسا کرنا درست نہیں ہے۔ ملا علی قاری لکھتے ہیں کہ اس مسئلے پر ہمارے علماء کا اتفاق ہے۔

میت کو دفن کرنے کے بعد قبر سے نکال کر دوسرے مقام پر دفن کرنے کے ارادے سے امانت کے طور پر دفن کرنے کی شریعت میں کوئی سندِ جواز اور اصل نہیں ہے۔ امام احمد رضا خان رحمۃ اللہ تعالیٰ نے ''فتاویٰ رضویہ'' میں اس عمل کو حرام قرار دیا ہے۔

میت کے اہل خانہ کیلئے کھانا بھیجنا

سوال: جس گھر میں میت ہو گئی ہو، اس گھر والوں کیلئے کھانا بھیجنے کا شرعی حکم کیا ہے؟

(علی مردان، پشاور)

جواب: صاحبِ مشکوٰۃ نے ترمذی، ابو داؤد اور ابن ماجہ کے حوالے سے یہ حدیث نقل کی ہے عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب ''موتہ'' سے حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی شہادت کی خبر آئی تو رسول اللہ ﷺ نے اپنے

اہل خانہ سے فرمایا: "جعفر کے اہل خانہ کیلئے کھانا تیار کرو کیونکہ ان پر ایسی مصیبت نازل ہوئی ہے کہ انہیں (کھانے کے اہتمام کا) ہوش نہیں ہے۔"

علامہ ابن ہمام نے لکھا ہے کہ "میت کے رشتے داروں اور پڑوسیوں کیلئے یہ امر مستحب ہے کہ میت کے اہل خانہ کیلئے ایک دن کے کھانے کا اہتمام کریں کیونکہ یہ واضح طور پر ایک نیکی ہے اور میت کے پسماندگان کو اصرار کر کے کھانا کھلانا چاہئے۔"

ملا علی قاری نے مذکورہ بالا حدیث کے ذیل میں "طیبی" کے حوالے سے فقہاء کا ایک قول یہ بھی نقل کیا ہے کہ میت کے پسماندگان کیلئے تین دن کے کھانے کا اہتمام کرنا چاہئے کیونکہ مدت تعزیت شرعاً تین دن ہے۔

مولانا احمد علی سہارنپوری نے لکھا ہے کہ تدفین کے دن جو لوگ تجہیز و تکفین اور تدفین کے اہتمام میں مصروف رہے ہوں، وہ بھی اہل میت کیلئے پڑوسیوں، رشتے داروں اور احباب کے بھیجے ہوئے کھانے میں سے کھا سکتے ہیں۔

میت کے گھر ضیافت کا اہتمام

سوال: بعض مقامات پر دیکھنے میں آیا ہے کہ جس گھر میں میت ہوتی ہے تدفین کے بعد چند روز تک رشتے دار و احباب ان کے ہاں قیام یا آمدورفت کا سلسلہ شروع کر دیتے ہیں، اہل میت کو خواستہ یا نخواستہ ان کیلئے کھانے وغیرہ کا اہتمام کرنا پڑتا ہے اور وہ مزے سے کھاتے رہتے ہیں اور یہ امر اہل میت کیلئے مصیبت کا باعث بن جاتا ہے اس کے بارے میں شرعی حکم کیا ہے؟

(سید ظہیر الاسلام قادری، نارتھ ناظم آباد۔ کراچی)

جواب: ابن ماجہ نے جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، وہ فرماتے ہیں "ہم اہل میت کے گھر جمع ہونے اور کھانے کے اہتمام کو نوحہ خوانی کی طرح (ممنوع فعل) سمجھتے تھے۔" صاحب اعلاء السنن نے علامہ سندھی کے حوالے سے اس روایت کے تحت لکھا ہے کہ اس "روایت" کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس بات پر صحابہ کرام کا اجماع تھا یا اس روایت کا درجہ "حدیث تقریری" کا ہے۔

علامہ ابن ہمام نے لکھا ہے ''اہل میت کے ہاں ضیافت کا اہتمام مکروہ ہے اور یہ بدعت قبیحہ ہے کیونکہ ضیافت خوشی کے مواقع پر کی جاتی ہے نہ کہ رنج کے مواقع پر۔

ایصال ثواب کی حقیقت

سوال : میں نے ایک پمفلٹ میں پڑھا کہ ایصال ثواب کا عقیدہ رکھنا کفر ہے اور انہوں نے اس کی وضاحت میں قرآن کی آیت کا ترجمہ لکھا تھا کہ ہر شخص اپنے اعمال لے کر جائے گا اور صرف وہی اس کے کام آئیں گے۔ اس میں لکھا تھا کہ قرآن پڑھ کر ثواب مردوں کو بخشنا غلط ہے ؟ (محمد عرفان الملانی، پاکستان چوک۔ کراچی)

جواب : ''ایصال ثواب'' سے مراد اپنے کسی مالی صدقے یا نفلی عبادت کا ثواب کسی دوسرے کو پہنچانا ہے، یہ ایک جائز اور مستحسن امر ہے اور ائمہ اربعہ کا اس پر اجماع ہے۔ قرآن کی متعدد آیات مبارکہ اور احادیث کریمہ سے اس کا واضح ثبوت ملتا ہے، اعمال صالحہ نجات کا وسیلہ ضرور ہیں، لیکن نجات حقیقی کا انحصار اللہ کے کرم وعنایت پر ہے، کون سا عمل مقبول ہے اور کون سا مردود؟ یہ بھی اسی کے کرم پر منحصر ہے، حدیث پاک میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم میں سے کوئی شخص جنت میں نہیں داخل ہوگا، مگر اس ذات باری تعالیٰ کے فضل وکرم سے۔'' صحابہ نے عرض کیا: ''یارسول اللہ ﷺ! آپ بھی نہیں؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''میں بھی نہیں، سوائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ مجھے اپنی مغفرت کے سائے میں لے لے۔'' سید المرسلین ﷺ کی مغفرت کلی قطعی کی نوید تو قرآن نے دی ہے بلکہ آپ ﷺ تو گناہ گارانِ امت کیلئے وسیلۂ شفاعت و مغفرت ہیں، اس کے باوجود حضور ﷺ کا یہ فرمانا، تعلیم امت، کمال عبدیت کے اظہار اور جلالت باری تعالیٰ کے اقرار کیلئے ہے۔ قرآن کی تلاوت کرکے اس کا ثواب مردوں کو پہنچایا جاسکتا ہے اور پڑھنے والے کو بھی پورا ثواب ملے گا۔

میت کے ترکے سے ایصال ثواب کیلئے صدقہ کرنا

سوال: بعض اوقات لوگ ظاہر داری کی خاطر میت ہی کے مال سے یا برادری میں اپنی ساکھ قائم رکھنے کے لئے قرض لے کر ایصالِ ثواب، صدقات اور چہلم وغیرہ کے موقع پر کھانے کا اہتمام کرتے ہیں، حالانکہ میت کے ورثاء میں اس کے نابالغ بچے بھی شامل ہوتے ہیں۔ اس کا شرعی حکم بیان کیجئے؟

(عبدالقدیر خان، نئی کراچی)

جواب: میت کی وفات کے بعد اس کے متروکہ مال پر اس کا حق ملکیت ساقط ہو جاتا ہے اور وہ مال اس کے شرعی وارثوں کی ملکیت میں آجاتا ہے۔ اہل میت کو میت کے متروکہ مال میں، وراثت کی تقسیم سے پہلے، تصرف کا حق صرف امور ذیل کے لئے ہے:

(۱) میت کی تجہیز و تکفین اور تدفین کے مصارف۔

(۲) مرنے والے کے ذمے کسی کا قرض ہو تو اس کی ادائیگی۔

(۳) مرنے والے نے اگر کوئی وصیت کی ہو تو اس کی تعمیل و تکمیل۔ وصیت کی مقدار ترکے کی مقدار کے ایک تہائی کے برابر ہو، ایک تہائی سے زائد مال متروکہ پر وصیت نافذ نہیں ہوگی۔ البتہ اگر تمام ورثاء بالغ ہوں اور وہ برضا و رغبت ایک تہائی سے زائد وصیت کیلئے اپنے اپنے حصے سے دستبردار ہونا چاہیں تو یہ ان کی طرف سے میت کیلئے ایصال ثواب، تبرع اور نفلی صدقہ ہوگا اور اگر کچھ وارث نابالغ ہوں تو جو بالغ وارث تہائی ترکے سے زائد خرچ کرنا چاہے، اس کی ذمہ داری صرف اسی کی ذات پر ہوگی۔

اگر سب بالغ ورثاء مل کر یا کوئی ایک وارث اپنی طرف سے یا وصیت کے مطابق شرعی حد میں رہتے ہوئے چہلم یا کسی اور موقع پر کھانے کا اہتمام کریں اور دولت مندوں و فقراء کو کھلائیں تو جائز ہے۔ البتہ انہیں نابالغ وارثوں کی طرف سے یا ان کے حصے میں سے اس طرح کا تصرف کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اگر کریں گے تو اس کا بار صرف ان کی اپنی ذات پر ہوگا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

إِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِىْ بُطُوْنِهِمْ نَارًاؕ وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا ۝

"بلاشبہ جو لوگ یتیموں کا مال ناحق کھاتے ہیں، وہ اپنے پیٹ میں انگارے بھرتے ہیں اور وہ وقت دور نہیں کہ وہ جہنم کی شعلے مارتی آگ میں داخل ہوں گے۔"

(سورۃ النساء آیت ۱۰)

دوسرے مقام پر فرمایا:

وَاٰتُوا الْيَتٰمٰٓى اَمْوَالَهُمْ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ ۪ وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَهُمْ اِلٰٓى اَمْوَالِكُمْؕ اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِيْرًا ۝

"اور یتیموں کو ان کا مال دو اور طیب کو خبیث سے نہ بدلو (یعنی اپنے مال کو جو تمہارے لئے حلال اور طیب ہے یتیم کے مال سے نہ بدلو جو تمہارے لئے ازروئے حکم شرعی حرام اور ناپاک ہے یعنی ہوتا یہ تھا کہ یتیم کے سرپرست اپنا گھٹیا مال یتیم کو دے کر اس کا عمدہ مال لے لیتے تھے، اللہ تعالیٰ نے اس کی حقیقت بیان فرمائی) اور ان (یتیموں) کے اموال کو اپنے مال میں خلط ملط کر کے نہ کھاؤ، بلاشبہ یہ بہت بڑا گناہ ہے۔" (سورۃ النساء آیت ۲)

جو صدقات محض ظاہر داری کیلئے اور اپنی ساکھ قائم رکھنے کیلئے دیئے جائیں گے اس کا نہ کرنے والے کو، کوئی ثواب اور نہ ہی میت کو اس کا فیض پہنچے گا۔ اجر تو صرف اسی عمل کا ملتا ہے جو محض اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے کیا جائے نہ کہ دکھاوے کے لئے اور پھر ایسے کام کے لئے اپنے آپ کو بارِ قرض میں مبتلا کرنا کون سی دانشمندی ہے۔ تاہم اگر محض اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے صدقہ مطلوب ہو اور اس کے لئے قرض بھی لیا ہو تو یقیناً اجر پائے گا اور میت کو بھی اجر ملے گا لیکن قرض کی ادائیگی کا بار صرف اس پر ہوگا جس نے قرض لیا ہے، نابالغ وارثوں پر ہرگز نہیں ہوگا۔

سوئم، دسواں اور چالیسواں

سوال : اسلام میں سوئم، دسویں اور چہلم کے بارے میں کیا حکم ہے ؟

(بشریٰ جعفری، نارتھ ناظم آباد۔ کراچی)

جواب : اہلسنت کے ائمہ اربعہ کے نزدیک بالاتفاق ایصال ثواب جائز ہے۔ یعنی کسی مالی صدقے، نفلی عبادت یا عمل خیر کا ثواب کسی دوسرے مسلمان کو پہنچانا۔ خواہ وہ زندہ ہو یا انتقال ہو چکا ہو۔ اس سلسلے میں بکثرت آیات واحادیث موجود ہیں۔ صحیح بخاری میں حدیث ہے کہ حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کی والدہ کا انتقال ہو گیا اور وہ موجود نہ تھے۔ انہوں نے عرض کیا: "یارسول اللہ ﷺ! میں غائب تھا اور میری والدہ فوت ہو گئیں، اگر میں ان کی طرف سے کچھ صدقہ کروں تو کیا ان کو فائدہ پہنچے گا؟" آپ ﷺ نے فرمایا: "ہاں"، انہوں نے کہا کہ "میں آپ ﷺ کو گواہ بناتا ہوں کہ میں نے اپنا پھلوں والا باغ اپنی ماں کی طرف سے صدقہ کر دیا۔" قرآن میں والدین کے لئے، جملہ اہل ایمان کے لئے دعاء کی ترغیبات واحکام، نماز جنازہ میں میت کے لئے دعائے مغفرت اسی لئے ہے کہ ایک مومن کے عمل خیر کا فائدہ میت کو پہنچتا ہے۔ سوئم یا چہلم بہر اصل یہی ایصال ثواب ہے۔ خواہ فقراء کو کھانا کھلایا جائے یا قرآن خوانی کر کے ایصال ثواب کیا جائے، یا میت کو ثواب پہنچانے کی نیت سے کسی مسجد یا دار العلوم میں صدقہ جاریہ کے طور پر دیا جائے، یہ تمام صورتیں جائز ہیں۔ تیسرے یا چالیسویں دن کا تعین سہولت کے لئے ہوتا ہے، یہ ہرگز ضروری نہیں ہیں۔ ان سے پہلے یا بعد میں بھی ایصال ثواب ہو سکتا ہے۔ جیسے ہم آسانی کے لئے شادی وغیرہ کی تقریبات کے لئے دن مقرر کرتے ہیں۔ دینی مجالس، مدارس کے جلسوں یا ختم بخاری وغیرہ کے لئے دن مقرر کرتے ہیں۔ یہ صرف سہولت کے لئے ہے البتہ سوئم یا چہلم کی یہ صورت مناسب نہیں ہے کہ امراء آکر دعوتِ طعام سے لطف اندوز ہو کر چلے جائیں اور فقراء کو سرے سے نظر انداز کر دیا جائے، زیادہ بہتر یہ

ہے کہ صرف فقراء و مساکین کو ایصال ثواب کی نیت سے دیا جائے۔

مفاد عامہ کیلئے مختص اور ہر قسم کی تعمیرات کیلئے ممنوع جگہ پر مسجد بنانا

سوال : گلشن اقبال کراچی میں ایک اپارٹمنٹس کے مالک نے ایک ایسی جگہ پر مسجد تعمیر کرنے کی اجازت دی جو مفاد عامہ کیلئے کے ڈی اے کی جانب سے مختص ہے، یہ ۶۰ فٹ چوڑی جگہ ہے جس کے نیچے پانی کی مین پائپ لائن گزر رہی ہے اور اس جگہ کے دونوں جانب عرضاً ۱۵ فٹ ایک جانب اور ۱۵ فٹ دوسری جانب یعنی کل ۹۰ فٹ کی چوڑائی میں ہر قسم کی تعمیرات ممنوع ہے۔ کے ڈی اے نے بلڈر کو پابند کیا تھا کہ وہ باؤنڈری وال اس پر قبضے یا تعمیرات کیلئے نہیں بلکہ اس لئے تعمیر کرے کہ کوئی اس پر ناجائز تعمیرات اور تجاوزات نہ کر سکے۔ لیکن بلڈر کی اجازت سے اس پر باقاعدہ مسجد تعمیر کر لی گئی ہے۔ جب علاقے کے کچھ مکینوں نے متوجہ کیا کہ یہ تعمیر نہ صرف بلا اجازت بلکہ خلاف قانون اور خلاف شرع ہے تو مسجد سے وابستہ بعض مذہبی جذباتی لوگوں نے مسجد کے شرعی و قانونی پہلوؤں پر متوجہ کرنے والے مکینوں کو شوٹ کرنے کی دھمکی دی۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ ازروئے شرع و فقہ حنفی کیا :

(۱) مفاد عامہ کیلئے مختص اور ہر قسم کی تعمیرات کے لئے ممنوع جگہ پر مسجد بنانا جائز ہے جبکہ مجاز ادارے سے اس کی نہ اجازت لی گئی ہے، نہ اسے باقاعدہ قانونی شکل دی گئی ہے اور نہ ہی ادارے کے افسران اعلیٰ ایسی اجازت دے سکتے ہیں کیونکہ اس کے نیچے مین پائپ لائن پانی کی جارہی ہے ؟

(۲) کیا یہ تعمیر کردہ شرعاً مسجد ہے اور اس میں نماز پڑھنے والوں کو مسجد میں نماز پڑھنے کا ثواب ملے گا ؟

(۳) کیا ایسی مسجد بنانے والا عند اللہ اجر کا مستحق ہوگا جبکہ قریب ہی شرعی اور قانونی مسجد موجود ہے ؟

(۴) مسجد ضرار قرآن میں کسے کہا گیا ہے، کیا ایسی مساجد پر اس کا اطلاق ہوتا ہے ؟

(۵) خالص شرعی مسئلے پر متوجہ کرنے والوں کو جو شخص شوٹ کرنے کی علانیہ دھمکی دے اس کا کیا حکم ہے اور اس کی رپورٹ کرنی چاہیے؟

(۶) کیا ایسی تعمیر بلا اجازت، خلاف قانون غصب کے حکم میں نہیں ہے؟

نوٹ: چار صفحات پر مشتمل (مع نقشہ سائٹ پلان واسکیچ) تفصیلی سوالات کو لفظ بہ لفظ نقل کرنے کی گنجائش نہیں ہے، یہ خلاصہ اور نچوڑ درج کر دیا گیا ہے۔

(محمد اظہر احمد، محمد ظفر احمد، سید حضور حسین رضوی، گلشن اقبال۔ کراچی)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب ھوالموفق للصواب

۱- بر تقدیر صدق سائل صورت مسئولہ میں مسجد ایک ایسی جگہ پر بنائی گئی ہے جو حکومت کی ملک ہے اور مفاد عامہ میں عملاً زیر استعمال ہے یعنی اس کے نیچے سے پانی کی پائپ لائن گزر رہی ہے، جس میں ردوبدل، توسیع اور مرمت کا حق مستقبل میں بھی متعلقہ حکومتی ادارے کو حاصل ہے اور ہمارا مشاہدہ ہے کہ آئے دن ایسے توسیعی کام ہوتے رہتے ہیں اور مستفتی کے بیان کے مطابق بلڈر یا الاٹی کو زمین کے اس حصے پر باؤنڈری وال کی تعمیر کی ذمہ داری ملکیتی مقاصد کیلئے نہیں بلکہ تجاوزات سے تحفظ کیلئے دی گئی ہے، ایسی صورت میں وہ جگہ بلڈر کی ملکیت نہیں ہے اور نہ غیر مملوکہ زمین پر اس کی جانب سے وقف برائے مسجد کا اطلاق درست ہو سکتا ہے۔ اور شرعی مسجد کیلئے ایک شرط یہ بھی ہے کہ اس کے ساتھ غیر کا حق متعلق نہ ہو، چنانچہ فتاویٰ ردالمحتار ج ۱، ص ۲۵۵ میں ہے:

"وفی الواقعات بنی مسجد علیٰ سُوْرِالمدینة لاینبغی ان یصلی فیه لانه حق العامة فلم یخلص اللّٰه تعالیٰ کالمبنی فی ارض مغصوبة"

یعنی "الواقعات میں ہے کہ فصیل شہر پر ایک مسجد بنائی گئی ہو تو اس میں نماز پڑھنا جائز نہیں ہے کیونکہ وہ عوام الناس کا حق ہے، تو خالص اللہ تعالیٰ کی رضا کیلئے کسی جگہ کو خاص کر دینا جو وقف مسجد کی شرط ہے وہ اس میں نہیں پائی گئی، یہ تو اس مسجد کی مانند ہے جو غصب شدہ زمین پر بنائی گئی ہو۔" تو جس طرح فصیل شہر کے ساتھ عوام الناس کا

حق متعلق ہے بالکل اسی طرح زمین کے اس حصے کے ساتھ بھی ہے جس کے نیچے سے پانی کی پائپ لائن گزر رہی ہے اور بادی النظر میں ادارے کے مجاز افسران اس جگہ کو بطور مسجد باقاعدہ قانونی شکل یا منظوری دینے کے مجاز بھی نہیں ہیں تاوقتیکہ مفاد عامہ سے وابستہ پانی کی پائپ لائن کو کسی دوسری جگہ منتقل نہ کر دیں۔ فتاویٰ عالمگیری میں بھی ہے:

"مسجد بنی علی سؤرالمدینة قالوا لایصلی فیه لان السؤرحق العامة"۔ جب مجاز اتھارٹی نے استفتاء کے مطابق اس جگہ ہر قسم کی تعمیر کو منع کیا ہوا ہے اور اس کے علی الرغم یہاں مسجد بنائی گئی ہے تو یہ شرعی اور فقہی مسجد نہیں ہے اور اس پر مسجد کے احکام لاگو نہیں ہوں گے جو لوگ علم کے باوجود اس میں نماز پڑھیں گے ان سے فرض تو ساقط ہو جائے گا لیکن ارض مغصوبہ میں تصرف کرنے کے گناہ گار ہوں گے اور ان کو مسجد میں نماز پڑھنے کا ثواب بہر حال نہیں ہوگا۔

۲- قرآن مجید نے "مسجد ضرار" کی مذمت کرتے ہوئے سورۂ توبہ آیات نمبر ۱۰۷ میں اس کے چار مقاصدِ شر بیان فرمائے ہیں؛ یعنی (۱) کفر (۲) مسلمانوں کو ضرر پہنچانا (۳) مومنوں میں تفریق پیدا کرنا (۴) اسے مسلمانوں کے خلاف خفیہ سازشوں کی آماجگاہ بنانا۔ لہٰذا اگر کوئی مسجد محض رضائے الٰہی کیلئے نہیں بلکہ مسلمانوں میں تفریق پیدا کرنے کیلئے یا کسی مسجد کو ویران کرنے کیلئے بنائی جائے تو شرعاً مذموم بات ہے ایسا کرنے والا اجر سے محروم رہے گا۔

۳- رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ایک مسلمان کا سب کچھ دوسرے مسلمان پر حرام ہے، اس کی جان، اس کا مال اور اس کی آبرو۔ کسی مسلمان کو قتل کی دھمکی دینا حرام ہے، اگر کوئی خونِ ناحق کو حلال سمجھ کر کہتا ہے تو یہ کفر ہے، اور اگر حرمت کا اعتقاد رکھتے ہوئے کہتا ہے تو فسق ہے اور اس سے فی الفور اسے توبہ کرنی چاہئے۔ اگر ظاہر حال سے کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ ایسا شخص خدانخواستہ کوئی عملی اقدام بھی کر سکتا ہے تو اپنے تحفظ کیلئے قانونی اقدامات کرنا ہر شخص کا حق ہے۔ کسی کو جان سے مارنے کی دھمکی دینے کو، سائل کا مذہبی جوش وجذبے سے تعبیر کرنا غلط ہے، یہ تو دین اور مذہب کے منافی جذبہ

ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو حدودِ شرع کی حرمت کو قائم رکھنے کی توفیق عطا فرمائے۔

۴- رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ”تم میں سے جو شخص کوئی برائی دیکھے تو اسے اپنے ہاتھ سے روکے اور جو اس کی استطاعت نہ رکھتا ہو تو زبان سے روکے (یعنی صدائے احتجاج بلند کرے) اور جو یہ بھی نہ کر سکے تو کم از کم اسے دل سے برا جانے اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔“

۵- صحیح مسلم کتاب المساجد کی حدیث نمبر ۱۰۷۵ میں رسول اللہ ﷺ کی مدینہ منورہ میں تشریف آوری کا واقعہ مذکور ہے کہ جب آپ بنی نجار کی بستی میں تشریف لائے اور آپ ﷺ نے مسجد بنانے کا ارادہ فرمایا تو بنی نجار کے سرداروں کو بلایا اور فرمایا کہ ”اپنا یہ باغ مجھے فروخت کر دو۔“ انہوں نے رضائے الٰہی کے لئے بلا معاوضہ زمین دینے کی پیشکش کی۔ اکمال اکمال المعلم ج ۲، ص ۲۲۸ پر ہے: واقدی نے ذکر کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے عفراء کے دو بیٹوں سے یہ زمین دس دینار کے عوض خرید لی تھی اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ کی طرف سے قیمت ادا کر دی تھی، یہ زمین در حقیقت سہل اور سہیل نامی دو یتیم بچوں کی تھی، اس لئے حضور ﷺ نے بلا معاوضہ لینا پسند نہ فرمایا۔ تو مسجد بنانے کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کا اپنا عمل مبارک یہ تھا۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

ایک مسجد کی رقم یا مال دوسری مسجد پر خرچ کرنا

سوال: میں ایک مسجد کا جنرل سیکریٹری تھا۔ کمیٹی تبدیل ہو گئی، نئی انتظامیہ خائن لوگوں پر مشتمل ہے۔ میری تحویل میں مسجد کی کچھ رقم ہے لیکن اگر میں یہ رقم انتظامیہ کے ان افراد کو دے دوں تو مجھے یقین ہے کہ وہ رقم میں خیانت کریں گے، کیا میں یہ رقم کسی اور مسجد میں صرف کر سکتا ہوں؟ (ابن سعید۔ کراچی)

جواب: کسی مسجد کی رقم یا سامان کا دوسری مسجد میں صرف کرنا جائز نہیں ہے، البتہ اگر آپ کو اندیشہ ہے کہ انتظامیہ کے لوگ اس میں خیانت کریں گے تو خود اس رقم کو مسجد کی کسی ضرورت پر دیانتداری سے صرف کر دیں۔

مسجد کی تعمیر میں غیر مسلم کا چندہ لگانا

سوال: کیا مسجد کی تعمیر میں غیر مسلم کا چندہ لگانا جائز ہے، اگر کسی ادارے میں مسلمانوں کے ساتھ غیر مسلم بھی ہوں اور ان سے تعمیر مسجد کے لئے چندہ ماہانہ لیا جاتا ہو تو کیا بلا امتیاز اس رقم کا استعمال تعمیر مسجد میں جائز ہے؟ (عبد اللہ، کیماڑی۔ کراچی)

جواب: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ شٰهِدِيْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ ښ وَفِي النَّارِ هُمْ خٰلِدُوْنَ ۝ اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَلَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ فَعَسٰٓى اُولٰۗىِٕكَ اَنْ يَّكُوْنُوْا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ ۝

"مشرکوں کے لئے جائز نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مساجد تعمیر کریں، حالانکہ وہ خود اپنی ذات پر کفر کے گواہ ہیں، وہ ایسے (بد نصیب) لوگ ہیں کہ ان کے اعمال رائیگاں چلے گئے ہیں اور وہ ہمیشہ جہنم میں رہیں گے، اللہ کی مسجدیں تو صرف وہی لوگ آباد کر سکتے ہیں جو اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان لائے اور وہ نماز قائم کرتے رہے اور زکوۃ دیتے رہے اور اللہ کے سوا کسی سے خائف نہ ہوئے۔ پس امید ہے کہ وہ لوگ ہدایت یافتہ ہوں گے۔" (التوبہ: ۱۷، ۱۸)

اللہ تعالیٰ کے اس واضح ارشاد کی روشنی میں مسجد کی تعمیر و مرمت، تزئین و آرائش اور مصارف میں غیر مسلم کا مال لگانا جائز نہیں ہے، تعمیر مسجد فنڈ میں غیر مسلموں سے رضاکارانہ چندہ لینا یا جبری کٹوتی کرنا، جائز نہیں ہے اور ایسی حاصل شدہ رقم کا مسجد پر لگانا ناجائز ہے لہذا یہ رقم انہیں واپس کر دینی چاہئے۔ اس پر جملہ مفسرین و فقہاء امت کا اجماع ہے۔

مساجد و مدارس میں تعلیم القرآن کیلئے زکوٰۃ و فطرے کا استعمال

سوال: آج کل کراچی کی بعض مساجد میں اہل محلّہ کے بچوں کے لئے تعلیم القرآن کے مدارس و مکاتب قائم ہیں، جہاں بچوں کو ناظرہ قرآن مجید پڑھایا جاتا ہے یا بعض جگہ حفظ کا بھی انتظام ہے، مساجد کے منتظمین ان مدارس و مکاتب کے نام پر اہل محلّہ سے زکوٰۃ و فطرے کی رقوم جمع کرتے ہیں اور اس سے مدرسین کو تنخواہیں ادا کرتے ہیں، کیا ان کا یہ عمل جائز ہے؟ (عبدالرحمٰن، اورنگی ٹاؤن۔ کراچی)

جواب: زکوٰۃ، فطرہ، فدیۂ صوم، کفارۂ قسم، کفارۂ صوم، نذر وغیرہ یہ سب صدقات واجبہ کہلاتے ہیں۔ قرآن نے زکوٰۃ کا حکم تو بار بار دیا ہے، لیکن زکوٰۃ کے تفصیلی مسائل بیان نہیں کئے۔ یہ تمام تفصیلات احادیث میں بیان کی گئی ہیں لیکن زکوٰۃ کے جس شعبے کو قرآن نے تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے، وہ شعبہ مصارف زکوٰۃ ہے، یعنی ان افراد، طبقات اور مدات کا بیان جن پر زکوٰۃ و فطرہ کی رقوم صرف کی جاسکتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلۡفُقَرَآءِ وَالۡمَسٰكِيۡنِ وَالۡعٰمِلِيۡنَ عَلَيۡهَا وَالۡمُؤَلَّـفَةِ قُلُوۡبُهُمۡ وَفِى الرِّقَابِ وَالۡغٰرِمِيۡنَ وَفِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ وَابۡنِ السَّبِيۡلِ‌ؕ فَرِيۡضَةً مِّنَ اللّٰهِ‌ؕ وَاللّٰهُ عَلِيۡمٌ حَكِيۡمٌ ۝

"صدقات (اموال زکوٰۃ و صدقات واجبہ) صرف فقیروں اور مسکینوں کے لئے ہیں اور جو انہیں وصول کرنے پر مقرر کئے گئے ہیں اور جن کے دلوں کو اسلام سے مانوس کرنا مقصود ہے اور (غلامی سے) گردنیں آزاد کرانے میں اور جو بار قرض تلے دبے ہوئے ہیں اور جو (کل وقتی) اللہ کی راہ میں (مصروف عمل) ہیں اور مسافروں کے لئے، (یہ صدقات) اللہ کی طرف سے مقرر کئے ہوئے ہیں اور اللہ بہت جاننے والا بڑی حکمت والا ہے۔" (التوبہ: ۶۰)

اس آیت مبارکہ میں مصارف زکوٰۃ اور تمام صدقات واجبہ کے لئے قرآن نے آٹھ مدات واضح طور پر مقرر فرمادی ہیں۔ زیاد بن حارث صدائی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور میں نے (آپ کے دست اقدس پر) بیعت کی، زیاد نے اس موقع پر ایک طویل حدیث بیان کی اور اسی موقع پر یہ واقعہ نقل کیا کہ آپ کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا اور عرض کیا کہ مجھے زکوٰۃ کے مال میں سے کچھ عنایت فرمائیے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس سے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ کے مصارف کا بیان نہ کسی نبی کی مرضی پر چھوڑا ہے اور نہ ہی کسی غیر نبی کی مرضی پر، بلکہ خود ہی فیصلہ فرمادیا ہے اور ان کے آٹھ حصے (یعنی آٹھ قسمیں) مقرر کردیئے ہیں، اگر تم ان آٹھ مدات میں سے کسی ایک کے تحت حقدار بنتے ہو تو بتاؤ میں (مال زکوٰۃ میں سے) تم کو دے دوں گا۔" (سنن ابی داؤد) اور تمام صدقاتِ واجبہ کے مصارف متعین ہیں اور کسی کو ان میں ردوبدل کا اختیار نہیں ہے۔ مدارس تعلیم القرآن اور مکاتبِ تعلیم القرآن میں مقامی لوگوں کے بچے تعلیم حاصل کرتے ہیں، وہ خود زکوٰۃ اور فطرہ دینے والے ہیں، ان کی تعلیم پر زکوٰۃ و فطرہ کی رقوم صرف کرنا ایسا ہی ہے جیسے اپنے بچوں کو ٹیوشن پڑھواکر اس کی اجرت زکوٰۃ اور فطرے سے ادا کی جائے، یہ ناجائز ہے اور اس طرح انسان زکوٰۃ، فطرہ اور فدیے کی ذمے داری سے بری الذمہ نہیں ہوسکتا۔ مساجد، محلّے کی کمیٹیاں یا بعض دینی رفاہی تنظیمات جو ان مقاصد کے لئے زکوٰۃ و فطرہ وصول کرتی ہیں، ان کا یہ عمل قطعاً ناجائز ہے اور اس کے لئے وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں جواب دہ ہوں گے۔

مسجد فنڈ سے چراغاں

سوال: کیا مسجد کے چندے کی جمع شدہ رقم سے میلاد النبی ﷺ یا دیگر ایّام مقدسہ پر مسجد میں چراغاں کرنے، جھنڈیاں لگانے پر خرچ کرنا جائز ہے؟

(محمد شہزاد قریشی، نیو کراچی)

جواب: اگر چندہ خاص برائے تعمیر دیا گیا ہو تو متولی یا انتظامیہ پر لازم ہے کہ اسے صرف تعمیر پر خرچ کرے البتہ جو چندہ مسجد کے مصارف عمومی و مصارف جاریہ کے

لئے دیا جاتا ہے جس میں مسجد کے ملازمین کے مشاہرے، مسجد کی مرمت و دیکھ بھال کے مصارف اور نمازیوں کو سہولتوں کی فراہمی مثلاً گیزر و کولر وغیرہ کی فراہمی شامل ہے، اسی طرح آج کل ان مصارف میں ایام مقدسہ کا چراغاں وغیرہ بھی شامل ہے اور چندہ دینے والے اسے دیکھتے ہیں اور اس پر کوئی اعتراض نہیں کرتے لہٰذا یہ جائز ہے۔

مسجد میں محراب نہیں ہے

سوال: محلے کی ایک مسجد ہے جس میں محراب نہیں ہے اور اس میں جماعت بھی گراؤنڈ فلور کے بجائے پہلی منزل پر ہوتی ہے، لوگوں کو دور سے پتا بھی نہیں چلتا کہ یہ مسجد ہے، کیا محراب کے بغیر مسجد کا وجود مناسب ہے۔

(آغا عبدالوحید خان، گلشن حدید۔ کراچی)

جواب: کسی مسجد کے شرعاً مسجد ہونے کے لئے محراب کا ہونا ضروری نہیں ہے، عہد رسالت اور عہد خلفائے راشدین میں مساجد میں محراب نہیں تھے، مساجد میں محراب کا سلسلہ عہد بنی امیہ میں شروع ہوا ہے، محراب اور مینار کا یہی فائدہ ہے کہ دور سے مسجد کی نشاندہی ہو جاتی ہے اور محراب کے ذریعے وسط مسجد کا تعین ہو جاتا ہے جس سے صفوں کو بنانے اور سیدھا رکھنے میں آسانی ہوتی ہے، تاہم محراب کے بغیر بھی مسجد، مسجد ہی رہے گی اور یہ اس کا کوئی شرعی نقص نہیں ہے، اگر پہلی منزل پر جماعت ہوتی ہے تو یہ بھی جائز ہے، تاہم شرعاً یہ ضروری ہے کہ فرش زمین سے لے کر ماوراء تک وہ مسجد ہی رہے، مسجد کے منافی کسی مصرف میں استعمال نہ کی جائے۔

مسجد میں گیس لیمپ اور ڈیٹول سے غسل

سوال: مسجد میں بدبو کی وجہ سے پیاز، لہسن اور بدبودار چیز کھا کر آنا منع ہے، جبکہ بعض مساجد میں گیس لیمپ جلائے جاتے ہیں اور گیس سے بدبو نکلتی ہے، کیا ڈیٹول سے نہانا جائز ہے؟

(محمد شہزاد قریشی، نیو کراچی)

جواب: پیاز، لہسن یا بدبودار چیز کھا کر مسجد میں آنے کی ممانعت ہے کہ اس سے دوسرے نمازیوں اور فرشتوں کو اذیت ہوتی ہے اور یہ چیزیں کچی کھا کر آنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، جبکہ گیس لیمپ اور سرد علاقوں میں ہیٹر ضرورت کے تحت جلائے جاتے ہیں، ڈیٹول سے غسل کرنا جائز ہے، معمولی سی اسپرٹ انجکشن لگانے کے لئے بھی لگائی جاتی ہے تاکہ زخم نہ بنے، جراثیم مرجائیں اور انفیکشن نہ ہو۔

مصلّے کو موڑنا

سوال: کہا جاتا ہے کہ آدمی نماز پڑھتے ہوئے درمیان میں اٹھ کر پانی پینے کے لئے یا کسی کام سے جائے تو "جائے نماز" کو تھوڑا موڑ دے ورنہ شیطان اس پر تھوک دیتا ہے۔ (نائلہ۔ کراچی)

جواب: یہ قول باطل ہے، شریعت میں اس کی کوئی ممانعت نہیں۔ "جائے نماز" بچھا ہوا چھوڑ سکتے ہیں البتہ اگر احتیاطاً لپیٹ کر رکھا جائے کہ اس پر کسی کے ناپاک قدم نہ پڑیں تو کوئی حرج نہیں ہے۔

مسجد میں سلام کا جواب دینا

سوال: لوگ مسجد میں آتے ہیں تو سلام کرتے ہیں، مسجد میں پہلے سے موجود لوگ نماز، تلاوت یا ذکر اللہ میں مشغول ہوتے ہیں، کیا ان سب پر سلام کا جواب دینا ضروری ہے؟ (قاری محمد صدیق، گلشن اقبال۔ کراچی)

جواب: اگر کوئی شخص نماز پڑھ رہا ہے، تلاوت کر رہا ہے، ذکر، تسبیح یا درود پڑھنے میں مشغول ہے، دینی کتب کے مطالعے میں مشغول ہے، خطبہ دے رہا ہے، وعظ و تقریر میں مشغول ہے، کھانا کھا رہا ہے تو اسے سلام نہیں کرنا چاہئے اور اگر کسی نے سلام کیا تو ان پر جواب دینا واجب نہیں ہے۔ اسی طرح کوئی شخص غسل خانے میں ہے تو اسے سلام نہیں کرنا چاہئے۔ جو لوگ خلاف شرع لہو و لعب، گانے بجانے، کبوتر اڑانے یا کسی علانیہ فسق میں مشغول ہوں تو انہیں بھی سلام نہ کیا جائے کیونکہ سلام تکریم کی علامت ہے اور یہ لوگ شرعاً تکریم و احترام کے مستحق نہیں ہیں۔

غیر مسلموں کا مسجد بنانا

سوال: ایک اخبار میں ایک مولانا صاحب نے ہندو کا مسجد کی تعمیر کے لئے زمین وقف کرنا جائز قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ اگر ہندو کے نزدیک مسجد بنانا کار ثواب ہے تو اس کا مسجد کے لئے جگہ وقف کرنا صحیح ہے اور اس میں نماز پڑھنا بھی صحیح ہے، چونکہ وہ ایک دفعہ مسجد بن چکی ہے، اس لئے اگر اس کی دوبارہ تعمیر کی بھی ضرورت ہو تو صحیح ہے، کیا یہ جواب شرعاً درست ہے؟ (نور نبی، شاہ پور چاکر، سندھ)

جواب: یہ جواب شرعاً درست نہیں ہے، نہ غیر مسلموں کا مسجد تعمیر کرنا جائز ہے اور نہ ہی مسجد کی تعمیر کے لئے مسلمانوں کا غیر مسلموں سے چندہ لینا جائز ہے،

مختصراً دلائل حسب ذیل ہیں:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ شٰهِدِيْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ اُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ ۚ وَفِى النَّارِ هُمْ خٰلِدُوْنَ ۝ اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ

"مشرکوں کے لئے جائز نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مساجد تعمیر کریں در آں حالیکہ وہ اپنے کفر پر قائم ہوں، ان کے اعمال اکارت ہیں اور وہ ہمیشہ جہنم میں رہیں گے، اللہ تعالیٰ کی مساجد تو صرف وہ لوگ تعمیر کر سکتے ہیں جو اللہ تعالیٰ اور روزِ آخرت پر ایمان لا چکے ہیں، (التوبہ: ۱۷، ۱۸)"

اس آیت کے تحت علامہ ابوبکر جصاص اپنی تفسیر احکام القرآن میں لکھتے ہیں: "اس آیت کا مقتضیٰ یہ ہے کہ کفار کو مسجد میں داخل ہونے، مساجد کو بنانے، اس کے مصالح کا انتظام کرنے اور اس کا نگران بننے سے روک دیا جائے، کیونکہ لفظ ان دونوں باتوں کو شامل ہے (یعنی تعمیر کرنا اور آباد کرنا)۔" امام فخر الدین رازی تفسیر کبیر میں لکھتے ہیں: "کافر کے لئے مسجد کی تعمیر کرنا جائز نہیں ہے اور یہ اس وجہ سے ہے کہ مسجد عبادت کی جگہ ہے، پس مسجد کا

معظم ہونا واجب ہے اور کافر مسجد کی توہین کرتا ہے اور اس کی تعظیم نہیں کرتا۔" علامہ علی بن محمد خازن تفسیر خازن میں لکھتے ہیں: "اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر واجب کر دیا ہے کہ وہ کفار کو مساجد کی تعمیر سے روکیں، کیونکہ مسجدیں تو صرف اللہ وحدہٗ لاشریک کی عبادت کے لئے تعمیر کی جاتی ہیں، تو جو شخص اللہ تعالیٰ کا منکر ہو، اس کے لئے مساجد اللہ کی تعمیر جائز نہیں ہے۔" قاضی ثناء اللہ پانی پتی تفسیر مظہری میں لکھتے ہیں: "مسلمانوں پر واجب ہے کہ وہ کفار کو مساجد کی تعمیر سے منع کریں کیونکہ اللہ تعالیٰ کی مساجد صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لئے بنائی جاتی ہیں، اور جو شخص اللہ تعالیٰ کا منکر ہو اس کو مساجد بنانے کا کوئی حق نہیں ہے۔"

علامہ ابن عابدین شامی ردالمحتار میں لکھتے ہیں:

"جب ذمی (اسلامی مملکت کے غیر مسلم شہری) کسی ایسی چیز کے بارے میں وصیت کریں جو صرف ہمارے نزدیک عبادت ہے اور ان کے نزدیک عبادت نہیں ہے، مثلاً وہ حج کی وصیت کرے یا مسلمانوں کے لئے مسجد بنانے کی یا مسلمانوں کی مساجد میں چراغ روشن کرنے کی تو یہ وصیت بالاجماع باطل ہے۔" فتاویٰ عالمگیری میں ہے "اگر کوئی ذمی اپنے گھر کو مسلمانوں کی مسجد کی طرح مسجد بنادے اور انہیں اس میں نماز پڑھنے کی اجازت دے دے اور پھر وہ مر جائے تو وہ گھر اس کے ورثاء کو وراثت میں مل جائے گا (یعنی مسجد نہیں بنے گا) یہ تمام فقہاء کا قول ہے۔ علامہ ابن عابدین شامی تنقیح الفتاویٰ الحامدیہ میں لکھتے ہیں: "اہل ذمہ کا وقف کرنا جائز نہیں ہے، سوائے ان امور کے جو ان کے اور ہمارے دونوں (مذاہب) کے نزدیک عبادت ہو حتیٰ کہ اگر ذمی اپنے گھر کو مسلمانوں کے لئے مسجد بنادے تو وہ جائز نہیں ہے۔" ان دلائل کی روشنی میں مساجد کی تعمیر، توسیع اور ضروریات کے لئے غیر مسلموں سے مالی اعانت لینا جائز نہیں ہے، یہودی اور عیسائی تو کافر ہیں، ہندو مشرک ہیں، وہ ہندوستان میں بابری مسجد کو شہید کر چکے ہیں، ان کی مذہبی کتب اور عقائد میں یہ کہیں بھی درج نہیں ہے کہ اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ کی عبادت کے لئے مسجد بنانا کارِ ثواب اور رضاءِ الٰہی کا باعث ہے۔ ایسے لوگوں کے بارے میں قرآن مجید میں فرمان باری تعالیٰ ہے کہ: "وہ اپنی جانوں پر کفر کے گواہ

ہیں۔ "لہذا یہ مفروضہ ہی غلط ہے کہ ہندو تعمیر مسجد کو عبادت الٰہی اور تقرب الٰہی کا ذریعہ یا کارِ ثواب سمجھ سکتا ہے۔ مسجد کا تو قیام ہی توحید کے اعلان اور کفر و شرک کے ابطال کے لئے ہوتا ہے۔ ہر روز دعاء قنوت میں ہم اللہ تعالیٰ سے یہ عہد و پیمان کرتے ہیں کہ "اے اللہ! جو تیرا جفاکار اور تیرا دشمن ہے ہم اس سے قطع تعلق کا اعلان کرتے ہیں۔"

استخارہ کیا ہے؟

سوال: استخارہ کیا ہے؟ اس کا طریقہ کیا ہے؟ کب تک کرتے رہیں؟ اس کا نتیجہ کیسے معلوم ہوگا؟ (فاطمہ بنت عبداللہ، اقبال۔ کراچی)

جواب: صحیح بخاری میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہمیں تمام امور میں استخارہ کی تعلیم فرماتے تھے، (اس کا طریقہ وہ یوں بتاتے کہ) جب تم کسی کام کا ارادہ کرو تو دو رکعت نفل پڑھ کر یہ دعاء مانگو: "اے اللہ! میں تیرے علم سے خیر کی رہنمائی چاہتا ہوں اور تیری قدرت کاملہ سے قوت (فکر و عمل) مانگتا ہوں اور میں تجھ سے تیرے فضل عظیم کا سوال کرتا ہوں کیونکہ تو قادر ہے اور میں بے بس ہوں، تو جانتا ہے اور میں نہیں جانتا اور تو غیبوں کا جاننے والا ہے۔ اے اللہ! اگر تیرے علم کے مطابق یہ کام میرے دین، میرے معاش، میرے انجام کار اور میرے فوری اور دیرپا فائدے کے اعتبار سے میرے لئے بہتر ہے تو اسے میرے لئے مقدر فرمادے اور اسے میرے لئے آسان فرمادے اور پھر اس میں میرے لئے برکت عطا فرما، اور اگر تیرے علم کے مطابق یہ کام میرے دین، معاش، انجام کار اور میرے فوری اور دیرپا فائدے کے اعتبار سے میرے لئے برا ہے تو تو (اپنی قدرت سے) اسے مجھ سے دور کردے اور مجھے اس سے دور کردے اور اس کے بدلے میں خیر جہاں بھی ہے، اسے میرے لئے مقدر فرما اور پھر میرے دل کو اس پر رضامند فرمادے۔"

طبرانی میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ اس وقت تک استخارہ کرتا رہے یہاں تک کہ اس کا دل کسی ایک بات پر مطمئن ہو جائے۔

استخارہ کے لفظی معنی ہیں ؟ ”خیر طلب کرنا“ یعنی ایسا مباح کام جس کے بارے میں انسان کو تردد ہو کہ کروں یا نہ کروں، اس میں مجھے کامیابی ہوگی یا ناکامی، اس کے نتائج میرے لئے مفید ہوں گے یا نقصان دہ۔

فقہاء نے لکھا ہے کہ دو رکعت نفل پڑھ کر یہ دعاء پڑھے اور اول و آخر درود شریف اور سورۂ فاتحہ پڑھے اور اس کے بعد باوضو قبلہ رو لیٹ جائے۔ بعض علماء نے اپنے تجربات کی روشنی میں لکھا ہے کہ اگر خواب میں سفیدی یا سبزی نظر آئے تو اسے مثبت اشارہ سمجھے اور سیاہی یا سرخی نظر آئے تو اسے منفی اشارہ سمجھے۔ لیکن خواب دیکھنا یا خواب میں کچھ نظر آنا، یہ استخارہ کے لئے ضروری نہیں بلکہ اصل چیز ہے معاملے کے کسی ایک رخ کی جانب ذہن کا مائل ہو جانا اور اطمینان قلب۔ جب تک کسی ایک جانب دل کا جھکاؤ نہ ہو اور دل کسی ایک جانب جم نہ جائے یہ سلسلہ جاری رکھیں۔ جب ایک مرتبہ اطمینان قلب ہو جائے تو پھر اللہ پر توکل کر کے اس کام کو کر دیں۔ انشاء اللہ العزیز اللہ تعالیٰ کی تائید، رحمت اور مدد شامل حال ہوگی۔

استخارہ سے فیصلہ

سوال: ایک لڑکی جس کا نکاح پانچ ماہ قبل ہو چکا ہے۔ اس کی رخصتی اور نکاح کو برقرار رکھنے یا نہ رکھنے کا فیصلہ استخارے پر چھوڑ گیا۔ لڑکی نے استخارہ کیا۔ اس نے خواب میں دیکھا کہ حد نگاہ ہریالی ہی ہریالی ہے۔ ایک بزرگ جو سبز لباس پہنے ہیں، ان کے ہاتھ میں سفید تسبیح ہے لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر آسمان کی طرف لے جاتے ہیں اور آسمان چھونے کو کہتے ہیں اور کہتے ہیں تمہارا مرتبہ اور مقام یہ ہے۔ رہنمائی فرمایئے ؟ (نام نامعلوم)

جواب: ”استخارہ“ کسی کام کے شروع کرنے سے پہلے ہوتا ہے تا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات سے رہنمائی حاصل کی جائے اب جبکہ نکاح ہو چکا ہے تو اللہ تعالیٰ کی ذات سے اس کی کامیابی کی دعاء مانگنی چاہئے حتیٰ الامکان اسے نباہنے کی کوشش کرنی چاہئے، بلا سبب اور بلا جواز نکاح کا ختم کرنا یا خلع و طلاق لینا اچھی بات نہیں تاہم بظاہر آپ کی علامات اچھی ہیں۔ استخارے کی جو بھی تعبیر آئے وہ کوئی قطعی امر نہیں ہوتا، استخارے پر عمل نہ کرنے کا کوئی کفارہ نہیں ہے، استخارہ ان لوگوں کو مفید ہوتا

ہے جو ضعیف الاعتقاد اور توہم پرست نہ ہوں، کمال ایمان یہ ہے کہ انسان اپنے معاملات اللہ کے سپرد کردے اس کی رضا کو مقدم جانے اور ہر پیش آمدہ معاملے میں اس سے سلامتی، عافیت اور امان کا طلب گار رہے۔

مسجد میں سوال کرنے اور سائل کو دینے کا شرعی حکم

سوال : اکثر جگہ مساجد میں لکھا ہوتا ہے کہ "مسجد میں سوال کرنا منع ہے"، لہٰذا بتایئے کہ ازروئے شرع مسجد میں سوال کرنے کا حکم کیا ہے اور آیا سائل کو مسجد کے اندر دینا منع ہے یا جائز ہے، ازراہ کرم دلائل کی روشنی میں جواب تحریر کیجئے۔

(سید ذاکر شاہ، بٹگرام، ہزارہ)

جواب : شرعاً اصولی طور پر سوال کرنا ایک انتہائی ناپسندیدہ امر ہے، لہٰذا اس کی اجازت صرف ناگزیر حالات میں دی گئی ہے اور ضرورت شدیدہ کے بغیر سوال کرنے یا اسے پیشے کے طور پر اختیار کرنے پر احادیث مبارکہ میں بڑی وعید آئی ہے۔

چنانچہ رسول اللہ ﷺ فرمایا:

(۱) "عَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ عُمَرَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمَا یَقُوْلُ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ : مَایَزَالُ الرَّجُلُ یَسْأَلُ النَّاسَ حَتّٰی یَأْتِیَ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ وَلَیْسَ فِیْ وَجْھِہٖ مُزْعَۃُ لَحْمٍ"

(ترجمہ) : حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، جو شخص لوگوں سے ہمیشہ سوال کرتا رہتا ہے' وہ قیامت کے دن اس حال میں اٹھے گا کہ اس کے چہرے پر گوشت کا ایک ٹکڑا بھی نہیں ہوگا، (صحیح مسلم ص ۳۳۳ ج۱)۔

(۲) "عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ : مَنْ سَأَلَ النَّاسَ اَمْوَالَھُمْ تَکَثُّرًا فَاِنَّمَا سَأَلَ جَمْرًا فَلْیَسْتَقِلَّ اَوْ لِیَسْتَکْثِرْ"

(ترجمہ) : حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، جو شخص لوگوں سے (ضرورت شدیدہ سے مجبور ہو کر نہیں بلکہ) محض مال و دولت کی کثرت کی ہوس میں مبتلا ہو کر ان کے اموال کا سوال کرتا ہے، تو (ایسی صورتحال میں درحقیقت) وہ جہنم کا انگارہ مانگتا ہے، (اب یہ اس پر منحصر ہے کہ وہ) کم پر قناعت کرے یا زیادہ کی خواہش کرے، (صحیح مسلم ص ۳۳۳ ج ۱)۔

(۳) "وَمَنْ سَأَلَ النَّاسَ لِيُثْرِيَ بِهِ مَالَهُ كَانَ خُمُوشاً فِي وَجْهِهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَرِضَفاً يَأْكُلُهُ مِنْ جَهَنَّمَ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُقِلَّ وَمَنْ شَآءَ فَلْيُكْثِرْ"

(ترجمہ) : جو شخص (افلاس کی بناء پر نہیں بلکہ) محض مال میں اضافے کے لئے لوگوں سے سوال کرتا ہے تو قیامت کے دن اس کا یہ سوال اس کے چہرے پر زخم اور گھاؤ کی شکل میں ظاہر ہو گا اور جہنم کا گرم جلتا ہوا پتھر ہو گا جس کو وہ وہاں کھائے گا، اب (پیشہ ور مانگنے والوں پر منحصر ہے) جس کا جی چاہے کم سوال کرے یا چاہے تو زیادہ کرے، (جامع ترمذی)

ان احادیث کی روشنی میں علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں : جس کے پاس ایک دن کی خوراک ہو، خواہ وہ اس کے پاس عملاً موجود ہو یا اس طور پر کہ وہ اس کے کمانے کی استعداد اور مواقع رکھتا ہے تو وہ شخص ایک صحت مند کمانے والے شخص کے حکم میں ہے۔ ایسے شخص کے حال سے واقفیت رکھنے کے باوجود اسے دینے والا گنہگار ہو گا کیونکہ یہ حرام کام میں اعانت ہے' ہاں البتہ کوئی شخص طلب علم یا جہاد میں مشغول ہے (یعنی وہ اپنے معاش کے لئے فارغ نہیں ہے) اور ضرورت مند بھی ہے تو اسے خوراک اور لباس کے لئے دینا جائز ہے۔ (حاشیہ فتاویٰ شامی ص ۹۴-۹۵، ج ۲)

رہا یہ سوال کہ شرعاً کن حالات میں سوال کرنا جائز ہے تو رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے :

"إِنَّ الْمَسْئَلَةَ لَاتَحِلُّ لِغَنِيٍّ وَلَا لِذِي مِرَّةٍ سَوِيٍّ اِلَّا لِذِي فَقْرٍ مُدْقِعٍ أَوْ غُرْمٍ مُفْظِعٍ"

(ترجمہ) : بلاشبہ سوال کرنا نہ تو مالدار شخص کے لئے جائز ہے اور نہ ہی تندرست و توانا شخص کے لئے، ہاں، ایسے مفلس و نادار شخص کے لئے ضرور جائز ہے، جسے

افلاس نے زمین پر دے مارا ہو یا وہ قرض وتاوان کے کسی بھاری بوجھ تلے دب گیا ہو۔
(جامع ترمذی)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

”فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ۝ وَمَآ اَدْرٰكَ مَا الْعَقَبَةُ ۝ فَكُّ رَقَبَةٍ ۝ اَوْ اِطْعٰمٌ فِیْ یَوْمٍ ذِیْ مَسْغَبَةٍ ۝ یَّتِیْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ۝ اَوْ مِسْكِیْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ ۝“

(ترجمہ) : تو کیوں نہ داخل ہوا وہ دشوار گزار گھاٹی میں، اور آپ کیا جانیں کہ (وہ) گھاٹی کیا ہے ؟، (بار قرض یا غلامی سے) کسی کی گردن چھڑانا، یا (شدید) بھوک کے دن کھانا کھلانا، (خصوصاً ایسے) یتیم کو جو قرابت دار (بھی) ہو، یا خاک بسر (بھوک کے مارے) مسکین کو۔ (البلد : ۱۱ تا ۱۶)۔

اب آتے ہیں زیر بحث مسئلے کی طرف کہ مسجد میں سوال کرنے کا شرعی حکم کیا ہے ؟ تو ہم اس پر تفصیل سے گفتگو کریں گے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

”اِنَّمَا وَلِیُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوا الَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ ۝“

(ترجمہ) : تمہارا دوست صرف اللہ ہے، اور اس کا رسول ہے اور وہ اہل ایمان ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں اور حالت رکوع میں بھی (ہوں تو) زکوۃ (صدقہ) دیتے ہیں۔
(المائدہ : ۵۵)

اس آیت کی تفسیر میں اس کا شان نزول بیان کرتے ہوئے علامہ ابو عبداللہ محمد بن احمد مالکی قرطبی نے تفسیر الجامع لاحکام القرآن میں، امام فخر الدین محمد بن ضیاء الدین عمر رازی شافعی نے تفسیر کبیر میں، علامہ جلال الدین سیوطی نے تفسیر در منثور میں، حافظ عماد الدین ابن کثیر حنبلی نے تفسیر ابن کثیر میں، علامہ احمد شہاب الدین خفاجی حنفی نے عنایت القاضی میں اور علامہ سید محمود آلوسی حنفی نے تفسیر روح المعانی میں اپنی اپنی اسناد کے ساتھ روایت

کیا ہے کہ ایک روز صحابہ کرام نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ظہر کی نماز پڑھی، ایک شخص نے مسجد میں سوال کیا، اس کو کسی نے نہ دیا، حضرت علی رضی اللہ عنہ نماز پڑھ رہے تھے، انہوں نے حالت رکوع میں ہاتھ کے اشارے سے اپنے دائیں ہاتھ کی چھنگلی کی انگوٹھی اس کو دے دی۔

حضرت عبداللہ بن ابو بکر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "تم میں سے کسی شخص نے آج کسی مسکین کو کھانا کھلایا ہے؟، حضرت ابو بکر نے عرض کیا: میں مسجد میں داخل ہوا تو وہاں ایک سائل سوال کر رہا تھا، میں نے عبدالرحمن کے ہاتھ میں روٹی کا ایک ٹکڑا دیکھا تو میں نے اس سے وہ ٹکڑا لے کر اس سائل کو دے دیا۔" (سنن ابی داؤد ص ۲۳۵ ج ۱)

اب اہم فقہاء احناف اور مستند کتب فتاویٰ سے چند حوالہ جات پیش کرتے ہیں۔

علامہ ابراہیم حلبی حنفی لکھتے ہیں:

"وَعُلِمَ مِمَّا تَقَدَّمَ حُرْمَةُ السُّؤَالِ فِی الْمَسْجِدِ لِاَنَّهٗ کَنَشْدَانِ الضَّالَّةِ وَالْبَیْعِ وَنَحْوِهٖ وَکَرَاهَةِ الْاِعْطَاءِ لِاَنَّهٗ یَحْمِلُ السُّؤَالَ وَقِیْلَ لَا اِذَا لَمْ یَتَخَطِّ النَّاسَ وَلَمْ یَمُرَّ بَیْنَ یَدَیْ مُصَلٍّ وَالْاَوَّلُ اَحْوَطُ"

(غنیۃ المستملی ص ۵۶۸)

(ترجمہ): گزشتہ عبارت سے یہ معلوم ہو گیا کہ مسجد میں سوال کرنا حرام ہے، کیونکہ یہ گم شدہ چیز تلاش کرنے اور خرید و فروخت کے لئے آواز لگانے کی مثل ہے، اور ایسے سائل کو دینا اس لئے مکروہ ہے کہ یہ (مسجد میں) سوال کرنے پر ابھارتا ہے، ایک قول یہ ہے کہ مسجد میں سوال کرنا مکروہ نہیں ہے، بہ شرطیکہ مانگنے والا لوگوں کی گردنیں نہ پھلانگے اور نمازیوں کے آگے نہ گزرے، لیکن پہلا قول زیادہ احتیاط پر مبنی ہے۔"

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

"یُکْرَهُ اِعْطَاءُ السَّآئِلِ فِی الْمَسْجِدِ اِلَّا اِذَا لَمْ یَتَخَطَّ رِقَابَ النَّاسِ فِی الْمُخْتَارِ کَمَا فِی الْاِخْتِیَارِ وَمَتْنِ مَوَاهِبِ الرَّحْمٰنِ لِاَنَّ عَلِیًّا تَصَدَّقَ

بِخَاتِمِهٖ فِی الصَّلٰوۃِ فَمَدَحَہُ اللّٰہُ بِقَوْلِہٖ وَیُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ وَھُمْ رَاکِعُوْنَ"

(ترجمہ): مسجد میں سائل کو دینا مکروہ ہے، ہاں اگر وہ لوگوں کی گردنیں نہ پھلانگے تو پھر قول مختار کے مطابق وہ مکروہ نہیں ہے، اسی طرح "اختیار" اور "مواہب الرحمٰن" میں مذکور ہے، کیونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے نماز کی حالت میں انگوٹھی صدقہ کی تو اللہ تعالیٰ نے ان کی مدح میں قرآن مجید کی یہ آیت نازل کی "جو لوگ رکوع کی حالت میں زکوۃ دیتے ہیں" (در مختار حاشیہ رد المحتار ج ۵ ص ۳۶۸)۔

علامہ ابن عابدین شامی اس کی شرح میں لکھتے ہیں:

(ترجمہ): "اختیار" میں یہ مذکور ہے کہ اگر سائل نمازیوں کے سامنے سے گزرتا ہے اور لوگوں کی گردنیں پھلانگتا ہے تو اس کو دینا مکروہ ہے کیونکہ یہ لوگوں کو ایذا دینے پر معاونت ہے حتیٰ کہ کہا گیا ہے کہ اس طرح ایک پیسہ دینے کا کفارہ ستر پیسے بھی نہیں ہو سکتے، علامہ طحطاوی نے کہا ہے کہ یہ کراہت نمازیوں کی گردنیں پھلانگنے کی وجہ سے ہے جس کو ایذا لازم ہے اور جب وہاں گزرنے کے لئے جگہ کشادہ ہو تو پھر کوئی کراہت نہیں ہے، جیسا کہ اس عبارت کے مفہوم مخالف سے معلوم ہوتا ہے۔

صدر الشریعہ علامہ محمد امجد علی فتاویٰ امجدیہ جلد اول صفحہ نمبر ۲۵۲ پر لکھتے ہیں:

"مسجد میں سوال کرنے کے متعلق علماء حنفیہ کے دو قول ہیں: ایک یہ کہ مطلقاً ناجائز، دوسرا یہ کہ چار شرطوں کے ساتھ جائز ہے اور یہ شرطیں نہ ہوں تو ناجائز، شرط اول یہ کہ مصلی کے آگے سے نہ گزرے، دوم یہ کہ لوگوں کی گردنیں نہ پھلانگے، سوم یہ کہ الحاح کے ساتھ سوال نہ ہو (یعنی از حد گڑگڑا کر سوال نہ کرے)، چہارم یہ کہ ضرورت کے لئے سوال کرتا ہو، قول دوم کو بزازیہ وغیرہ میں اختیار فرمایا اور صاحب درالمختار نے بھی کتاب الحظر میں تنہا اسی قول کا ذکر کیا"۔

علامہ علاؤ الدین حصکفی فتاویٰ در مختار میں لکھتے ہیں:

(ترجمہ): جس شخص کے پاس ایک دن کی خوراک ہو، خواہ وہ خوراک بالفعل موجود

ہویا اس میں اس کو کما کر حاصل کرنے کی استعداد ہو یعنی یہ کہ وہ تندرست اور کمانے والا ہو، اس کے لئے خوراک کا سوال کرنا جائز نہیں ہے اور اس کو دینے والا اس کے حال کو جانتا ہو تو وہ گنہگار ہوگا کیونکہ وہ ایک حرام کی مدد کر رہا ہے، اور اگر وہ ضرورت مند ہو اور کپڑوں کا سوال کرے یا جہاد یا طلب علم میں مشغول ہونے کی وجہ سے خوراک کا سوال کرے اور وہ ضرورت مند بھی ہو تو یہ سوال جائز ہے اور اس کو دینا بھی جائز ہے۔(در مختار بر حاشیہ فتاوی شامی ج ۲ ص ۹۴، ۹۵)۔

خلاصہ کلام یہ کہ اگر سائل ضرورت مند ہے، ضرورت وقتی کے لئے بھی اس کے پاس نہیں، وہ کمانے کے قابل بھی نہیں، وقار اور عزت نفس کو قائم رکھتے ہوئے سوال کرتا ہے، نمازیوں کے آگے سے نہیں گزرتا، نمازیوں کی گردنیں نہیں پھلانگتا، گڑگڑا کر اپنی عزت نفس کو مجروح نہیں کرتا، زور زور سے بول کر نمازیوں کی نماز، دعا اور تلاوت وذکر میں مخل نہیں ہوتا یعنی انہیں ایذا نہیں پہنچاتا، تو اسے مسجد میں دینا جائز ہے۔

چنانچہ علامہ امجد علی لکھتے ہیں: ”خلاصہ یہ کہ سائل میں اگر وہ شرائط نہ پائی جائیں تو سوال بھی جائز نہیں اور دینا بھی ناجائز۔“

مسجد کے فنڈ سے امام مسجد کے بیٹے کو وظیفہ دینا؟

سوال : ہماری مسجد کے امام وخطیب تقریباً ۵۰ سال تک مسجد میں امامت وخطابت کرتے رہے اب انتقال ہو گیا ہے۔ امام صاحب مرحوم کے چار پانچ بیٹے ہیں جو دنیاوی تعلیم وغیرہ پڑھے ہوئے ہیں اور کلین شیو ہیں اور بر سر روزگار اور ملازمت وغیرہ کرتے ہیں پوچھنا یہ ہے کہ مسجد کمیٹی امام مرحوم کے صرف ایک بیٹے کو ماہانہ ہزار روپیہ دیتی ہے اور رمضان المبارک میں پانچ چھ ہزار روپیہ دیتی ہے مسجد کمیٹی کے کچھ ممبران اور نمازی حضرات نے اعتراض کیا ہے کہ مسجد فنڈ سے امام مرحوم کے بیٹے کو بلاوجہ رقم دینا شریعت کے خلاف ہے اور ناجائز ہے۔ ہماری اس مسئلہ میں قرآن وحدیث اور فقہ اسلامی کی روشنی میں راہنمائی فرمائیے۔

جواب : آپ کی مسجد کے متوفی امام وخطیب کے بیٹے چونکہ مسجد کی کسی خدمت سے وابستہ نہیں ہیں، جس کا معاوضہ انہیں مسجد فنڈ سے دیا جائے، اس لئے مسجد فنڈ سے انہیں ماہانہ یا سالانہ رقم یا وظیفہ دینا جائز نہیں ہے، البتہ اگر مسجد کی انتظامیہ کے افراد یا اہل محلہ اپنے مرحوم امام وخطیب کی طویل خدمات کی قدردانی یا ان سے حسن عقیدت کی بناء پر ان کی اولاد کے ساتھ تبرع اور احسان کے طور پر مالی مدد کرنا چاہتے ہوں تو وہ اس کے لئے الگ سے فنڈ قائم کریں اور خود بھی حصہ ڈالیں اور دوسروں کو بھی ترغیب دیں، جو رقم اس فنڈ میں جمع ہو جائے، وہ امام صاحب مرحوم کی اولاد کو دے دیں۔

☆...☆...☆

كتاب الصوم

کیا روزے کی زبانی نیت ضروری ہے؟

سوال: (۱) اگر کوئی شخص رمضان المبارک میں روزے کی نیت سے سحری کیلئے اٹھتا ہے، سحری کرتا ہے، باقاعدہ روزہ رکھتا ہے، لیکن زبانی روزے کی نیت نہیں کرتا، کیا اس کا روزہ ہو جائے گا؟

(۲) دل سے روزے کی نیت کی ہے، سحری کیلئے نہیں اٹھتا یا ارادہ تو تھا لیکن سویا ہوا رہ جاتا ہے، لیکن صبح اٹھ کر باقاعدہ روزہ رکھتا ہے، روزے سے رہتا ہے، البتہ لفظاً زبانی نیت نہیں کرتا، کیا اس طرح روزہ ادا ہو جائے گا؟

(ضیاء الرحمٰن، دستگیر کالونی۔ کراچی)

جواب: نیت دل کے ارادے کا نام ہے اور یہ قلب و ذہن کا عمل ہے۔ اس لئے عہد رسالت ﷺ میں ان عبادات کیلئے لفظاً نیت کے کلمات مذکور نہیں ہیں، اور ان نفوس قدسیہ کو اس کی ضرورت بھی نہیں تھی کیونکہ وہ ہر وقت اور ہر عبادت میں حضوریٔ قلب، توجہ الی اللہ اور اخلاص و للّٰہیت کی کیفیت سے سرشار رہتے تھے، وہ جسم و روح، قلب اور قالب کی یکسوئی، جمعیت اور عزیمت کے ساتھ دورانِ عبادت بلکہ ہر حال میں ذاتِ باری تعالیٰ کی جانب متوجہ رہتے تھے، اس لئے ان کو لفظاً نیت کی چنداں ضرورت ہی نہیں تھی، بلکہ اسی بناء پر بعض متقدمین نے لفظاً نیت کو بدعت کہا، لیکن متاخرین فقہاء کرام اور جمہور علماء امت نے جب یہ دیکھا کہ اب لوگوں میں "حضوریٔ قلب" اور "استحضارِ نیت" کی وہ کیفیت باقی نہیں رہی تو انہوں نے لفظاً نیت کو مستحسن و مستحب قرار دیا تاکہ عبادت گزار کا ذہن اگر کسی اور جانب متوجہ ہے یا بٹا ہوا ہے تو کلماتِ نیت ادا کرنے سے اصل مقصود یعنی عبادت کی جانب متوجہ ہو جائے۔ ان تمہیدی کلمات کے بعد گزارش ہے کہ مذکورہ بالا پہلی دو صورتوں میں جبکہ اس شخص کی نیت روزے کی ہے اور عملاً روزہ رکھ رہا ہے، تو لفظاً نیت کے کلمات ادا نہ کرنے کے باوجود روزہ صحیح طور پر ادا

ہو جائے گا اور اجر میں کوئی کمی واقع نہیں ہوگی، اور پہلی صورت میں تو اس کا سحری کیلئے اٹھنا اور سحری کرنا یہ بین طور پر اس کی نیت صوم پر دلالت کرتا ہے، ہاں البتہ اگر کوئی شخص نیت صوم و نیت عبادت کے بغیر بھوکا پیاسا رہے تو یہ روزہ نہیں ہوگا بلکہ فاقہ کشی ہوگی۔

روزہ اور غسلِ واجب

سوال: غسل واجب تھا، لیکن تاخیر سے اٹھنے کے باعث وقت کی اتنی گنجائش نہیں کہ غسل کر کے سحری کریں، تو کیا حالت جنابت میں سحری کرنا اور روزے کا شروع ہو جانا جائز ہے؟ (غلام یٰسین، کورنگی۔ کراچی)

جواب: اگر ایسی صورتحال درپیش ہو تو ہاتھ دھو کر اور کلی کر کے سحری کرلیں اور سحری ختم ہونے کے بعد سہولت کے مطابق غسل کرلیں، اس سے روزہ فاسد نہیں ہوتا، اسی طرح دن میں سوتے میں غسل واجب ہو جائے تو یہ روزے کے منافی نہیں ہے۔ البتہ غسل جنابت میں اتنی تاخیر نہ کی جائے کہ ایک فرض نماز کا وقت نکل جائے۔

سائرن، ٹی وی کے اعلان یا اذان پر سحری کا اختتام

سوال: سحری کا وقت ختم ہونے کا علم گھڑی، سائرن، ٹی وی، ریڈیو کے اعلان یا اذان پر روزہ بند کرنا چاہیے؟

جواب: سحری کا وقت ختم ہونے کا علم گھڑی، سائرن، ٹی وی، ریڈیو کے اعلان یا اذان جس ذریعے سے بھی ہو جائے فوراً کھانا پینا بند کر دینا چاہیے کیونکہ یہ تمام ذرائع ظن غالب کا سبب ہیں۔ ان میں سے جس ذریعے سے بھی معلوم ہو جائے، کھانا پینا فوراً بند کر دینا چاہیے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جب تک سائرن بج رہا ہے یا جب تک اذان جاری رہے ہم کھا پی سکتے ہیں یہ درست نہیں ہے، یہ تمام علامات اختتامِ سحر کی ہیں اس لئے سائرن یا اذان شروع ہوتے ہی کھانا پینا بند

کر دینا چاہیے کیونکہ اذان ختم ہونے میں بعض اوقات تین چار منٹ لگ جاتے ہیں، اختتامِ اذان تک کھانے پینے سے روزہ فاسد ہو جائے گا۔ احتیاط کرنی چاہیے۔

شوال المکرّم کے چھ روزے

سوال: شوال المکرّم کے چھ روزوں کی، جنہیں عرفِ عام میں شش عید کے روزے کہا جاتا ہے، شرعی حیثیت کیا ہے؟ کیا یہ روزے عید الفطر کے متصل رکھنا ضروری ہیں یا وقفے سے اور تسلسل کے بغیر بھی رکھے جاسکتے ہیں؟

(کامران قریشی، گلستان جوہر۔ کراچی)

جواب: صحیح مسلم میں حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”جس شخص نے رمضان المبارک کے روزے رکھے اور پھر اس کے بعد شوال کے چھ روزے رکھے، تو یہ ایسا ہی ہے جیسے اس نے عمر بھر روزہ رکھا“ یعنی اس کے صلے اور انعام کے طور پر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے اسے دائمی روزے کا اجر عطا ہوگا۔ اس حدیث مبارک کی رو سے عید الفطر کے بعد شوال المکرّم کے چھ روزے رکھنا مستحب ہے۔ علامہ ابن عابدین شامی نے فتح القدیر کے حوالے سے لکھا ہے کہ یہ چھ روزے عید الفطر کے بعد متصل اور مسلسل نہ رکھے جاسکیں تو متفرق طور پر رکھنا بھی باعثِ اجر ہے۔

روزے میں جھوٹ، غیبت اور چغلی کا حکم

سوال: روزے کی حالت میں اگر کوئی شخص جھوٹ بولے، غیبت کرے یا کسی کی چغلی کھائے تو کیا اس کا روزہ فاسد ہو جائے گا؟ (محمد ناصر چشتی، نارتھ کراچی)

جواب: جھوٹ، غیبت، چغلی وغیرہ ویسے بھی قبیح گناہ ہیں اور قرآن مجید میں ان گناہوں کی شدید مذمت بھی فرمائی گئی ہے اور ان پر عذاب کی وعید بھی سنائی گئی ہے۔ روزے کی حالت میں ان گناہوں کی شدت میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے، ان معاصی کے ارتکاب سے اگرچہ روزہ فقہی طور پر فاسد نہیں ہوتا، لیکن اس

عبادت کیلئے اللہ تعالیٰ نے جو بے پایاں اجر رکھا ہے، اس سے انسان محروم ہو جاتا ہے، چنانچہ احادیث مبارکہ میں ارشاد رسول ﷺ ہے کہ :

(۱) "جو شخص (روزہ رکھنے کے باوجود) جھوٹ بولنا اور جھوٹ پر عمل کرنا نہ چھوڑے تو اللہ تعالیٰ کو اس کی کوئی حاجت نہیں کہ وہ بھوکا اور پیاسا رہے۔"
(صحیح بخاری)

(۲) "جب تم میں سے کوئی روزے دار ہو تو نہ بیہودہ باتیں کرے اور نہ ہی چیخے چلائے، اگر کوئی اس کے ساتھ گالی گلوچ یا لڑائی جھگڑے پر اتر آئے تو کہہ دے (بھائی مجھے معاف کرو) میرا روزہ ہے۔" (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(۳) "بہت سے روزے دار ایسے ہیں جنہیں روزے سے بھوک اور پیاس کے سوا کچھ نہیں ملتا۔" (الغرض حقیقی اور کامل روزہ وہی ہے جس میں انسان تمام فواحش، منکرات اور برائیوں سے بچے)

روزے کی حالت میں خون دینا، آنکھ کان میں دوا ڈالنا وغیرہ

سوال : روزے کی حالت میں خون دینا، گلوکوز چڑھانا، آنکھ کان میں دوا ڈالنے کا شرعی حکم کیا ہے؟ (عائشہ اقبال و شازیہ ڈینیئل منظور کالونی۔ کراچی)

جواب : روزے کی حالت میں روزے دار کو خون یا گلوکوز چڑھانا، نس یا پٹھوں میں انجکشن لگانے سے روزہ ٹوٹ جائے گا۔ میں اس پر ایک مفصل مضمون لکھ چکا ہوں جو اسی کتاب میں "مفسدات صوم" کے عنوان سے شامل ہے۔ آنکھ میں دوا ڈالنے سے روزہ ٹوٹ جائے گا جبکہ کان میں دوا ڈالنے سے روزہ فاسد نہیں ہوگا۔ دلائل میرے مذکورہ بالا مضمون میں ملاحظہ فرمائیں۔

نوٹ : (یہ مضمون صفحہ ۱۸۹ پر موجود ہے)

روزے کی حالت میں خواتین کا میک اپ کرنا

سوال : روزے کی حالت میں خواتین کا میک اپ کرنا، لپ اسٹک لگانا، ہیر کٹنگ کرانا کیسا ہے؟ (عائشہ اقبال و شازیہ ڈینیئل، منظور کالونی۔ کراچی)

جواب: روزے کی حالت میں خواتین کا میک اپ کرنا جائز ہے، بشرطیکہ غیر محرم مردوں کے سامنے بے پردگی اور نمود و نمائش مقصود نہ ہو، لپ اسٹک لگانا جائز ہے بشرطیکہ اس کے اجزاء ترکیبی میں کوئی ناپاک چیز شامل نہ ہو اور اگر لپ اسٹک واٹر پروف ہے اور اس کے لگے رہنے کی وجہ سے ہونٹوں کی جلد وضو کے دوران پانی سے تر نہیں ہوتی تو وضو ادا نہیں ہوگا، اور ایسے ناتمام وضو سے نماز صحیح ادا نہیں ہوگی اور جو چیز کسی شرعی فرض کی صحت ادا میں مانع بن جائے وہ جائز نہیں ہے۔ ہیئر کٹنگ اگر معمولی مقدار میں ہو مثلاً لمبائی میں بالوں کو برابر رکھنا تو اس حد تک جائز اور اگر اتنی مقدار میں ہو جس سے مردوں کے ساتھ مشابہت پیدا ہو تو ناجائز ہے۔ حدیث پاک میں عورتوں کے ساتھ مشابہت اختیار کرنے والے مردوں اور مردوں کے ساتھ مشابہت اختیار کرنے والی عورتوں کو لعنت کا حقدار قرار دیا گیا ہے۔

روزے میں مسواک کا حکم

سوال: کیا روزے کی حالت میں مسواک کرنا جائز ہے' اسی طرح سے ٹوتھ پیسٹ یا ٹوتھ پاؤڈر سے دانتوں کو برش کرنے کا شرعاً کیا حکم ہے؟

(سید ذاکر شاہ' سعید آباد' بلدیہ ٹاؤن' کراچی)

جواب: روزے کی حالت میں مسواک کرنا جائز ہے بلکہ ہر وضو کے ساتھ مسواک کرنا سنت اور باعث اجر ہے' برش کا حکم بھی مسواک ہی کی طرح ہے' البتہ اس بات کی احتیاط کریں کہ پاؤڈر یا پیسٹ کے ذرات حلق میں نہ جائیں۔

روزے میں خون دینے کا حکم

سوال: کیا روزے کی حالت میں کسی ضرورت مند مریض کو خون دینا جائز ہے؟

(عنایت اللہ، فرنٹیر کالونی)

جواب: روزے کی حالت میں ضرورت مند مریض کو خون دینا جائز ہے، اسی طرح بلڈ ٹیسٹ کیلئے بھی خون نکالنا جائز ہے۔ البتہ اتنا زیادہ خون نہ نکالا جائے کہ روزے کی استطاعت باقی نہ رہے۔

روزے میں VICKS لگانے کا حکم

سوال: بعض اوقات نزلہ، زکام ہوتا ہے تو ناک میں Vicks لگاتے ہیں، کیا اس سے روزہ ٹوٹ جائے گا؟ (کامران۔ گلشن اقبال)

جواب: Vicks ایک قسم کا کیمیکل ہوتا ہے اسے جب ناک کے نتھنوں کے اندر لگاتے ہیں تو کیمیکل کے اجزاء حلق کے راستے اندر جاتے ہیں لہذا اس سے روزہ ٹوٹ جائے گا۔ البتہ ایسی Vicks جو سر درد کی صورت میں پیشانی پر لگائے جاتے ہیں یا کسی اور عضو میں درد ہو تو اس پر لگائے جاتے ہیں اس سے روزہ فاسد نہیں ہوتا، کیونکہ بدن کے مساموں کے ذریعے پانی، تیل یا کوئی اور چیز اندر جائے تو اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔

روزے میں آنکھ، ناک، کان میں دوا کا استعمال

سوال: حالت روزہ میں آنکھ، کان یا ناک میں دوا ڈال سکتے ہیں؟

(محمد عدیل الدین۔ کراچی)

جواب: عام طور پر موجودہ دور کے اہل فتاویٰ کی رائے یہ ہے کہ آنکھ میں دوا ڈالنے سے روزہ نہیں ٹوٹتا کیونکہ آنکھ اور حلق کے درمیان کوئی منفذ (Route) نہیں ہے اور ناک اور کان میں دوا ڈالنے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔ ناک کا مسئلہ تو بالکل واضح ہے، قدیم فقہاء کی رائے یہ تھی کہ چونکہ کان اور معدے کے درمیان منفذ (Route) ہے اس لئے کان میں دوا ڈالنے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے لیکن جدید طبّی تحقیق اور علم تشریح الاعضاء (اناٹومی) کی رو سے یہ رائے درست نہیں ہے، جدید تحقیق یہ ہے کہ آنکھ اور حلق کے درمیان منفذ (Route) ہے اور کان اور حلق کے درمیان منفذ (Route) نہیں ہے لہذا آنکھ میں دوا ڈالنے سے روزہ ٹوٹ جائے گا اور کان میں دوا ڈالنے سے نہیں ٹوٹے گا۔

مفسداتِ صوم و جدید مسائل

مسلم فقہی اصولوں اور جدید طبی تحقیقات کی روشنی میں بعض مسائل پر نظر ثانی کی ضرورت

قرآن و سنت اسلامی شریعت کی اساس اور فقہی احکام کے استنباط و استخراج کی بنیاد ہے۔ قرآن و سنت کی نصوص صریحہ قطعیہ ناقابل تنسیخ، غیر متبدل اور نافذالعمل رہیں گی۔ ہمارے ائمۂ مذاہب، ائمۂ مجتہدین اور فقہاء کرام نے ایسے اصول وضع کیے ہیں جن کی روشنی میں ہر دور میں پیش آنے والے شرعی مسائل کا حل تلاش کیا جاسکتا ہے، کیونکہ قرآن و سنت تاقیامت سر چشمۂ ہدایت اور مآخذ قانون رہیں گے۔

جدید طبی اور سائنسی تحقیقات کا دروازہ کھلا ہے اور کھلا رہے گا، مسلمہ فقہی اصول یہ ہے کہ جدید طبی اور سائنسی تحقیقات کی بابت ان شعبوں کے ماہرین کی آراء بطور سند اور حجت تسلیم کی جاتی رہیں گی، البتہ ان مسلمہ طبی اور سائنسی آراء کی روشنی میں ان کے بارے میں فقہی اصولوں کے تحت شرعی احکام کا اطلاق و انطباق فقہاء عصر کا کام ہے۔

علم تشریح الاعضاء (Anotomy) میں حیرت انگیز ترقی دور جدید کا کارنامہ ہے۔ آج تقریباً ہر انسانی عضو کی ہیئت اور ساخت کے بارے میں "عین الیقین" کی حد تک معلومات حاصل ہو چکی ہیں، جبکہ چند صدیاں قبل ان کے بارے میں محض ظن غالب کی بنیاد پر رائے قائم کر کے مسائل وضع کیے گئے تھے۔ مثلاً ایک مختلف فیہ مسئلہ فقہ حنفی کی تمام مستند و معتبر کتب فتاویٰ میں درج ہے کہ آیا "مثانۂ پیشاب" میں جو پیشاب جمع ہوتا ہے، یہ مسامات کے ذریعہ رس کر آتا ہے یا مثانے اور پیٹ کے درمیان کوئی سوراخ یا قدرتی نالی ہے؟ امام اعظم ابو حنیفہ کی رائے یہ تھی کہ کوئی نالی نہیں ہے۔ امام ابو یوسف کی رائے تھی کہ نالی ہے۔ امام محمد اس مسئلے میں متذبذب تھے، اسی ظن و تخمین کی بنیاد پر ان ائمہ عظام نے مسائل وضع فرمائے۔ اس مسئلے پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک جلیل القدر فقیہ علامہ کمال الدین ابن ہمام صاحب فتح القدیر نے فرمایا کہ یہ بنیادی طور پر فقہ کا نہیں بلکہ طب کا مسئلہ ہے، اگر اس عضو کی تشریح پر ان ائمہ کا اتفاق ہوتا تو ان کا فقہی مسئلہ وضع کرنے میں بھی کوئی اختلاف واقع نہ ہوتا۔

اس تمہید کے بعد گزارش ہے کہ صحیح بخاری اور دیگر کتب احادیث میں فساد صوم کا جو

اصل الاصول رسول اللہ ﷺ سے منقول ہے، وہ یہ ہے کہ : ”روزہ (بدن میں) کسی چیز کے داخل ہونے سے ٹوٹتا ہے، خارج ہونے سے نہیں ٹوٹتا۔“ ہمارے قدیم فقہاء کی ایک رائے یہ تھی کہ دماغ اور معدے کے درمیان نالی (Passage) ہے، لہذا اگر کوئی چیز خارج سے دماغ میں پہنچ گئی تو اس راستے سے معدے میں از خود پہنچ جائے گی۔ پس ثابت ہوا کہ دماغ میں کسی سوراخ یا گہرے زخم کے ذریعے دوا یا غذا پہنچنے سے روزہ ٹوٹ جائے گا، اب تازہ ترین طبی تحقیق یہ ہے کہ دماغ اور معدے کے درمیان کوئی روٹ یا نالی نہیں ہے، لہذا اس قطعی طبی تحقیق کی روشنی میں علماء کو یہ فتویٰ دینا چاہئے کہ دماغ میں کوئی دوا یا غذا پہنچنے سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔

معدے تک کوئی دوا یا غذا پہنچنے کے منافذ طبعیہ (Physical Passage or Route) منہ، ناک، دبر اور قبل ہیں۔ ہمارے قدیم فقہاء کی رائے یہ تھی کہ کان کے راستے سے معدے تک نالی ہے، جس کی وجہ سے کان میں دوا یا تیل ٹپکانے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے اور ہمارے موجودہ دور کے فقہاء بھی یہی فتویٰ دیتے چلے آرہے ہیں، لیکن تازہ ترین طبی تحقیق یہ ہے کہ کان اور معدے کے درمیان کوئی منفذ (Route) نہیں ہے، لہذا ہمارے اہل فتویٰ کو اس مسئلے پر نظر ثانی کر کے یہ فتویٰ دینا چاہئے کہ کان میں دوا یا تیل ٹپکانے سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔ ہاں اگر کسی کے کان کا پردہ پھٹا ہوا (Damage) ہے تو پھر کان میں دوا یا تیل ڈالنے سے روزہ ٹوٹ جائے گا۔

اسی طرح ہمارے قدیم فقہاء کا خیال تھا کہ آنکھ اور حلق کے درمیان کوئی منفذ نہیں ہے، لہذا اب تک ہمارے علماء کرام یہی فتویٰ دیتے چلے آرہے ہیں کہ آنکھ میں سرمہ لگانے اور دوا ٹپکانے سے روزہ نہیں ٹوٹتا، لیکن تازہ ترین طبی تحقیق یہ ہے کہ آنکھ اور حلق کے درمیان راستہ ہے۔ آنکھ کے ڈھیلے کے پیچھے غدودوں سے قدرت کے خودکار نظام کے تحت نمکین پانی رستا رہتا ہے جو دافع عفونت (Antiseptic) اور جراثیم کش (Antibiotic) ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی خلاقی کا کرشمہ ہے کہ یہ نمکین پانی آنکھ کی تطہیر کرتا ہے، مختلف عوارض سے اس کا تحفظ کرتا ہے اور آنکھ کے گوشے میں دو باریک نالیوں کے ذریعے حلق میں چلا جاتا ہے، جبکہ

ہمارے قدیم فقہاء کا خیال یہ تھا کہ حلق میں جو دوا یا سرمے کا ذائقہ محسوس ہوتا ہے یہ مساموں کے ذریعے حلق میں اترتے ہیں، لہذا جب روٹ یا نالی موجود ہے، اس کا سائز یا قطر (Diameter) موضوع بحث نہیں ہے تو اب ہمارے علماء کو یہ فتویٰ دینا چاہئے کہ آنکھ میں دوا ٹپکانے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔ قیاس کا تقاضا یہ تھا کہ اس اصول کے تحت سرمہ لگانے سے بھی ٹوٹتا، لیکن چونکہ رسول اللہ ﷺ نے روزے کی حالت میں سرمہ لگانے کی اجازت دی ہے اور وہ شارعِ مجاز ہیں۔ لہذا خلاف قیاس استحساناً سرمے کے جواز کا فتویٰ دیا جائے گا۔

دمہ (Isthmus) کے مریض کے پھیپھڑوں کی نالیاں سکڑ جاتی ہیں اور انہیں سانس لینے میں شدید دشواری پیش آتی ہے ایسی صورتحال میں وہ (Inhaler) استعمال کرتے ہیں جس کے ذریعے ناک اور حلق کے راستے گیس اور مائع باریک بوندوں کی شکل میں دوا کے اجزاء مریض کے پھیپھڑوں میں پہنچتے ہیں اور نالیاں کھل جاتی ہیں اور مریض آسانی سے سانس لینے لگتا ہے۔ لہذا Inhaler کے استعمال سے روزہ ٹوٹ جائے گا۔ اگر دمہ کا مرض اس اسٹیج پر ہے کہ Inhaler کے استعمال کے بغیر مریض کا دن گزارنا مشکل ہے تو وہ معذور ہے اور روزے کے بدلے میں فدیہ دے۔

ہمارے قدیم فقہاء کرام نے مفسدات صوم کی تین صورتیں بتائی ہیں، ایک یہ کہ صورتاً اور معنیً دونوں طرح وہ مفسد پایا جائے، جیسے مباشرت، دوسرے یہ کہ صرف معنیً مفسد پایا جائے صورتاً نہ ہو، جیسے استمنا بالید، تیسرے یہ کہ محض صورتاً پایا جائے معنیً یعنی مقصود کے اعتبار سے نہ ہو، جیسے بوس وکنار سے انزال ہو جائے۔ پہلی صورت میں کفارہ ہے اور پچھلی دو صورتوں میں صرف قضا لازم ہے۔ اسی طرح ٹھوس یا مائع خوراک میں یہ تینوں صورتیں صادق آتی ہیں۔ اول یہ کہ صورتاً اور معنیً دونوں طرح وجہ فساد پائی جائے۔ جیسے انسان معمول کے مطابق روزے کی حالت میں ٹھوس یا مائع غذا منہ کے ذریعے کھائے یا پیئے، دوم یہ کہ محض صورتاً وجہ فساد پائی جائے جیسے کوئی شخص کاغذ چبا کر حلق سے اتار لے اور سوم یہ کہ صرف معنیً یعنی مقصدیت کے اعتبار سے مفسد پایا جائے۔ جیسے پٹھوں (Muscular) میں یا رگوں (Veins) میں انجکشن لگایا جائے۔ پہلی صورت میں کفارہ لازم آئے گا اور آخری دو صورتوں میں قضا لازم آئے گی۔ انجکشن کے مفسدِ صوم ہونے کے بارے میں ہمارے دور

حاضر کے علماء مختلف الرائے ہیں، جو اس نظریے پر سختی سے کاربند ہیں کہ منفذ معتاد (Usual Route) کے ذریعے (یعنی منہ، ناک وغیرہ) اگر معدے میں کوئی چیز پہنچے گی تو روزہ ٹوٹ جائے گا ورنہ نہیں، وہ بدستور یہی رائے رکھتے ہیں کہ انجکشن سے روزہ نہیں ٹوٹتا کیونکہ انجکشن سے براہ راست معدے تک کوئی چیز نہیں پہنچتی۔ لیکن جو علماء وجہ فساد یا ذریعۂ فساد کی معنویت اور مقصدیت کو پیش نظر رکھتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ نس یا پٹھے میں انجکشن لگانے سے روزہ ٹوٹ جائے گا کیونکہ عام طریقے سے غذا معدے میں پہنچنے کے بعد تحلیل (dissolve) ہوتی ہے اور اس کے صالح اجزاء گلوکوز، حیاتین (Vitamins)، لحمیات (Proteins) اور معدنیات (کیلشیم، فاسفورس، آئرن وغیرہ) کی شکل میں خون میں شامل ہو کر انسان کی رگوں، پٹھوں اور دیگر اعضاء میں پہنچ کر انھیں قوت و طاقت اور قوام (Sustenance) عطا کرتے ہیں، جو مقصد بالواسطہ اور طویل جسمانی عمل ہضم (Digestion) اور ترسیل خون کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔ بالکل وہی مقصد انجکشن کے ذریعے براہ راست حاصل ہو جاتا ہے، لہٰذا اہل فتویٰ علماء کرام سے ہماری گزارش ہے کہ وہ اس مسئلے پر از سر نو غور فرمائیں اور انجکشن کو معنیً مفسدِ صوم قرار دیں۔ ماہرین فقہ علماء کرام جدید ماہرین طب سے رابطہ کر کے ہماری پیش کردہ ان طبی و سائنسی معلومات اور ان سے اخذ کردہ فقہی نتائج پر بہتر طور پر رائے قائم کر سکیں گے۔ علم و اجتہاد اور تفقہ کا دروازہ نہ کبھی بند ہوا ہے اور نہ بند ہوگا۔ ایسی جدید طبی و سائنسی تحقیقات جو علم الیقین اور عین الیقین کی حد تک طے شدہ ہیں، انہیں تسلیم کر کے ان پر مسلمہ فقہی اصولوں کے اطلاق و انطباق (Application) کے سلسلے میں بالخصوص ایسے مسائل میں غور و فکر ہمارا دینی فریضہ ہے جو ہمارے قدیم فقہاء کرام نے محض ظن و تخمین (Estimation) کی بنیاد پر طے فرمائے تھے۔ انجکشن کے مفسد صوم ہونے کی تفصیلی بحث مع ادلہ شرح صحیح مسلم جلد اول و جلد ثالث (مصنفہ علامہ غلام رسول سعیدی) میں مطالعہ کی جا سکتی ہے۔ حدیث و فقہ کے تفصیلی حوالہ جات سے ہم نے دانستہ احتراز کیا ہے کیونکہ اخبار کے صفحات اور مزاج اس کا متحمل نہیں ہو سکتا۔

بچے کی ولادت کے کتنے دن بعد روزہ رکھا جائے

سوال: میری بیوی کے بیٹا ہوا اور جلد وفات پا گیا، اگر اس کا خون پندرہ یا بیس دن میں بند ہو جائے تو کیا وہ رمضان کا روزہ رکھ سکتی ہے اور شوہر کی اس سے قربت ہو سکتی ہے؟ (عبداللہ خان۔ کراچی)

جواب: بچے کی پیدائش کے بعد زچہ کو جو خون جاری ہوتا ہے اسے نفاس کہتے ہیں اس کی زیادہ سے زیادہ ممکنہ مدت چالیس دن ہے، خواہ بچہ پیدا ہوتے ہی مر گیا ہو یا زندہ ہو، یعنی اگر بچے کی پیدائش کے چالیس دن گزرنے کے بعد بھی خون جاری رہے تو یہ نفاس کا خون نہیں ہے بلکہ یہ نسوانی بیماری ہے۔ لہذا زچہ کو ایسی صورت میں چالیسواں دن پورا ہونے کے بعد غسل کر کے پاک ہو جانا چاہئے۔ وہ روزے بھی رکھے اور نماز بھی پڑھے، ہر نماز کیلئے تازہ وضو کرے، خون بہنے میں وقفہ نہ بھی ہو تو نماز اور روزہ ادا ہو جائیں گے۔ لیکن نفاس کی کم از کم مدت کوئی مقرر نہیں ہے، یہ مختلف اشخاص کی جسمانی صلاحیت، عادت، مزاج اور صحت پر موقوف ہے۔ لہذا جب زچہ کا خون، جو بچے کی پیدائش کے بعد جاری ہوتا ہے، بند ہو جائے، خواہ پانچ دن بعد ہو، دس دن بعد ہو یا بیس دن بعد ہو، اسی دن سے نفاس کی مدت ختم ہو جائے گی اور ایسی خاتون کو غسل کر کے پاک ہو جانا چاہئے اور نماز و روزے کا سلسلہ شروع کر دینا چاہئے، چالیس دن کی مدت پوری کرنا ضروری نہیں ہے۔ اسی طرح پاک ہونے کے بعد اس سے شوہر کی قربت بھی جائز ہے۔

قضا روزے

سوال: گزشتہ سال کے قضاء روزے اگلے رمضان المبارک کے آغاز سے قبل ہی ادا کرنے ضروری ہیں یا بعد میں بھی ادا کئے جاسکتے ہیں ان کی نیت کس طرح کی جاسکتی ہے اور قضا نمازوں کیلئے بھی شرعی طور پر کیا حکم ہے؟

(ثوبیہ نازش و عائشہ اقبال، ناظم آباد۔ کراچی)

جواب : رمضان المبارک کے قضا روزے ، رمضان کے بعد اولین فرصت میں ادا کرنے چاہیئں کسی کے پاس یہ گارنٹی نہیں ہے کہ وہ اگلے سال رمضان تک لازمی طور پر زندہ رہے گا۔ تاہم اگر کسی نے بد قسمتی سے گزشتہ رمضان المبارک کے قضا روزے آئندہ رمضان تک ادا نہیں کیئے تو اس کے بعد ادا کرے۔ قضا نمازیں بھی اولین فرصت میں ادا کرے۔

ایاّم مخصوص میں چھوڑے ہوئے روزوں کی قضا اور نماز کی معافی

سوال : میں ایک ڈاکٹر ہوں اور ایک مسئلے کیلئے عرصے سے پریشان ہوں، ایاّم مخصوص میں عورت کی جو نمازیں رہ جاتی ہیں وہ معاف ہیں اور اس پر ان کی قضا لازم نہیں ہے جبکہ ان ایاّم میں اس کے جو روزے چھوٹ جاتے ہیں، اس پر ان کی قضا لازم ہے۔ دونوں کے احکام میں تفاوت کیوں ہے جبکہ دونوں بدنی عبادات ہیں۔

جواب : صحیح مسلم میں حدیث ہے۔ حضرت معاذہ بیان کرتی ہیں کہ میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا "کیا وجہ ہے کہ حائض عورت ایاّم مخصوص میں چھوٹے ہوئے روزوں کی قضا کرتی ہے مگر ان دنوں کی چھوٹی ہوئی نمازوں کی قضا نہیں کرتی ؟" حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا "کیا تو حروریہ ہے ؟" (معاذہ کہتی ہیں کہ) میں نے جواباً عرض کیا "میں حروریہ نہیں ہوں۔ میں تو محض مسئلہ معلوم کرنا چاہتی ہوں۔" حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا "حضور انور ﷺ کے زمانے میں جب ہمیں یہ ایاّم آتے تو ہمیں روزوں کی قضا کا حکم تو دیا جاتا تھا اور نمازوں کی قضاء کا حکم نہیں دیا جاتا تھا۔"

صحیح مسلم ہی کی ایک اور حدیث میں ہے۔ حضور ﷺ نے فاطمہ بنت حبیش سے فرمایا "جب تمہیں حیض آئے تو نماز کو چھوڑ دو اور جب ایاّم ختم ہو جائیں تو غسل کر کے (پاک ہو جاؤ اور) نماز شروع کر دو۔"

حدیث میں "حروریہ" کا تذکرہ ہے، اس سے مراد خوارج ہیں، کیونکہ کوفہ کے قریب ایک مقام "حروراء" تھا جہاں پہلی بار جمع ہو کر خوارج نے اپنی تنظیم قائم کی تھی۔ یہ اسلام کی

جمعیت سے خروج کرنے والا ایک انتہا پسند گروہ تھا اور یہ اپنے دور کے "انارکسٹ" تھے۔ اس لئے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے معاذہ سے پوچھا تم اس طرح کا سوال کر رہی ہو، کہیں تم خارجی تو نہیں ہو؟ اس سے معلوم ہوا کہ پوری امت کا اس بات پر اجماع ہے کہ عورت پر ایّام مخصوص میں چھوٹی ہوئی نمازوں کی قضا نہیں ہے۔ عہد رسالت اور عہد صحابہ میں بھی یہی سب کا عقیدہ و عمل تھا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے زیادہ مستند قول اس سلسلے میں اور کس کا ہو سکتا ہے؟ صرف عہد خلافت علی رضی اللہ عنہ میں خارجیوں کا ایک اقلیتی انتہا پسند گروہ پیدا ہوا جس نے یہ نظریہ قائم کیا کہ ایّام مخصوص کی چھوٹی ہوئی نمازوں کی بھی قضا ہے مگر یہ باطل فرقہ ختم ہو گیا اور ان کے نظریات پر آج کوئی بھی کار بند نہیں ہے۔

رہا یہ سوال کہ اس میں کیا حکمت ہے کہ نمازوں کی قضا نہیں ہے اور روزوں کی قضا ہے تو اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ "اس نے تم پر دین میں تنگی نہیں رکھی۔" (الحج: ۷۸)

اور فرمان باری تعالیٰ ہے:

يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ "اللہ تعالیٰ تمہارے لئے آسانی چاہتا ہے، وہ تمہارے لئے دشواری نہیں چاہتا۔" (البقرہ: ۱۸۵)

فرمان رسول ہے "دین کو آسان کر کے پیش کرو اور اس میں لوگوں کیلئے دشواریاں نہ پیدا کرو۔" تو اس میں حکمت یہی سمجھ میں آتی ہے کہ روزے سال میں صرف ایک ماہ رمضان کے فرض ہیں لہذا روزوں کی قضا کو حائض پر لازم کر دیا گیا، اور نماز تو مستقل اور دائمی فریضہ ہے لہذا حائض پر اس کی قضا لازم کرنے میں اس کیلئے دشواری ہوتی، اس لئے عورتوں کیلئے رعایت رکھی گئی ہے۔ بندگی غیر مشروط اطاعت کا نام ہے۔ احکام شریعت کی حکمت تک ہمارے ذہن کی رسائی ہو جائے تو یہ ہماری سعادت ہے اور کبھی ہم حکمت کو نہ سمجھ پائیں تو یہ ہمارے ذہن نارسا کی کوتاہی ہوتی ہے۔

تین روزہ، پانچ روزہ یا دس روزہ تراویح

سوال: کیا تاجر حضرات تین روزہ، پانچ روزہ یا دس روزہ تراویح ادا کر سکتے ہیں؟ شرعی طور پر کیا پورے رمضان المبارک کے مہینے میں تراویح ادا کرنا ضروری ہے، شرعی حکم بیان کیجئے؟ (ثوبیہ نازش، عائشہ اقبال مسلم لیگ کوارٹرز، ناظم آباد۔ کراچی)

جواب: تین دن سے کم یعنی ایک یا دو دن میں قرآن ختم کرنا مکروہ ہے۔ کم از کم تین دن یا اس سے زیادہ دنوں میں مثلاً پانچ، سات، دس دن وغیرہ میں قرآن مجید ختم کر سکتے ہیں، بشرطیکہ قرآن مجید صحیح پڑھا جائے، الفاظ کی ادائیگی صحیح ہو اور سننے والے کی سمجھ میں آئے۔ اگر تین روزہ یا پانچ روزہ تراویح کا اہتمام اس لئے کیا جاتا ہے کہ رمضان المبارک میں ایک سے زیادہ قرآن مجید نماز تراویح میں پڑھنے اور سننے کی سعادت حاصل ہو جائے تو یہ خیر کا باعث ہے، بڑی سعادت کی بات ہے۔ لیکن اگر اس کا مقصد یہ ہو کہ تین، پانچ، سات یا دس راتوں میں قرآن مجید ختم کر کے بقیہ ایام رمضان میں تراویح نہیں پڑھیں گے تو یہ اجر سے محرومی کا باعث ہے، خواہ دکانداری، تجارت اور کاروبار کیلئے ایسا کریں یا محض جسم و جان کی راحت کیلئے یہ گناہ ہے، کیونکہ تراویح کی نماز سنت مؤکدہ ہے اور پورے رمضان کیلئے ہے، مردوں اور عورتوں سب کیلئے تراویح پڑھنا سنت ہے جو لوگ عذر شرعی یعنی انتہائی ضعیفی یا بیماری کی وجہ سے روزے نہ رکھ سکتے ہوں یا نہ رکھ رہے ہوں، وہ بھی تراویح پڑھیں۔ نماز تراویح روزوں کے تابع نہیں ہے بلکہ مستقل عبادت ہے۔

سوال: آج کل کراچی میں پانچ روزہ، چھ روزہ یا دس روزہ تراویح اور ختم قرآن کا رواج بہت عام ہو گیا ہے، کیا یہ طریقۂ کار شرعاً درست ہے؟

(محمد ناصر خان چشتی، گلشن اقبال۔ کراچی)

جواب: پورے رمضان المبارک کے ماہ مقدس میں نماز تراویح باجماعت پڑھنا سنت ہے۔ پانچ روزہ، چھ روزہ یا دس روزہ تراویح کا جہاں انتظام ہوتا ہے، اگر اس کے شرکاء کی

نیت یہ ہو کہ اس ختم قرآن کے بعد، بقیہ رمضان المبارک نماز تراویح نہیں پڑھیں گے یا باجماعت نہیں پڑھیں گے تو ان کا یہ طریقۂ کار غلط ہے اور یہ فکر درست نہیں ہے کیونکہ اس طرح قرآن مجید کے سماع کی سنت تو پوری ہو جائے گی، لیکن رمضان المبارک کے باقی ایّام کیلئے تراویح کی سنت کا تارک ہوگا۔ ہاں البتہ اگر اس کے بعد بقیہ ایّام میں یہ لوگ باقاعدگی سے کسی مسجد میں تراویح باجماعت پڑھتے ہیں تو پھر کوئی حرج نہیں ہے، بشرطیکہ تین، پانچ، چھ یا دس ایّام میں قرآن مجید صحیح پڑھا جاتا ہو۔

رمضان المبارک کے عشرۂ اخیرہ میں شبینوں کا اہتمام

سوال: رمضان المبارک کے عشرۂ اخیر میں عام طور پر سہ روزہ، پنج روزہ یا ہفت روزہ شبینے پڑھے جاتے ہیں، یہ شبینے باجماعت نوافل کی شکل میں پڑھے جاتے ہیں، کیا یہ طریقہ شرعاً درست ہے؟ (محمد وقاص جعفر، گلشن اقبال۔ کراچی)

جواب: اصولی طور پر نوافل کی جماعت کیلئے "تداعی" یعنی باقاعدہ اعلان کر کے اور ترغیب دے کر بلانا منع ہے، کیونکہ اس سے ہو سکتا ہے کہ کسی خاص نفلی عبادت کو لوگ فرض وواجب کے برابر اہمیت دیں یا فرض وواجب کا درجہ دے دیں اور صرف شارع ہی اس کا مجاز ہے، اس لئے احتیاط کی بناء پر اس سے منع کیا گیا ہے۔ لیکن شبینوں کے بارے میں فرض، واجب یا سنت کا تاثر کسی کے ذہن میں نہیں ہوتا سب اسے نفلی عبادت سمجھتے ہیں باجماعت، ذوق وشوق کے ساتھ شریک ہوتے ہیں، آخری عشرۂ رمضان المبارک میں "قیام اللیل" کی سعادت بھی مل جاتی ہے اور "شبِ قدر" کی برکات کو پانے کے شوق کی بھی تسکین ہوتی ہے۔

عورتوں کا اجتماعی اعتکاف

سوال: عورتوں کا اجتماعی اعتکاف کیسا ہے؟ جبکہ تمام عورتیں کسی دوسرے مقام پر یا کسی دوسری عورت کے گھر میں جبکہ وہ خود بھی معتکفہ ہے؟ اعتکاف کی جگہ شرعی

پردہ کا اہتمام بھی ہے، اعتکاف کی جگہ محفوظ بھی ہے اور اعتکاف کی جگہ تمام سہولتیں موجود ہیں؟ (کلیم بھائی، گلشن اقبال۔ کراچی)

جواب: اعتکاف اپنی حقیقت اور روح کے اعتبار سے عزلت نشینی اور خلوت گزینی کی عبادت ہے کہ بندۂ مومن سب سے کٹ کر اللہ تعالیٰ کی ذات سے لو لگائے اور اسی کے ذکر و فکر میں مگن رہے، اگر صحیح تربیت کا اہتمام نہ ہو تو اجتماعیت سے اس کی روح مجروح ہوتی ہے، تاہم خواتین کسی ایک مکان میں اعتکاف کر سکتی ہیں، بشرطیکہ (۱) وہاں شرعی حجاب کا اہتمام ہو۔ (۲) غیر محرم مردوں کا گزر نہ ہو۔ (۳) وہ شادی شدہ ہونے کی صورت میں اپنے شوہروں سے، ورنہ اپنے والدین سے اجازت لے کر بیٹھیں۔ (۴) اور اعتکاف کے دیگر مسائل اور قیود شرعیہ کی پابندی کریں۔

مسجد الحرام میں اعتکاف کے مسائل

سوال: میرا عمرے پر جانے کا ارادہ ہے اور میری یہ بھی تمنا ہے کہ میں مسجد الحرام میں رمضان المبارک کے عشرۂ اخیرہ میں اعتکاف بیٹھوں، تو اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ (۱) وہاں ہوٹل پر جاکر سحر و افطار کر سکتے ہیں جبکہ کھانا لا کر دینے والا کوئی نہ ہو۔ (۲) وہاں مُعْتَکِفْ کیلئے جگہ مخصوص نہیں ہوتی کیا جگہ تبدیل کر سکتے ہیں۔ (۳) کیا ایّام اعتکاف میں بکثرت طواف کر سکتے ہیں۔ (۴) معتکف کیلئے حرم میں وہی پابندیاں ہیں جو یہاں ہیں؟

(جاوید اختر، فیڈرل بی ایریا۔ کراچی)

جواب: سب سے پہلے تو یہ سمجھ لیجئے کہ اعتکاف حرم کعبہ میں کیا جائے، مسجد نبوی میں یا اپنے محلہ کی مسجد میں، مسائل و احکام شرعی سب جگہ یکساں ہیں۔ شرعاً پوری مسجد معتکف (جائے اعتکاف) ہوتی ہے، لہٰذا آپ کو اجازت ہے کہ پوری مسجد میں جہاں جگہ ملے بیٹھ جائیں، ضرورت کے وقت لیٹ جائیں، جہاں چاہیں نماز

پڑھیں اور جہاں چاہیں تلاوت واذکار کریں، کسی خاص جگہ کی پابندی نہیں ہے۔
چونکہ بیت اللہ اور مطاف (جائے طواف) بھی "مسجد الحرام" میں شامل ہیں اور طواف عبادت ہے، اس لئے آپ ایّام اعتکاف میں جس قدر طواف کر سکیں کریں، اس سے بڑی سعادت اور عبادت کیا ہوگی۔ جہاں تک سحر و افطار کے کھانے کا مسئلہ ہے تو ہم نے سنا ہے کہ وہاں افطار کا انتظام بہت ہوتا ہے اگر خدانخواستہ ایسا کوئی انتظام نہیں ہو سکے تو پھر آپ جائیں اور ہوٹل سے پارسل کھانا خرید کر لے آئیں اور حرم پاک میں واپس آکر وہیں بیٹھ کر کھائیں۔ ضرورت سے زیادہ حرم پاک سے باہر نہ ٹھہریں اور نہ کسی سے کلام کریں، غسل واجب کیلئے اور قضاء حاجت کیلئے آپ جائیں، غسل مسنون کیلئے نہ جائیں۔

"رویت ہلال" چاند کے چھوٹا بڑا ہونے کا مسئلہ

سوال: بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ مرکزی رویت ہلال کمیٹی ۲۹ شعبان کو اعلان کرتی ہے کہ رمضان کا چاند نظر نہیں آیا، پرسوں رمضان کا پہلا روزہ ہوگا، اگلے دن شام کو کبھی ایسا ہوتا ہے کہ چاند نسبتاً بڑا نظر آتا ہے اور کافی دیر تک مطلع پر رہتا ہے، لوگ یہ دیکھ کر شبہے میں پڑ جاتے ہیں کہ یہ شاید دوسرے دن کا چاند ہے اور لگتا ہے کہ رویت ہلال کمیٹی کا اعلان درست نہیں تھا، ایک روزہ ضائع ہوگیا، اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ (امیر احمد شاہ، ہزارہ)

جواب: صحیح مسلم میں حدیث ہے ابوالبختری کہتے ہیں کہ ہم سفر عمرہ میں تھے، جب ہم وادی نخلہ میں پہنچے تو ہم نے ایک دوسرے سے کہا کہ دیکھو یہ (رمضان کا) چاند ہے اور بعض نے خیال ظاہر کیا کہ یہ تیسری رات کا چاند ہے اور بعض نے کہا کہ یہ دوسری رات کا چاند ہے، ہماری عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنھما سے ملاقات ہوئی تو ہم نے ان سے چاند کے بارے میں اس اختلاف رائے کا ذکر کیا، حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنھما نے ہم سے دریافت فرمایا کہ تم نے چاند کس رات کو دیکھا تھا؟ ہم لوگوں نے کہا کہ فلاں رات کو دیکھا تھا، انہوں نے کہا کہ

رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ ''اللہ تعالیٰ نے (تمہارے) دیکھنے کیلئے اسے بڑھادیا ہے، وہ حقیقت میں اسی رات کا چاند ہے، جس رات تم لوگوں نے اسے دیکھا تھا۔'' اس سے معلوم ہوا کہ شریعت کی رو سے طلوع ماہ رمضان یا شوال وغیرہ کیلئے چاند کی رویت کا اعتبار ہے۔ چاند کے چھوٹے بڑے ہونے (یعنی سائز) کا کوئی اعتبار نہیں ہے اور نہ ہی اس امر کا اعتبار ہے کہ چاند مطلع پر کتنی دیر رہا۔ ہمارے لئے تو فرمان رسول ﷺ ہی آخری اور قطعی حجت ہے، ارشاد رسول ﷺ سننے کے بعد بھی تردد کا اظہار کرنا، شکوک میں مبتلا ہونا، یہ مومن کی شان نہیں ہے۔ لیکن کوئی شخص خالص سائنسی اور فنی بنیاد پر، یعنی علم موسمیات و فلکیات کی رو سے بھی اس مسئلے کو جاننا چاہئے تو سائنس سے بھی حدیث پاک کی تائید ہوتی ہے۔ ماہرین فلکیات بتاتے ہیں کہ بعض اوقات ۲۹ تاریخ کو چاند کا ظہور و نمود تو مطلع پر ہو جاتا ہے، لیکن اس کا درجہ اور وقت اس قدر کم ہوتا ہے کہ اس کی رویت ممکن نہیں ہوتی اور تیس دن پورے ہونے کے بعد جب چاند طلوع ہوتا ہے تو چونکہ اسکی عمر بھی زیادہ ہوتی ہے (یعنی ۴۰ گھنٹے یا زائد)، بلند درجے پر بھی ہوتا ہے، سائز بھی بڑا ہو جاتا ہے، اور مطلع پر زیادہ دیر تک نظر بھی آتا ہے، لہٰذا جو لوگ پوری دینی و سائنسی معلومات نہیں رکھتے، وہ خواہ مخواہ شکوک و شبہات میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

یومِ شک کا روزہ

سوال: ''یوم شک'' کے روزے سے کیا مراد ہے، اس سے کیوں منع کیا گیا ہے؟

(فرحان، دستگیر کالونی۔ کراچی)

جواب: بعض لوگ یہ کرتے ہیں کہ اگر ۲۹ شعبان کو رمضان المبارک کا چاند نظر نہ آئے تو اگلے دن روزہ رکھ لیتے ہیں کہ اگر رمضان بالفرض شروع ہو چکا ہو تو رمضان کا فرض روزہ ہو جائے گا، ورنہ نفلی روزے کا ثواب تو مل ہی جائے گا، یعنی خود روزہ رکھنے والا روزے کی حیثیت کے بارے میں متردد ہوتا ہے، اسے ''یوم شک'' کا روزہ کہتے ہیں، اس سے حضور ﷺ نے منع فرمایا ہے، عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جس نے ''یوم شک'' کا روزہ رکھا اس نے رسول اللہ ﷺ کی نافرمانی

کی (مشکوٰۃ، بحوالہ ابو داؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ) فرضی عبادت قطعی اور یقینی نیت کے ساتھ ادا کی جانی چاہئے اور رسول اللہ ﷺ کا واضح ارشاد ہے کہ (رمضان کا) چاند دیکھ کر روزے رکھو اور (شوال کا) چاند دیکھ کر روزہ چھوڑ دو، اگر (۲۹ شعبان یا ۲۹ رمضان کو) مطلع ابر آلود ہو (اور چاند نظر نہ آئے) تو تیس دن کا مہینہ پورا کرلو (مشکوٰۃ بحوالہ صحیح بخاری و صحیح مسلم)

کیا مسلسل تیس دن کے کئی قمری مہینے ہو سکتے ہیں؟

سوال: کیا مسلسل تین چار اسلامی مہینے تیس تیس دن کے ہو سکتے ہیں یا مسلسل کئی اسلامی مہینے انتیس دن کے ہو سکتے ہیں یا ازروئے قرآن و سنت ایسا نہیں ہو سکتا؟

(قاری محمد صدیق، خطیب مسجد خلفاء راشدین، گلشن اقبال۔ کراچی)

جواب: پہلے تو یہ غلط فہمی دور فرما لیجئے کہ قمری مہینہ اسلامی ہے اور شمسی مہینہ انگریزی یا غیر اسلامی ہے، شمس و قمر دونوں اللہ تعالیٰ کے حکم کے تابع ہیں۔ اس لئے دونوں اسلامی ہیں۔ قمری مہینے کے ساتھ ہمارے روزوں اور زکوٰۃ کی عبادت کا تعلق ہے اور شمسی نظام کے حساب سے نمازوں کے اوقات، سحر اور افطار اور طلوع و غروب کے اوقات متعلق ہیں۔ قرآن و سنت میں ایسی کوئی تصریح نہیں ہے کہ زیادہ سے زیادہ کتنے قمری مہینے مسلسل ۳۰ دن کے ہو سکتے ہیں اور کتنے مسلسل ۲۹ دن کے ہو سکتے ہیں۔ امام احمد رضا بریلوی قدس سرہ العزیز نے فتاویٰ رضویہ ج ۱۲، ص ۳۰ پر بحوالہ تحفۂ شاہیہ علامہ قطب الدین شیرازی لکھا ہے کہ "زیادہ سے زیادہ مسلسل چار قمری مہینے ۳۰ دن کے ہو سکتے ہیں اور زیادہ سے زیادہ مسلسل تین مہینے ممکنہ طور پر ۲۹ کے ہو سکتے ہیں"۔ حال ہی میں ایک ماہر فلکیات نے لکھا ہے کہ زیادہ سے زیادہ مسلسل پانچ مہینے ہو سکتے ہیں۔

عید کے دو مہینے ناقص نہ ہونے کا مطلب

سوال: صحیح مسلم میں حدیث ہے کہ عید کے دو مہینے یعنی رمضان و ذوالحجہ ناقص نہیں

ہوتے، اس حدیث کا کیا مطلب ہے؟ کیا اس کا مفہوم یہ ہے کہ دونوں کسی ایک سال میں ۲۹ دن کے نہیں ہوتے؟ (سید ذاکر شاہ، سعید آباد بلدیہ ٹاؤن۔ کراچی)

جواب: اس حدیث کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ازراہ کرم ان دونوں مبارک مہینوں میں عبادت گزاروں کے اجر میں کمی نہیں فرماتا بلکہ اپنے فضل وکرم سے پورا اجر عطا فرماتا ہے۔ باقی قرآن وحدیث میں قمری مہینوں کے ایام کی تعداد کے اعتبار سے کوئی تصریح یا تعیین نہیں ہے کہ دو یا تین مہینے مسلسل ۳۰ دن کے نہیں ہو سکتے یا اگر رمضان ۳۰ دن کا ہوگا تو ذوالحجہ ۲۹ دن کا ہوگا؟ ان دونوں میں سے کوئی ایک ضرور ۳۰ دن کا ہوگا یا یہ کہ جس دن عید الفطر ہوگی، اسی دن عاشورہ محرم ہوگا وغیرہ۔ یہ سب لوگوں کے خود ساختہ قیاسات، مفروضات اور تخمینے ہیں۔ ہاں البتہ حدیث پاک میں سید المرسلین حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کا ایک واضح ارشاد موجود ہے اور وہ یہ کہ "قمری مہینہ ۲۹ دن سے کم کا نہیں ہو سکتا اور ۳۰ دن سے زیادہ کا نہیں ہو سکتا۔ اگر کسی شخص کے تجربے اور مشاہدے میں ایک چیز دو چار مرتبہ کسی ایک انداز میں واقع ہو جائے تو یہ محض اتفاق ہو سکتا ہے، کسی اصول شرعی کی بنیاد نہیں بن سکتا۔

پاکستان میں رمضان شروع کر کے سعودی عرب میں عید منانا

سوال: میں نے رمضان المبارک کا آغاز پاکستان میں کیا ہے اور پاکستان کی رویت کے مطابق روزہ رکھنا شروع کیا ہے، اب میرا عمرے پر جانے کا پروگرام ہے اور میں عید الفطر تک مدینہ منورہ میں قیام کروں گا۔ اب بتائیے کہ میں عید وہاں کے حساب سے مناؤں یا پاکستان کے حساب سے اپنے روزے مکمل کروں، کیونکہ یہ بھی ممکن ہے کہ میرے اٹھائیس روزے مکمل ہوئے ہوں اور وہاں عید ہو جائے، میرے لئے شرعی حکم کیا ہے؟ (عید محمد فریدی، لیاقت آباد۔ کراچی)

جواب: یہ ایسے سب لوگوں کا مسئلہ ہے جو پاکستان میں رمضان المبارک کا آغاز کر کے عمرے کیلئے یا ملازمت کیلئے سعودی عرب جاتے ہیں یا سعودی عرب میں رمضان المبارک کے کچھ ایام گزار کر عید الفطر منانے پاکستان آتے ہیں، اگر وہ پاکستان میں

اہل وطن کے ساتھ عید منائیں تو بعض اوقات ان کے روزے ۳۱ ہو جاتے ہیں۔ یہ مسئلہ بلاشبہ گہرے غور و فکر کا متقاضی ہے اور اس کو حل کرنے کیلئے فقہی بصیرت درکار ہے، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کے بارے میں علماء میں دو آراء ہوں۔ پاکستان سے سعودی عرب جانے والے کے ۲۹ روزے پورے ہو جائیں یا سعودی عرب سے پاکستان آنے والے کے ۳۰ روزے پورے ہو جائیں اور پھر مقامی لوگوں کے ساتھ عید کرلیں تو لوگوں کو زیادہ تردد نہیں ہوتا، کیونکہ ہر جگہ رمضان المبارک (یا قمری مہینہ) ۲۹ دن کا ہوتا ہے اور کبھی ۳۰ دن کا۔ زیادہ تردد تب ہوتا ہے کہ جب پاکستان سے سعودی عرب جانے والے کے صرف ۲۸ روزے ہوتے ہوں اور عید ہو جائے یا سعودی عرب سے پاکستان آنے والے کے ۳۰ روزے پورے ہو چکے ہوں اور اگلے دن عید نہ ہو بلکہ روزہ ہو، اس طرح روزہ رکھنے کی صورت میں اس کے ۳۱ روزے ہو جائیں گے جبکہ حساب کتاب کی رو سے قمری مہینہ زیادہ سے زیادہ ۳۰ دن کا ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں گزارش ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَمَنْ شَهِدَ مِنكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ط "پس تم میں سے جو ماہ رمضان کو پائے تو اس پر لازم ہے کہ اس کا روزہ رکھے"

(البقرہ: ۱۸۵)

لہٰذا اس امر ربانی کا تقاضا یہ ہے کہ چونکہ سعودی عرب سے پاکستان آنے والے نے یہاں رمضان پالیا ہے ابھی ہلال شوال طلوع نہیں ہوا، تو وہ روزہ رکھے، خواہ اس کے روزے ۳۱ ہی کیوں نہ ہو جائیں۔ دوسری جانب ارشاد رسول ﷺ ہے "جس دن لوگ روزہ رکھیں اس دن روزہ ہے اور جس دن لوگ عید کریں اس دن عید ہے" (جامع ترمذی ص ۱۲۴)۔ لہٰذا اس حدیث مبارک کی روشنی میں پاکستان سے سعودی عرب جانے والا جب دیکھے کہ مقامی لوگ عید منا رہے ہیں تو وہ بھی منائے، خواہ اس کے روزوں کی تعداد صرف ۲۸ ہوئی ہے۔ یہ صورت ایسی ہی ہے جیسے بعض بلاد مغرب مثلاً ناروے، ڈنمارک وغیرہ میں سال کے بعض ایام میں عشاء کا وقت داخل ہی نہیں ہوتا، مغرب کا وقت ختم ہوتے ہی فجر کا وقت شروع ہو جاتا

ہے، لہذا ان پر جن ایام میں عشاء کا وقت داخل ہی نہیں ہوا تو وہ اس نماز کیلئے عند اللہ جوابدہ بھی نہیں ہیں۔ ان کیلئے دن میں چار نمازیں ہی رہ جائیں گی۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے گونگے شخص پر نماز میں قرائت کا فرض ساقط ہو جاتا ہے، جس کا کوئی ہاتھ یا پاؤں کٹا ہوا ہے اس پر وضو میں اس ہاتھ یا پاؤں کے دھونے کی فرضیت ساقط ہو جاتی ہے۔ تاہم جو لوگ احتیاط پر عمل کرنا چاہیں، وہ سعودی عرب میں اپنے اٹھائیسویں روزے کے بعد عید منائے جانے کی صورت میں ایک دن کی بعد میں قضا کر لیں۔

عیدی دینا

سوال : عیدین کے موقع پر عیدی دینا کیسا ہے؟ اس کا شرعی حکم کیا ہے؟

(ناصر خان چشتی، ڈیرہ اسماعیل خان)

جواب : عیدین کے موقع پر عیدی دینا نہ شرعاً ضروری ہے نہ ہی اس کی بابت نفیاً یا اثباتاً کوئی حکم ثابت ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا کوئی عمل مبارک بھی بطور خاص اس موقع کیلئے ثابت نہیں ہے۔ لیکن چھوٹوں پر شفقت کی حضور ﷺ نے ترغیب فرمائی ہے اور ترک رحم و شفقت پر وعید فرمائی ہے، لہذا اگر دینی و روحانی مسرت کے اس موقع پر اپنے چھوٹوں پر شفقت کرتے ہوئے انہیں کچھ رقم یا کوئی چیز بطور ہدیہ دے دیں تو یہ مستحسن امر ہے۔ اسی طرح چھوٹے بڑے کی تمیز کے بغیر عمومی طور پر رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے "آپس میں ایک دوسرے کو تحفہ ہدیہ دیا کرو تاکہ تمہارے درمیان الفت و محبت کے جذبات پروان چڑھیں" لہذا ایک دوسرے کو ہدایا اور تحائف دینا عید کے موقع پر ہو یا عام ایام میں اجر و ثواب اور خیر و برکت کا باعث ہے اور یہ خصلت باہمی محبت میں اضافے کا باعث ہے۔ لیکن خاص عید کے موقع پر اسے کوئی خصوصی شرعی حیثیت دینا یا ایسا تصور کرنا درست نہیں ہے۔

کیا جمعہ کے دن کا نفلی روزہ رکھنا مکروہ ہے؟

سوال : میرا یہ معمول ہے کہ میں جمعہ کے دن نفلی روزہ رکھتا ہوں، بعض حضرات اس سے منع کرتے ہیں کہ یہ مکروہ ہے، ازراہ کرم اس مسئلے کی وضاحت کیجیے؟

جواب : صحیح مسلم میں حدیث ہے کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا: کیا رسول اللہ ﷺ نے جمعہ کے دن کا روزہ رکھنے سے منع فرمایا ہے؟ تو انہوں نے جواباً فرمایا: رب کعبہ کی قسم ہاں، (رقم الحدیث: ۲۵۷۷)۔ دوسری حدیث میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم میں سے کوئی شخص جمعے کے دن کا روزہ نہ رکھے سوائے اس کے کہ اس سے پہلے ایک دن کا یا اس کے بعد ایک دن کا روزہ اس کے ساتھ رکھے، (رقم الحدیث: ۲۵۷۹)۔ اس سے اگلی حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے صرف جمعہ کے دن کو (نفلی) روزے کے لئے مخصوص کرنے کی ممانعت فرمائی، ہاں اگر کسی شخص کا مخصوص تواریخ کو روزہ رکھنے کا معمول ہے (جیسے ایام بیض یعنی چاند کی تیرہ، چودہ اور پندرہ تاریخ کے روزے اور اس تاریخ کو اتفاق سے جمعہ کا دن آجائے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے)۔ ان احادیث مبارکہ کی روشنی میں بعض ائمہ نے حدیث میں مذکور استثنائی صورت کے علاوہ محض جمعہ کے دن بطور خاص نفلی روزہ رکھنے کو مکروہ قرار دیا ہے اور فرمایا ہے کہ شاید اس کی حکمت یہ ہو کہ (۱) مسلمانوں میں بھی کہیں یہود کی روش نہ سرایت کر جائے کہ جمعہ کے دن کی تو غیر معمولی تعظیم کریں اور باقی دنوں میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے یکسر غافل ہو جائیں، اسی لئے اگر کوئی جمعہ کے ساتھ جمعرات یا ہفتہ کا دن ملا کر روزہ رکھتا ہے تو یہ کراہت سے مستثنیٰ ہے۔ امام اعظم ابو حنیفہ، امام محمد اور امام مالک رحمہم اللہ تعالیٰ کے نزدیک جمعہ کے دن کا نفلی روزہ بلا کراہت جائز ہے۔ امام اعظم کی دلیل یہ حدیث ہے: "امام ترمذی روایت کرتے ہیں کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ہر مہینہ کے تین دن (۱۳، ۱۴، ۱۵) اور جمعہ کو روزہ رکھتے تھے اور بہت کم یہ روزہ چھوڑتے تھے"۔

☆...☆...☆

کتاب الزکوٰۃ

سونے چاندی پر زکوۃ

سوال: کیا ذاتی استعمال کے سونے اور چاندی کے زیورات پر زکوۃ واجب ہے؟

(ضیاء الرحمٰن، گلشن اقبال۔ کراچی)

جواب: سونا چاندی از روئے شریعت خلقی طور پر مال ہیں لہٰذا یہ کسی بھی ہیئت میں ہوں ان پر زکوۃ واجب ہے۔ مثلاً برتن، سامانِ آرائش، مالیاتی سکے، سونے یا چاندی کی ڈلی، استعمال کے زیورات وغیرہ۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک خاتون اپنی ایک لڑکی کو لے کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ اس لڑکی کے ہاتھوں میں سونے کے موٹے اور بھاری کنگن تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "کیا تم ان کنگنوں کی زکوۃ ادا کرتی ہو؟" اس نے عرض کیا "نہیں" حضور ﷺ نے فرمایا "تو کیا تم اس بات پر خوش ہوگی کہ اللہ تعالیٰ (زکوۃ نہ دینے کی بناء پر) ان کنگنوں کے عوض قیامت کے دن تمہیں آگ کے کنگن پہنائے؟" (یہ وعیدِ عذاب) سنتے ہی اس نے وہ کنگن اتار کر رسول اللہ ﷺ کو دے دیئے اور عرض کیا کہ یہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کو دے دیئے ہیں یعنی یہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی راہ میں صدقہ ہیں۔

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ میں سونے کے "اوضاح" (ایک خاص زیور کا نام ہے) پہنتی تھی۔ میں نے اس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ سے پوچھا: "یا رسول اللہ! کیا یہ بھی اس کنز میں شامل ہے (جس پر سورۂ توبہ آیت ۳۴، ۳۵ میں عذاب جہنم کی وعید آئی ہے)؟" حضور ﷺ نے فرمایا "جو سونے کے زیورات اتنی مقدار کو پہنچ جائیں کہ ان پر زکوۃ واجب ہو جاتی ہے اور پھر ان کی زکوۃ ادا کر دی جائے تو ان پر کنز کا اطلاق نہیں ہوتا۔" (سنن ابی داؤد، موطا امام مالک)۔ ان احادیث مبارکہ سے واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ استعمال کے زیورات پر بھی زکوۃ واجب ہے کیونکہ دونوں خواتین نے سونے کے زیورات پہن رکھے تھے۔

اگر کسی زیور میں سونا اور چاندی مخلوط ہوں تو غالب چیز کا اعتبار ہوگا، یعنی اگر غالب حصہ سونے کا ہے تو اسے سونا قرار دے کر زکوٰۃ عائد کی جائے گی اور اگر غالب حصہ چاندی کا ہے تو چاندی کی شرح سے زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی، اور اگر کسی چیز پر محض سونے چاندی کی ملمع کاری ہے تو اس پر زکوٰۃ نہیں ہے۔ ہیرے، زمرد، یاقوت اور دوسرے قیمتی پتھر اگر ذاتی استعمال میں ہوں تو ان پر زکوٰۃ نہیں ہے۔ تجارت کیلئے ہوں تو ان پر زکوٰۃ ہے۔

زیورات کی ملکیت' زکوٰۃ

سوال: شادی کے موقع پر دولہا والوں کی طرف سے دلہن کو جو زیورات دیئے جاتے ہیں وہ کس کی ملکیت ہوتے ہیں؟ اکثر یہ مسئلہ ناراضگی کا سبب بنتا ہے اور ان کی زکوٰۃ کس کے ذمے ہے؟ (محمد علی، اورنگی ٹاؤن۔ کراچی)

جواب: ہمارے معاشرے میں شادی کے موقع پر دولہا والے دلہن کو زیورات وغیرہ دیتے ہیں اسے عرفِ عام میں "بری" کہتے ہیں۔ حالات خوشگوار ہیں تو یہ سوال ہی زیر بحث نہیں آتا کہ ان کا اصل مالک کون ہے؟ خدانخواستہ ازدواجی زندگی میں بگاڑ پیدا ہو جائے تو پھر لوگ علماء سے پوچھنے آتے ہیں اور فتویٰ طلب کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں گزارش یہ ہے کہ یہ بنیادی طور پر کتابی مسئلہ نہیں ہے اس کا مدار اس علاقے یا برادری کی روایات پر ہے کہ آیا وہ اپنی بیوی یا بہو کو زیورات ھبہ کر کے مالک بنا دیتے ہیں یا اسے عاریتاً محض استعمال کیلئے دیتے ہیں، اس پر ہی فیصلہ ہوگا۔ اور اگر دیتے وقت تو ھبہ کی نیت ہو اور بعد میں اختلافات رونما ہونے پر نیت میں فتور آجائے تو یہ فکری خیانت ہے اور مومن کی شان کے منافی ہے۔ اور زیادہ بہتر یہ ہے کہ نکاح کے وقت طے کر دیا جائے اور نکاح نامہ میں اس کا اندراج کر دیا جائے تاکہ بعد میں ناراضگی پیدا نہ ہو اور ویسے بھی شرعاً و قانوناً ملکیت معلق نہیں رہتی جب ملکیت کا مسئلہ طے ہوگا تو یہ مسئلہ از خود طے ہو جائے گا کہ ایسے زیورات کی زکوٰۃ عنداللہ کس کے ذمہ ہے اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں مسئولیت کے خوف سے وہ زکوٰۃ ادا کرے گا۔

زکوٰۃ فنڈ سے قرض حسنہ دینا

سوال: "راجپوتانہ ویلفیئر ایسوسی ایشن" قریشی و شیخ برادری کی ایک سماجی فلاحی تنظیم ہے، جس میں برادری کے لوگوں سے زکوٰۃ، فطرہ، صدقات اور چرم قربانی کی مد میں رقم جمع کی جاتی ہے اور برادری کے مستحق افراد میں حسبِ ضرورت تقسیم کی جاتی ہے۔ کیا زکوٰۃ فنڈ سے تعمیر مکان یا کاروبار کیلئے "قرض حسنہ" دیا جاسکتا ہے، جسے بعد میں بالاقساط وصول کیا جاتا ہے؟ (عبدالقادر شیخ، چیئرمین زکوٰۃ کمیٹی)

جواب: "ایسوسی ایشن" زکوٰۃ و فطرہ دینے والوں کی وکیل ہے جب تک وہ زکوٰۃ کی رقم مستحقین کو مالکانہ بنیاد پر نہیں دیں گے زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی اور ایسوسی ایشن کے اراکین اس کیلئے عنداللہ جوابدہ ہوں گے۔ محض "قرض حسنہ" کے طور پر رقم اور بعد میں بالاقساط وصول کرنے سے زکوٰۃ یا صدقات کی ادائیگی نہیں ہوئی اور اس سلسلے میں لوگوں کا دباؤ ڈالنا غلط ہے۔ البتہ اگر برادری کے اہلِ ثروت زکوٰۃ، فطرہ، چرم قربانی اور صدقات کے علاوہ ایک "قرض حسنہ" فنڈ قائم کرلیں اور اس کا کھاتہ صدقات کی رقوم سے الگ رکھا جائے تو یہ بلاشبہ ایک "صدقۂ جاریہ" اور کارِ خیر ہوگا۔

زکوٰۃ فنڈ کی سودی اسکیموں میں انویسٹمنٹ؟

سوال: ایک برادری کا فلاحی ادارہ ہے۔ وہ لوگ برادری کی زکوٰۃ، فطرہ اور چرم قربانی جمع کرکے اس رقم کا کل یا کچھ حصہ انویسٹمنٹ کی سودی اسکیموں (مثلاً نیشنل سیونگز سرٹیفکیٹ وغیرہ) میں لگاتے ہیں اور ان رقوم سے حاصل شدہ سود یا منافع کو مستحقین میں تقسیم کرتے ہیں، کیا یہ شرعاً درست ہے؟

(محمد نقی خان لودھی۔ نیو کراچی)

جواب: زکوٰۃ و صدقات کی رقوم کا سودی اسکیموں میں لگانا اور ان پر سود لینا حرام ہے اور اس طرح مستحقین کی اعانت کوئی نیکی نہیں ہے۔ اس طرح تو ہر مالدار شخص اپنی

ذاتی حیثیت میں بھی یہ کرنے لگے گا تاکہ زکوۃ کی رقم سودی اسکیم میں انویسٹ کردے اور اس کا سود بانٹتا پھرے۔ زکوۃ سود تو کجا، اگر محض شخصی نام پر یا تنظیم کے نام پر، بلاسودی کرنٹ اکاؤنٹ میں جمع رکھی ہے تب بھی ادا نہیں ہوگی تاوقتیکہ مستحقین کو پہنچا نہ دی جائے۔ سوائے اس صورت کے کہ کوئی زکوۃ لینے والا مستحق ہی نہ مل رہا ہو۔ الغرض تنظیم کے ارکان کا یہ عمل کلی طور پر خلاف شرع ہے۔

بینک اور زکوۃ کی کٹوتی

سوال: ہر سال بینک اپنی مرضی سے ہمارے اکاؤنٹ سے زکوۃ کاٹ لیتا ہے، ہم اکثر اخبارات میں پڑھتے رہتے ہیں کہ زکوۃ فنڈ میں خورد برد ہو گیا، زکوۃ فنڈ سے فلاں وزیر نے بنگلہ بنالیا فلاں نے گاڑیاں خرید لیں، کبھی لکھا ہوتا ہے کہ مستحق لوگوں تک زکوۃ نہیں پہنچ رہی اور کبھی یہ خبر سننے کو ملتی ہے کہ فلاں علاقے کے زکوۃ کمیٹی کے چیئرمین بدعنوانی میں ملوث پائے گئے، یہ بھی سنا تھا کہ زکوۃ دینی مدرسوں کو نہیں دی جارہی۔ آپ سے پوچھنا یہ ہے کہ ایسی صورت میں بینک سے زکوۃ کٹوادینا صحیح ہے یا نہیں؟ یعنی جبکہ زکوۃ فنڈ صحیح طور پر مستحق لوگوں تک نہ پہنچ رہا ہو؟ (عظمیٰ یاسمین، بلاک 'ٹی' نارتھ ناظم آباد۔ کراچی)

جواب: جیسا کہ آپ نے خود تفصیلات درج فرمائی ہیں کہ نہ تو زکوۃ کی کٹوتی کے وقت شرعی حدود و قیود کا لحاظ رکھا جاتا ہے نہ اصل زر اور سود میں تفریق کی جاتی ہے اور نہ ہی صرفِ زکوۃ میں شرعی حدود کی مکمل پاسداری کا اہتمام کیا جاتا ہے بلکہ حکومت کے زیر تحویل زکوۃ میں خورد برد کی داستانیں اخبارات کی زینت بنتی رہتی ہیں۔ اس لئے ہم سرکاری نظامِ وصولی و تقسیم زکوۃ پر مکمل اعتماد کا اظہار کرنے میں محتاط ہیں۔ اب چونکہ سپریم کورٹ آف پاکستان نے اپنے ایک فیصلے کی روشنی میں اہل تشیع کی طرح اہلسنت کو بھی یہ حق دے دیا ہے کہ وہ سرکاری مالیاتی اداروں سے زکوۃ کی کٹوتی سے اپنے آپ کو مستثنیٰ قرار دے سکتے ہیں، لہٰذا شرعی احتیاط کا

تقاضا یہی ہے کہ آپ اپنی زکوۃ کی خود تشخیص کریں، پوری زکوۃ شریعت کے مطابق نکال کر مصارفِ شرعیہ پر صرف کریں اور عند اللہ بری الذمہ ہوں، البتہ وہ لوگ جو اپنے آپ کو لازمی کٹوتی سے بھی مستثنیٰ قرار دے دیں اور پھر زکوۃ ادا بھی نہ کریں تو یہ عدالتی فیصلے کا غیر شرعی استعمال ہوگا اور منشاء شریعت کو باطل کرنے کے مترادف ہوگا۔ اللہ تعالیٰ اس فریب نفس سے ہم سب کو اپنی پناہ میں رکھے۔

پیشہ ور بھکاریوں کا مسئلہ

سوال: آج کل مسجدوں میں، بس اسٹاپ پر، بس کے اندر، دروازہ کھٹکھٹا کر، سر راہ راستہ روک کر لوگ بھیک مانگتے ہیں، عورتیں، لڑکیاں بچے جوان اور بوڑھے سب۔ کیا ان لوگوں کو صدقہ خیرات دینی چاہئے؟

(ابرار الحق، گولڈن ٹاؤن، ایئرپورٹ۔ کراچی)

جواب: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لِلۡفُقَرَآءِ الَّذِيۡنَ اُحۡصِرُوۡا فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ لَا يَسۡتَطِيۡعُوۡنَ ضَرۡبًا فِى الۡاَرۡضِ يَحۡسَبُهُمُ الۡجَاهِلُ اَغۡنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ ۚ تَعۡرِفُهُمۡ بِسِيۡمٰهُمۡ ۚ لَا يَسۡـَٔلُوۡنَ النَّاسَ اِلۡحَافًا

"(صدقہ و خیرات کے مستحق) ایسے نادار لوگ ہیں جو خود کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں (دینی کام کیلئے) وقف کئے ہوئے ہیں جو زمین میں چل پھر کر (روزی کمانے کی) مہلت نہیں پاتے ناواقف (حال) شخص ان کے سوال نہ کرنے کی وجہ سے انہیں غنی سمجھتا ہے۔ (اے مخاطب!) تم (کیفیت افلاس کو) ان کی صورت سے پہچان لوگے، وہ لوگوں سے گڑگڑا کر سوال نہیں کرتے۔"

(البقرہ: ۲۷۳)

اس ارشاد ربانی سے معلوم ہوا کہ صدقات وخیرات کے اصل مستحق وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں وقف ہیں، انہیں معاشی تگ ودو کی فرصت نہیں ہے وہ خوددار ہیں، عزت نفس کا پاس رکھتے ہیں، باوجود شدید حاجت مند ہونے کے کسی کے آگے دست سوال دراز نہیں کرتے، کسی کے دامن سے لپٹ کر یا گڑگڑا کر مانگتے نہیں، وہ اتنے خوددار ہیں کہ ناواقف حال شخص انہیں خوشحال سمجھتا ہے ایسے لوگوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر ان کی مدد کرنی چاہئے انہیں خود چل کر تلاش کرنا چاہئے۔ جن لوگوں کا آپ نے ذکر کیا ہے، ان لوگوں کی اکثریت پیشہ ور بھکاریوں کی ہے ان کو خیرات دینا ان کی حوصلہ افزائی کرنا ہے۔ جوان چھیوں سے بھیک منگوانا انتہائی معیوب فعل ہے۔ یہ حکومت کا کام ہے کہ ان کا سروے کرے ان میں سے جو افراد واقعی معذور، لاوارث اور مفلوک الحال ہیں، ضعیف، مریض اور بے سہارا ہیں، روزی کمانے کے اہل نہیں ہیں ان کیلئے کفالت گھر قائم کرے۔ حکومت کے پاس زکوٰۃ کے اربوں روپے جمع ہیں، اور جنھوں نے اپنی خودداری اور عزت نفس کو پامال کر کے بھیک کو ذریعۂ معاش بنا رکھا ہے۔ بھیک مانگتے ہیں پھر عیاشی کرتے ہیں ان میں بعض بری مجالس کے زیر اثر نشے کے عادی ہوجاتے ہیں یہ لوگ اخلاقی مجرم ہیں اور ان کا سدباب کرنا حکومت کی ذمہ داری ہے۔

بَری اور جہیز کے سامان اور زیورات کی ملکیت کا مسئلہ

سوال : میری شادی ایک خاتون عشرت پروین سے ہوئی تھی۔ میری اہلیہ کو شادی کے موقع پر ان کے والدین نے جہیز کا سامان دیا، جس میں ٹی وی، وی سی آر، ٹیپ ریکارڈر، الماری وغیرہ شامل ہے، اس کے علاوہ زیور کا سیٹ بھی تھا، اور ایک سیٹ زیور بَری میں ہم نے دیا تھا۔ میری اہلیہ بیمار تھی، ان کے والدین نے وعدہ کیا تھا کہ وہ علاج کا خرچ برداشت کرتے رہیں گے، لیکن انہوں نے وعدہ پورا نہیں کیا۔ اہلیہ شدید بیمار ہوگئی، ساتھ ہی میرا کاروبار بھی ختم ہوگیا اور میں غربت کا شکار ہوگیا۔ میں نے بامر مجبوری بیوی کا مذکورہ بالا سامان بیچ کر ان کے علاج پر لگادیا، آخر کار وہ وفات پاگئیں۔ اہلیہ کے والدین نے ان کی حیات میں جہیز کا زیور کا سیٹ

اور ہماری طرف سے دیا ہوا بری کا سیٹ حفاظت کے بہانے لا کر میں رکھوا دیا اور اب وہ ہمارا بری کا سیٹ بھی واپس کرنے پر آمادہ نہیں ہیں بلکہ جہیز کے سامان کا جو اہلیہ کے علاج کی خاطر بیچ دیا گیا تھا، مطالبہ کر رہے ہیں، لہٰذا بتایئے کہ از روئے شریعت مسئلے کا حل کیا ہے؟ (اسلم پرویز فہمی، حیدر آباد)

(نوٹ: سوال کا خلاصہ درج کیا گیا ہے، طویل سوالات کی ان سطور میں گنجائش نہیں ہے)

جواب: امام احمد رضا قادری لکھتے ہیں: ”جہیز ہمارے بلاد کے عرف عام شائع سے خاص ملک زوجہ ہوتا ہے، جس میں شوہر کا کچھ حق نہیں، طلاق ہوئی تو کل لے گئی اور مر گئی تو اس کے ورثاء پر تقسیم ہوگا، رد المحتار میں ہے: (ترجمہ) ہر شخص جانتا ہے کہ جہیز عورت کی ملکیت ہوتا ہے، جب شوہر اس کو طلاق دے دے تو وہ تمام جہیز لے لے گی اور جب عورت مر جائے تو جہیز اس کے وارثوں کا ہوگا، (باب النفقہ جلد نمبر ۲ صفحہ نمبر ۶۵۳ حوالہ فتاوی رضویہ، رضا فاؤنڈیشن جلد نمبر ۱۲ صفحہ نمبر ۲۰۳)۔ لہٰذا آپ کی اہلیہ کا سارا سامان جہیز ٹی وی، وی سی آر، ٹیپ ریکارڈر، الماری وغیرہ بشمول زیورات کے آپ کی اہلیہ ہی کی ملکیت ہے اور اب ان کے انتقال کے بعد ان کے ترکہ میں شامل ہوگا اور ان کے تمام شرعی وارثوں میں تقسیم ہوگا۔ آپ نے اپنی اہلیہ کا جو سامان بیچ کر ان کے علاج پر لگایا ہے، اگر ان کی اجازت سے ایسا کیا ہے تو درست ہے اور اگر ان کی اطلاع، اجازت یا رضامندی کے بغیر ایسا کیا ہے تو وہ ساری رقم آپ کے ذمے قرض ہے اور ان کے ترکے کا حصہ ہے، جیسے کہ اگر آپ نے ان کی زندگی میں ان کا مہر ادا نہ کیا ہو تو وہ بھی آپ کے ذمہ قرض ہے اور ان کے ترکے میں شامل ہے۔ اب رہا بری کے سامان اور زیورات کا مسئلہ جو آپ نے شادی کے موقع پر اپنی اہلیہ کو دیا تھا تو اس کے بارے میں امام احمد رضا قادری لکھتے ہیں: ”دلھن کا گہنا جوڑا جو بری میں جاتا ہے اگر نصاً یا عرفاً اس میں بھی تملیک مقصود ہوتی ہو جیسے شکر، میوہ، عطر، پھلیل وغیرہ میں مطلقاً ہوتی ہے تو وہ بھی قبضہ منکوحہ ملک منکوحہ ہوگا، ہمارے یہاں شرفا کا عرف

ظاہر یہی ہے، ولہذا بعد رخصت اس کے واپس لینے کو سخت معیوب و موجب مطعونی جانتے ہیں، اور اگر لے لیں تو طعنہ زن یہی کہتے ہیں کہ دے کر پھیر لیا یا صرف دکھانے کو دیا تھا، جب دلھن آگئی چھین لیا، یعنی یہ ان کی رسم معہود کے خلاف ہے، (فتاویٰ رضویہ، رضا فاؤنڈیشن جلد نمبر ۱۲ صفحہ نمبر ۲۰۸)۔

امام احمد رضا قادری کی اس تصریح کے مطابق ہمارے اس خطے میں شرفا کے یہاں عرف یہی ہے کہ بَری کا زیور اور سامان دلھن کی ملکیت ہوتا ہے، اس کو ہبہ کہا جاتا ہے، اور ہبہ سے رجوع اگرچہ شرعاً مباح اور موثر ہے لیکن یہ انتہائی قبیح اور مکروہ فعل ہے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”جو شخص صدقہ کر کے رجوع کرتا ہے، اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی کتا قے کرے، پھر اپنی قے میں رجوع کر کے اسے کھالے، (صحیح مسلم، رقم الحدیث ۴۰۵۸)۔ فتاویٰ در مختار اور رد المحتار میں ہے کہ اگر میاں بیوی نکاح کے بعد ایک دوسرے کو کوئی چیز ہبہ کریں تو اس میں تو رجوع جائز ہی نہیں ہے۔ اور موت کے ساتھ ہبہ بہر صورت مکمل ہو جاتا ہے۔ لہذا میری رائے میں آپ کی بیوی کا دین مہر، اگر اب تک آپ کے ذمے ہے اور آپ نے ادا نہیں کیا، آپ کے ذمہ قرض ہے، بیوی کے ترکے کا حصہ ہے اور دونوں طرف کا زیور بھی اب بیوی کا ترکہ ہے، اگر آپ کی فوت شدہ بیوی کی اولاد نہیں ہے تو کل ترکے میں سے آپ کا حصہ نصف ہے، بقیہ ترکہ دیگر ورثاء کا ہے۔ البتہ اگر شادی کے وقت وضاحت کر دی گئی ہو کہ بَری کے زیورات دولہا کی ملکیت ہوں گے اور دلھن محض عاریتاً انہیں استعمال کرے گی تو پھر بَری کا زیور آپ کا ہے اور دلھن کے والدین کو چاہئے کہ آپ کو واپس کر دیں۔ اگر کسی برادری کے عرف یا رسم میں یہ بالکل طے ہے کہ بَری کے زیورات اور سامان دولہا کی ملکیت ہوں گے تو پھر اسی کے مطابق فیصلہ ہوگا۔ بعد میں نیت میں فتور کا آجانا خیانت ہے، اگر دلھن کے والدین نے اپنی بیٹی کے علاج کے مصارف برداشت کرنے کا وعدہ کیا تھا تو انہیں وعدہ وفا کرنا چاہئے، وعدہ شکنی پر گنہگار ہوں گے۔ لیکن ویسے علاج معالجہ شوہر کی ذمہ داری ہے۔

☆...☆...☆

کتاب الحج

"حج فرض" ادا نہیں کیا تو کیا حکم ہے؟

سوال: کوئی شخص تندرست ہے، مالدار ہے، حج پر جانے میں کوئی مانع اور رکاوٹ بھی نہیں ہے، اگر وہ خود حج پر نہ جائے اور کسی کو اپنی طرف سے نائب بنا کر حج بدل کیلئے بھیج دے تو کیا اس طرح وہ فرض سے سبکدوش ہو جائے گا؟

(سید عمیر برنی، فیڈرل بی ایریا۔ کراچی)

جواب: جب کوئی شخص صاحبِ ایمان، عاقل وبالغ ہو، جسمانی طور پر سفرِ حج کے قابل ہو، حج کی مالی استطاعت بھی رکھتا ہو اور کوئی رکاوٹ بھی اسے درپیش نہ ہو تو اس پر بذاتِ خود حج ادا کرنا لازم ہے، اسے "حجۃ الاسلام" کہتے ہیں اور کسی مہلک مرض، جسمانی معذوری (جیسے نابینا ہونا، لنگڑا ہونا یا ایسے امراض میں مبتلا ہونا جن میں ماہر ڈاکٹر کی رائے میں سفر اس کیلئے جان لیوا ثابت ہو سکتا ہے) میں مبتلا نہ ہو تو کسی کو اپنا نائب مقرر کر کے حج بدل کرانے سے اس کا حج ادا نہیں ہوگا۔ ہاں البتہ اگر وہ اپنی بد قسمتی اور کوتاہی کی بناء پر زندگی بھر اس سعادت سے محروم رہا تو اس پر لازم ہے کہ اپنی وفات سے پہلے اپنے حج بدل کیلئے کسی کو مقرر کر لے یا اس کی وصیت ضرور کرے، اگر اس نے اپنا حج بدل کرانے کی وصیت کی تو یہ مصارف اس کے ترکے سے ادا کرنے ہوں گے، بشرطیکہ ایک تہائی یا کم ترکہ اس کیلئے کافی ہو اور اگر خدانخواستہ ایک تہائی ترکہ کافی نہیں ہے تو بقیہ رقم کی فراہمی اس کے وارثوں کی رضامندی پر منحصر ہے۔

غیر شادی شدہ بالغ بیٹی گھر پر بیٹھی ہو اور حج پر جانا

سوال: اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ بعض لوگوں پر حج فرض ہوتا ہے، لیکن وہ حج پر نہیں جاتے اور کہتے ہیں جوان بیٹی گھر پر بیٹھی ہوئی ہے۔ ذمے داری سر پہ ہے، ایسے میں حج کیسے ادا ہوگا؟ یعنی وہ بیٹی کے غیر شادی شدہ ہونے کو بھی حج میں شرعی رکاوٹ سمجھتے ہیں؟ (پروفیسر صلاح الدین ظہیر، کورنگی۔ کراچی)

جواب: یہ تصور غلط ہے۔ بیٹی کا غیر شادی شدہ ہونا حج کی فرضیت یا ادائیگی میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد میں کہیں بھی باہم تصادم یا ٹکراؤ نہیں ہے، بلکہ زیادہ بہتر یہ ہے کہ حج پر جائیں وہاں مقاماتِ مقدسہ اور متبرک اوقات میں اپنی بیٹی کے بہتر اور مناسب رشتے کیلئے دعا کریں اور اللہ تعالیٰ کی ذات سے کمال امید رکھیں کہ وہ ان کا مقدار سنوار دے گا، البتہ اگر عذر یہ ہے کہ حج پر جانے کی صورت میں بیٹی یا بیٹیوں اور بیوی کی نگہداشت اور حفاظت کیلئے کوئی محرم مرد رشتہ دار نہیں ہے تو اس عذر کے ازالے تک حج موخر کر سکتا ہے۔

محرم سے مراد قریبی مرد رشتہ دار ہے جس سے ازروئے شرع نکاح دائمی طور پر حرام ہے، جیسے باپ، بیٹا، بھائی، چچا، ماموں، بھتیجا، بھانجا یا اس طرح کے (رضاعی دودھ شریک) رشتے۔

عورت، احرام اور ایام

سوال: عورت حج کا احرام باندھنا چاہتی ہے لیکن وہ ایام سے ہے یا عین میقات پر اسے ماہواری شروع ہو گئی تو وہ احرام باندھ سکتی ہے یا نہیں؟ (جمیلہ بیگم، اورنگی ٹاؤن)

جواب: حیض یا نفاس والی عورت احرام باندھ سکتی ہے، اسے چاہئے کہ حیض یا نفاس ہی کی حالت میں غسل کر کے احرام باندھ لے۔ ائمۂ اربعہ کے نزدیک اس کا احرام کیلئے غسل کرنا مستحب ہے، البتہ غیر مقلدین اسے واجب قرار دیتے ہیں۔

عورتوں کا بغیر محرم کے سفرِ حج

سوال: کیا عورت بغیر محرم کے حج یا عمرے پر جا سکتی ہے؟ محرم سے کون لوگ مراد ہیں، کیا چند عورتیں ایک ساتھ مل کر جا سکتی ہیں؟ (نور نبی، شہداد پور۔ سندھ)

جواب: محرم کسی عورت کے ان مرد رشتے داروں کو کہتے ہیں جن کے ساتھ اس کا نکاح دائمی طور پر حرام ہے، جیسے باپ، بیٹا، چچا، ماموں، بھانجا وغیرہ۔ حرمت نکاح کا سبب نسبی قرابت بھی ہے، رشتۂ رضاعت (یعنی دودھ کے رشتے سے) اور رشتۂ مصاہرت (یعنی

سسرالی رشتے سے) بھی۔

شرعاً کسی بھی عورت کا شوہر یا محرم کے بغیر تین دن سے زیادہ کی مسافت کیلئے سفر کرنا جائز نہیں ہے۔ خواہ یہ سفر حج و عمرہ کیلئے ہو یا کسی اور مقصد کیلئے۔ تین دن کی مسافت سے مراد وہ فاصلہ ہے جو بندہ اوسط رفتار سے پیدل چل کر یا اونٹ پر سوار ہو کر طے کرے، جس میں رات کا آرام، نمازوں کی اپنے اوقات پر ادائیگی اور دوپہر کا مناسب وقفہ بھی شامل ہے۔ فقہاء کرام نے اس کا تخمینہ اٹھارہ فرسخ یا ۵۴ میل شرعی یا ۶۱ میل ۶۴۰ گز یا ۹۸.۷۳ کلومیٹر لگایا ہے۔ خواہ سفر ہوائی جہاز، ریل گاڑی یا کار وغیرہ کے ذریعے ہی کیوں نہ ہو، یہی مسافت شرعاً معتبر ہے۔ صحیح مسلم میں حدیث ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جو عورت اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتی ہو، اس کیلئے جائز نہیں کہ وہ تین راتوں کی مسافت کا سفر محرم کے بغیر کرے۔ مرد کیلئے فرضیتِ حج کی جو شرائط ہیں (یعنی اسلام، حریت، عاقل و بالغ ہونا، زادِ راہ، سفر کے خطرات سے محفوظ ہونا، سفر پر جسمانی قدرت وغیرہ) عورت کیلئے ایک شرط زائد ہے اور وہ ہے سفر کیلئے شوہر یا محرم کی رفاقت، لہٰذا اگر اسے محرم کی رفاقت میسر نہیں ہے تو شرعاً اس پر حج فرض نہیں ہے اور وہ اس عذر کی بناء پر حج نہ کرنے کی صورت میں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں جوابدہ نہیں ہو گی۔ اگر کسی عورت کے ساتھ شوہر یا محرم نہیں ہے تو محض چند عورتوں کی رفاقت کی وجہ سے اس کا سفر حج پر جانا جائز نہیں ہے۔ شریعت نے عورت کے سفر کیلئے جو محرم کا ساتھ ہونا لازمی قرار دیا ہے تو یہ حکم حکمت سے خالی نہیں ہے، اللہ کرے ہر ایک کا سفر ہر اعتبار سے خوشگوار اور خیر و عافیت سے ہو، لیکن سفر میں بیماری، دشواری اور مشکلات اور حوادث کا پیش آنا، خارج از امکان نہیں ہے۔ سفر حج میں بعض اوقات دشواریاں پیش آجاتی ہیں، عورت اپنے آپ کو محرم کے ساتھ ہی محفوظ تصور کر سکتی ہے۔ علامہ شامی نے لکھا ہے کہ اگر عورت نے محرم کے بغیر حج کر لیا تو ادا تو ہو جائے گا لیکن اس کا یہ عمل (بغیر محرم کے سفر) مکروہ تحریمی ہے، بہنوئی محرم نہیں ہے۔

دورانِ حج عورتوں کو ایّامِ مخصوصہ شروع ہوجانا

سوال: حج کے دوران عورت کے ایّام شروع ہوجائیں تو کیا کرے؟

(بنت زبیر، کورنگی کراچی)

جواب: حج کے دوران عورت کے ایّام شروع ہوجائیں تو سارے مناسک حج، مثلاً وقوف منیٰ، وقوف عرفات، وقوف مزدلفہ، قربانی، رمی جمرات وغیرہ حسب معمول ادا کرے صرف طواف نہیں کرسکتی، کیونکہ طواف میں طہارت شرط ہے۔ لہذا جب ایّام سے پاک ہوجائے تو طواف زیارت کرے اور اس کا حج مکمل ہوجائے گا۔ اگر احرام سے پہلے ہی حالت حیض میں ہے۔ تب بھی اسی حالت میں غسل کرکے نیت کرے اور اپنے محرم یا شوہر کے ساتھ سارے مناسک حج ادا کرے۔

دورانِ حج ایّامِ مخصوصہ

سوال: ایّام حج شروع ہوئے تو عورت ایّام سے تھی، یا دوران حج اس کے ایّام مخصوصہ شروع ہوگئے تو وہ کیا کرے؟

(ابن حکیم خان، بنگش کالونی)

جواب: محرم عورت ایّام مخصوصہ میں اپنے حج کو جاری رکھے اور تمام ارکانِ حج ادا کرے البتہ طواف وسعی نہیں کرسکتی، اور ناپاکی کی حالت میں وہ مسجد حرام میں داخل نہیں ہوسکتی۔ بخاری شریف میں حدیث ہے۔

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ سفر حج کے دوران ہم مقامِ سرف (جو مکۃ المکرّمہ سے چند میل کے فاصلے پر ہے) میں تھے کہ میرے ایّام مخصوصہ شروع ہوگئے، اس عالم میں رسول اللہ ﷺ میرے پاس تشریف لائے اور میں اس صدمے کی بنا پر رو رہی تھی (کہ مبادا میں حج سے محروم نہ رہ جاؤں)، رسول اللہ ﷺ نے میری کیفیت کو جان کر فرمایا کہ ''تمہارے ایّام مخصوصہ شروع ہوگئے ہیں؟'' میں نے عرض کی ''جی ہاں!'' آپ ﷺ نے فرمایا ''یہ ایک ایسا معاملہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے آدم کی بیٹیوں کیلئے مقدر فرمایا ہوا ہے، تم دیگر حجاج کی طرح تمام ارکانِ حج ادا کرتی چلی جاؤ، البتہ پاک ہونے سے

پہلے بیت اللہ کا طواف نہ کرنا۔"

جب عورت کے ایّام مخصوصہ ختم ہو جائیں اور وہ غسل کر کے پاک ہو جائے تو پھر طوافِ زیارت کرے (اسے طوافِ افاضہ بھی کہتے ہیں) جو حج کا رکن ہے، اس کے بغیر وہ احرام سے باہر نہیں آسکتی۔ البتہ اگر طوافِ زیارت (جو کہ حج کا رکن ہے) کے ادا کرنے کے بعد عورت کے ایام شروع ہو جائیں اور وہ "طوافِ صدر" (جسے طوافِ وداع بھی کہتے ہیں) ادا نہ کر سکے تو اس کیلئے کوئی حرج نہیں کیونکہ اس عذر کی بنا پر طوافِ صدر کا وجوب اس سے ساقط ہو جاتا ہے اور اس بنا پر اس پر کوئی دم بھی نہیں ہوگا۔

عمرہ حج میں مانع حیض دوائیوں کا استعمال

سوال: خواتین حج یا عمرے پر جاتی ہیں، کیا وہ مانع حیض دوائیں استعمال کر سکتی ہیں تاکہ مناسک حج و عمرہ اور حرمین طیبین میں عبادات بھرپور طریقے سے ادا کر سکیں، عبادت کا تسلسل قائم رہے، کیونکہ وہاں قیام کی مدت حکومت کی طرف سے متعین ہوتی ہے؟

(ہومیو ڈاکٹر عاقل اظہر عثمانی، پرنسپل داتا گنج بخش ہومیو پیتھک میڈیکل کالج۔ کراچی)

جواب: خواتین چاہیں تو ایّامِ حج و عمرہ میں "مانع حیض" دوائیں استعمال کر سکتی ہیں، بشرطیکہ طبی اور جسمانی لحاظ سے ان کیلئے مضر صحت نہ ہوں، اور کسی بڑے جسمانی عارضے کا سبب نہ بنیں کیونکہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: "اور اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو (البقرہ: ۱۹۵)۔" اگر بے ضرر مانع حیض دواؤں سے ایّام نہ آئیں اور ان خواتین کو حرمین طیبین میں زیادہ سے زیادہ عبادت کا موقع ملے تو یہ بڑی سعادت کی بات ہے۔ تاہم اگر کسی خاتون کو دوران حج و عمرہ ایّام شروع بھی ہو جائیں تو اس کے مسائل ایکسپریس کی گزشتہ اشاعت میں تحریر کر چکا ہوں اور انہیں اللہ تعالیٰ کے کرم پر یقین کامل ہونا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ ان کے اجر میں کمی نہیں فرمائے گا، کیونکہ یہ ایک ایسا نفسیاتی عارضہ ہے جس میں خواتین کی کسی ذاتی کوتاہی فکر و عمل کا کوئی دخل نہیں ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَہَا "اللہ تعالیٰ کسی (نفس انسانی) کو اس کی وسعت وطاقت سے زیادہ (کسی عمل) کی تکلیف نہیں دیتا۔" (البقرہ: ۲۸۶)

حج بدل کیلئے کسے بھیجا جائے

سوال: کیا حج بدل کیلئے ایسے شخص کو بھیجا جائے جس نے اپنا فریضۂ حج پہلے سے ادا کر لیا ہے یا کسی ایسے شخص کو بھی بھیج سکتے ہیں جس نے پہلے اپنا فرض حج نہ کیا ہو؟

(منور احمد، ملیر۔ کراچی)

جواب: بہتر یہ ہے کہ حج بدل کیلئے ایسے شخص کو بھیجا جائے جس نے اپنا فریضۂ حج پہلے ہی ادا کر لیا ہو اور ترجیحی طور پر ایسے شخص کا انتخاب کرنا چاہیے جو دیندار ہو اور مسائل ومناسکِ حج سے اچھی طرح واقف ہو۔

سوال: اگر کسی کو حج بدل کرانا ہو تو کیا وہ ایسے شخص کا انتخاب کر سکتا ہے، جس شخص نے اپنا فریضۂ حج ادا نہیں کیا؟، کیا اسے بھیجا جا سکتا ہے؟ (ضیاء الرحمٰن، دستگیر کالونی۔ کراچی)

جواب: ترجیحی طور پر "حج بدل" کیلئے کسی نیک، صالح اور متقی شخص کا انتخاب کرنا چاہئے، اور ان میں سے بھی کسی صاحبِ علم کو ترجیح دینی چاہئے جو مسائل حج اور مسائل دین سے کماحقہ واقف ہو تاکہ عبادت بشری استطاعت کی حد تک کامل و تمام ادا ہو۔ جس نے اپنا فریضۂ حج ادا کیا ہوا ہے، حجِ بدل کیلئے اسی کو ترجیح دینی چاہئے، جس نے اپنا فریضۂ حج پہلے سے ادا نہیں کیا ہے، اگر اسے بھیج دیا تو ادا تو ہو جائے گا، لیکن یہ خلافِ اولیٰ ہے، البتہ یہ ضروری نہیں ہے کہ مرد کی طرف سے مرد ہی حج بدل ادا کرے اور عورت کی طرف سے عورت، اس کے برعکس بھی ہو سکتا ہے۔

حج بدل کا شرعی حکم

سوال: "حج بدل" کا شرعی حکم کیا ہے؟ کن حالات میں اس کی اجازت ہے اور کس کو بھیجنا چاہئے؟ (نجیب الدین شیخ، نارتھ ناظم آباد۔ کراچی)

جواب: عبادات کی تین قسمیں ہیں (۱) خالص بدنی عبادتیں، جیسے نماز اور روزہ، ان میں نیابت یا قائم مقامی جائز نہیں ہے، ہر مکلّف (عاقل وبالغ) کو بذاتِ خود ادا کرنی لازمی ہیں۔

(۲) خالص مالی عبادت، جیسے زکوٰۃ، فطرہ، قربانی، نذر وغیرہ، ان میں نیابت بالاتفاق جائز ہے، جیسے کوئی مالدار شخص اپنی زکوٰۃ یا فطرہ ادا کرنے کے لئے کسی کو اپنا وکیل مقرر کر سکتا ہے۔

(۳) مرکب عبادت۔ یعنی ایسی عبادت جس کی دونوں حیثیتیں ہیں، مالی بھی اور بدنی بھی جیسے عبادتِ حج، اس میں اگر مکلّف خود ادا کرنے کی جسمانی قدرت رکھتا ہے تو اسے خود ادا کرنا لازمی ہے ورنہ کسی کو اپنا نائب مقرر کر سکتا ہے لیکن یہ شرط فرض حج کیلئے ہے، کوئی کسی کی طرف سے نفلی حج کرنا چاہے یا کسی سے کرانا چاہے تو کسی شرط یا استثناء کے بغیر کر سکتا ہے، خواہ جس کی طرف سے کیا جا رہا ہے یا کرایا جا رہا ہے، وہ زندہ ہے یا وفات پا چکا ہے، اس نے اجازت دی ہو یا نہ دی ہو، وہ خود جسمانی طور پر قدرت رکھتا ہو یا مریض و معذور ہو، کوئی شخص اپنے زندہ یا مرحوم والدین یا عزیز واقارب کی طرف سے خود بھی حج کر سکتا ہے اور کسی دوسرے کو بھی کرا سکتا ہے، الغرض فرض کے مقابلے میں نفلی عبادت میں زیادہ وسعت اور سہولت ہوتی ہے۔ اسی طرح ان عبادات کا ایصالِ ثواب بھی کر سکتا ہے۔

حج بدل کی وصیت پوری کرنا

سوال: میں اپنے مرحوم والدین کیلئے حج بدل کرانا چاہتا ہوں جبکہ انہوں نے اسکی وصیت کی تھی، کیا انکی طرف سے یہ حج بدل ادا ہو جائے گا؟ (محمد انور، لانڈھی۔ کراچی)

جواب: ایصال ثواب کیلئے جو حج بدل یا عمرہ کیا جائے، یہ نفلی عبادت ہے، والدین زندہ ہوں یا وفات پا چکے ہوں، انہوں نے وصیت کی ہو یا نہ کی ہو، ان کے ایصال ثواب کیلئے آپ خود بھی حج اور عمرہ کر سکتے ہیں اور کسی اور کو بھی چاہیں تو بھیج سکتے ہیں،

جس کے ایصال ثواب کیلئے حج یا عمرہ کیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ ازراہ کرم اسے بھی اجر عطا فرمائے گا۔ کرنے والے کو بھی ثواب ملے گا، انشاء اللہ العزیز اور جو بھیجنے والا ہے وہ بھی اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے اجر پائے گا۔

مرحومین کا حج بدل

سوال: اکثر حضرات اپنے مرحوم عزیزوں کے ایصال ثواب کیلئے دوسرے افراد کو حج بدل کے طور پر حج کیلئے بھجواتے ہیں۔ اگر کسی مرحوم شخص مرد یا عورت نے اپنی زندگی میں خود ہی حج کا فریضہ ادا کر لیا ہو تو کیا اس کے نام سے بھی حج بدل کیا جا سکتا ہے؟
(سید صفدر علی۔ کراچی)

جواب: حج بدل کی دو قسمیں ہیں ایک فرض، دوسرا نفلی۔

(۱) حج بدل فرض تو وہ ہے کہ کوئی شخص مالی اعتبار سے صاحب استطاعت ہے، اس پر حج فرض ہے لیکن وہ کسی مرض، معذوری یا ضیعف العمری کی وجہ سے سفر حج اور مناسکِ حج ادا کرنے کی جسمانی قدرت نہیں رکھتا، اس پر لازم ہے کہ اپنی جانب سے حج فرض ادا کرنے کیلئے اپنے وطن اقامت سے کسی کو اپنا حج بدل ادا کرنے کیلئے بھیجے اور اس کے تمام مصارف سفر ادا کرے، ترجیحاً کسی نیک اور دیندار شخص کا انتخاب کرے اور اگر اس نے اپنا حج پہلے سے ادا کر لیا ہے تو ایسا شخص زیادہ بہتر ہے۔

(۲) صاحب استطاعت کیلئے کوئی عذر تھا یا نہیں لیکن بد قسمتی سے اس نے نہ تو زندگی میں خود حج کیا اور نہ ہی کسی کو اپنی جانب سے حج بدل پر بھیجا اور اب ظاہری علامات کے اعتبار سے اس کی موت سر پر ہے، تو وہ اپنی طرف سے حج بدل کرنے کیلئے اپنے کسی وارث یا کسی دوسرے معتمد شخص کو وصیت کرے۔ تمام مصارف حج، اگر وہ اس عرصے میں انتقال کر گیا، تو بطور وصیت اس کے ترکے سے ادا کئے جائیں گے۔

(۳) نفلی حج بدل یا عمرہ کوئی صاحب خیر باقاعدہ بتا کر یا بلا اجازت و اطلاع بھی اپنے

کسی بزرگ، والدین، شیخ طریقت، اساتذہ، اقرباء و احباء یا رسول اللہ ﷺ کے نام سے بھی ایصال ثواب کیلئے کر سکتا ہے۔ دونوں صورتوں میں نیت کرتے وقت اس شخص یا ہستی کا نام لے گا جس کی طرف سے حج بدل یا عمرہ کر رہا ہے۔

قربانی کا وجوب

سوال: میں غریب بھی ہوں اور قرض دار بھی، قربانی کر سکتا ہوں؟

(حافظ نور الامین۔ کراچی)

جواب: آپ کیلئے بہتر تو یہ ہے کہ پہلے قرض سے سبکدوش ہوں، کیونکہ آپ کیلئے دوسرے کا قرض ادا کرنا واجب ہے جبکہ قربانی نفلی ہو گی تاہم قربانی کر دی تو ادا ہو جائے گی اور ثواب ملے گا۔

خصی جانور کی قربانی

سوال: خصی جانور کی قربانی کرنا کیسا ہے؟ کیا کسی جانور کا خصی ہونا عیب میں شمار ہو گا جبکہ عیب دار جانور کی قربانی جائز نہیں ہے؟

(محمد سہیل، عائشہ بیکری، سیکٹر A-11۔ نارتھ کراچی)

جواب: خصی جانور کی قربانی جائز ہے۔ امام ابو داؤد روایت کرتے ہیں "حضرت جابر بن عبداللہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے قربانی کے دن دو سرمئی رنگ کے سینگوں والے خصی مینڈھے ذبح کیے۔" (سنن ابی داؤد ج ۲، ص ۳) اس حدیث پاک سے معلوم ہوا کہ نر جانور کا خصی ہونا، قربانی کے معاملے میں عیب نہیں ہے بلکہ فقہاء نے اسے افضل قرار دیا ہے کیونکہ اس کا گوشت لذیذ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مویشیوں کے تاجروں کے نزدیک بھی یہ عیب نہیں ہے، البتہ اگر کوئی شخص اپنے ریوڑ میں افزائش نسل کیلئے نر جانور خریدنا چاہتا ہے تو آنڈو کو ہی لازماً لے گا۔

عقیقے کا گوشت

سوال: کیا عقیقہ کا گوشت بچے کے والدین کھا سکتے ہیں؟

(محمد یٰسین، پی آئی بی کالونی۔ کراچی)

جواب: عقیقے کے گوشت کا وہی حکم ہے جو قربانی کے گوشت کا ہے، اسے بچے کے والدین، دادا، دادی، نانا، نانی سب لوگ کھا سکتے ہیں۔

دوران حج شوہر کا انتقال ہو جائے تو عورت کیا کرے؟

سوال: ایک خاتون اپنے شوہر کے ساتھ سفر حج پر ہے، دوران سفر اس کے شوہر کا انتقال ہو جاتا ہے تو وہ کیا کرے، حج مکمل کرے یا حج کو نا تمام چھوڑ کر واپس وطن لوٹ آئے یا وہیں پر عدت گزارے۔ (احمد عبداللہ، گلشن اقبال، کراچی)

جواب: حج کے لئے گھر سے روانہ ہوتے وقت عورت کے ساتھ شوہر یا کسی محرم رشتے دار کا رفیق ہونا ضروری ہے، شرعاً محرم اس قریبی مرد رشتے دار کو کہتے ہیں، جس کے ساتھ اس عورت کا نکاح ہمیشہ کے لئے حرام ہو۔ اگر اسے شوہر یا محرم کی رفاقت میسر نہیں ہے تو مالی استطاعت کے باوجود اس پر حج فرض نہیں ہے۔

صورت مسئولہ میں چونکہ گھر سے حج کے لئے روانہ ہوتے وقت اس کو شوہر کی رفاقت حاصل تھی، لہذا اس کا سفر حج شرعاً درست ہے۔ اب اگر حج سے پہلے یا دوران حج قضاء الٰہی سے شوہر کا انتقال ہو گیا ہے تو اس کے لئے بہتر یہ ہے کہ حج پورا کرے، اگر کوئی اور محرم موجود ہے تو اس کے ساتھ، ورنہ شرعی حجاب کے اہتمام کے ساتھ وہ ایسی عورتوں کے گروپ کے ساتھ ساتھ رہے، جن کے محارم اگرچہ موجود ہیں لیکن وہ خدا ترس اور دین دار ہیں۔ حرمین طیبین میں مقررہ مدت سے زائد اقامت ویسے بھی خلاف قانون ہے اور مومن کے لئے عزت نفس کا تحفظ بھی مقاصد شریعت میں سے ہے، لہذا جب حسب پروگرام واپس گھر پہنچ جائے تو گھر پر عدت پوری کرے۔

قربانی کے فضائل و مسائل

قربانی سے مراد ہر وہ عمل ہے، جسے اللہ تعالیٰ کی رضاء، حصول اجر و ثواب اور اس کی بارگاہ کا تقرب حاصل کرنے کے لئے انجام دیا جائے۔ بطور خاص جانور کی قربانی کو عربی میں ''اُضحیہ'' کہتے ہیں، اس کی جمع ''اضاحی'' ہے۔ قربانی کی تاریخ بھی اتنی ہی قدیم ہے، جتنی انسانی تاریخ۔ لیکن امت مسلمہ ہر سال جو قربانی کرتی ہے، یہ حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کی یادگار ہے، چنانچہ: ''زید بن ارقم بیان کرتے ہیں کہ (ایک موقع پر) صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! یہ قربانیاں کیا ہیں؟، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: یہ تمہارے باپ ابراہیم علیہ السلام کی سنت ہے، صحابہ نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! اس میں ہمارے لئے کیا اجر ہے؟ آپ نے فرمایا: قربانی کے جانور کے ہر بال کے عوض ایک نیکی ہے، انہوں نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! اون کا کیا حکم ہے؟، آپ ﷺ نے فرمایا: قربانی کے جانور کی اون کے ہر روئیں کے بدلے میں ایک نیکی ہے، (مشکوٰۃ بحوالہ مسند امام احمد و سنن ابن ماجہ)''۔

ایّام قربانی میں قربانی ایسی نیکی ہے جس کا کوئی اور بدل نہیں ہے، چنانچہ: ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ایام قربانی (۱۰ تا ۱۲ ذی الحجہ) میں انسان کا کوئی بھی عمل اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں قربانی کے جانور کا خون بہانے سے زیادہ محبوب نہیں ہے، اور قیامت کے روز قربانی کا یہ جانور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اپنے سینگوں، بالوں اور کھروں سمیت حاضر ہوگا، اور بلاشبہ قربانی کے جانور کا خون زمین پر گرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں مرتبہء قبولیت کو پالیتا ہے، تو (اے مومنو!) خوش دلی سے قربانی کیا کرو، (مشکوٰۃ بحوالہ جامع ترمذی و سنن ابن ماجہ)، حضور انور ﷺ نے اپنی قربانی کے مواقع پر امت کو بھی یاد فرمایا، چنانچہ: ''حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نے کالے رنگ کا سینگوں والا مینڈھا قربانی کے لئے منگوایا، آپ نے فرمایا: عائشہ! چھری لاؤ! پھر فرمایا: اسے پتھر پر رگڑ کر تیز کرو، میں نے آپ

کے حکم کی تعمیل کی، پھر آپ نے چھری لی اور مینڈھے کو پکڑ کر پہلو کے بل لٹایا اور فرمایا: اللہ کے نام سے، اے اللہ! تو اسے محمد ﷺ، آل محمد ﷺ اور امت محمد ﷺ کی جانب سے قبول فرما، پھر آپ نے اسے ذبح کر دیا" (مشکوۃ حوالہ صحیح مسلم)۔ ایک ہی قربانی میں پوری امت کو شریک کرنا یہ رسول اللہ ﷺ کی خصوصیت ہے، کسی اور کے لئے یہ جائز نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے ایصال ثواب کے لئے قربانی کرنا یہ حضور کے نزدیک بھی پسندیدہ امر ہے، چنانچہ: "حضرت حنش رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ حضرت علی نے دو مینڈھوں کی قربانی کی، میں نے عرض کیا کہ یہ آپ نے کیوں کیا؟ انہوں نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے مجھے وصیت فرمائی تھی کہ میں ان کی جانب سے قربانی کروں تو میں اس لئے ایسا کرتا ہوں، (مشکوۃ بحوالہ سنن ابی داؤد جامع ترمذی وغیرہ)"۔

☆ قربانی ہر صاحب نصاب بالغ مرد اور عورت پر واجب ہے، زکوۃ کی فرضیت کے لئے کم از کم نصاب پر پورا قمری سال گزرنا شرط ہے، جبکہ قربانی اور فطرے کے وجوب کے لئے محض نصاب کا مالک ہونا کافی ہے، سال گزرنا شرط نہیں ہے۔

☆ قربانی کے لئے اونٹ پانچ سال، گائے، بیل اور بھینس دو سال، دنبہ، بکرا، بکری ایک سال کے ہونے چاہئیں، اس سے کم عمر کے جانور کی قربانی جائز نہیں ہے۔ البتہ بھیڑ اور دنبہ اتنے فربہ ہوں کہ دیکھنے میں ایک سال کے نظر آئیں تو ان کی قربانی جائز ہے۔

☆ قربانی کے جانوروں کی عمر پورا ہونے کی ظاہری علامت ثنّی (دو دانت کا) ہونا ہے، لہذا کھیرا جانور یعنی جس کے سامنے کے دو دانت ابھی نہیں گرے یا دودھ کے دانت گرنے کے بعد نئے دانت نہیں نکلے اسے قربانی کے لئے نہیں خریدنا چاہئے۔ البتہ اگر جانور گھر کا پلا ہوا ہے اور اس کی عمر ایک سال پوری ہو گئی ہے تو اس کی قربانی شرعاً جائز ہے۔ خواہ سامنے کے دو دانت ابھی نہ گرے ہوں۔ عام کاروباری لوگوں پر اعتماد بالکل نہیں کرنا چاہئے بلکہ دو دانت باقاعدہ دیکھ کر خریدنا چاہئے۔

☆ قربانی کا جانور تمام عیوب فاحشہ سے سلامت ہونا چاہئے۔ اس سلسلے میں فقہاء کرام نے یہ ضابطہ بیان کیا ہے کہ ہر وہ عیب جو کسی منفعت کو بالکل زائل کر دے یا جمال کو

بالکل ضائع کردے، اس کی وجہ سے قربانی جائز نہیں ہے اور جو عیب اس سے کم تر درجے کا ہو، اس کی وجہ سے قربانی ممنوع نہیں ہوتی۔

☆ جو جانور اندھا، کانا یا لنگڑا ہو یا بہت بیمار اور لاغر ہو یا جس کا کوئی کان، دم یا چکتی تہائی سے زیادہ کٹے ہوئے ہوں یا پیدائشی کان نہ ہوں یا ناک کٹی ہو یا دانت نہ ہوں یا بکری کا ایک تھن یا گائے بھینس کے دو تھن خشک ہوں، ان سب جانوروں کی قربانی جائز نہیں ہے۔

☆ جس جانور کے پیدائشی سینگ نہ ہوں یا سینگ اوپر سے ٹوٹا ہوا ہے، کان، چکتی یا دم ایک تہائی یا اس سے کم کٹے ہوئے ہیں تو ایسے جانوروں کی قربانی جائز ہے۔

☆ صاحب نصاب نے عیب دار جانور خریدا، یا خریدتے وقت بے عیب تھا بعد میں عیب دار ہو گیا تو ان دونوں صورتوں میں اس کے لئے ایسے جانور کی قربانی جائز نہیں، دوسرا بے عیب جانور خریدے اور قربانی کرے اور اگر خدانخواستہ ایسا شخص صاحب نصاب نہیں ہے تو دونوں صورتوں میں اس جانور کی قربانی کر سکتا ہے۔

☆ خصی جانور کی قربانی آنڈو کے بہ نسبت افضل ہے کیونکہ اس کا گوشت لذیذ ہوتا ہے، اگر گائے کے ساتویں حصے کی قیمت بکری سے زیادہ ہو تو وہ افضل ہے اور اگر قیمتیں برابر ہوں تو بکری کی قربانی افضل ہے، کیونکہ بکری کا گوشت زیادہ لذیذ ہوتا ہے۔

☆ بکرا، بکری، بھیڑ، دنبے کی قربانی صرف ایک فرد کی طرف سے ہو سکتی ہے۔ اونٹ، گائے وغیرہ میں زیادہ سے زیادہ سات افراد شریک ہو سکتے ہیں، شرط یہ ہے کہ سب کی نیت تقرب یعنی عبادت اور حصول اجر و ثواب کی ہو۔ سات سے کم افراد بھی ایک گائے کی قربانی میں برابر کے حصے دار ہو سکتے ہیں۔ مثلاً چھ یا پانچ یا چار یا تین یا دو حتیٰ کہ ایک آدمی بھی پوری گائے کی قربانی کر سکتا ہے، سات حصے داروں کا ہونا ضروری نہیں ہے۔

☆ سات افراد نے مل کر قربانی کا جانور خریدا، بعد ازاں قربانی سے پہلے ایک حصے دار کا انتقال ہو گیا۔ اگر مرحوم کے سب ورثاء باہمی رضامندی سے یا کوئی ایک وارث یا چند اپنے حصے وراثت میں سے اجازت دے دیں تو استحساناً اس کی قربانی ہو جائے گی۔

☆ فوت شدہ والدین اور قرابت داروں کے لئے ایصال ثواب کی نیت سے قربانی کی جاسکتی ہے۔ اپنی واجب قربانی ادا کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ توفیق دے تو رسول اللہ ﷺ کی ذات اقدس کے لئے ایصال ثواب کی نیت سے قربانی کرنا افضل ہے، کرنے والے کو بھی ثواب ملے گا اور حضور انور ﷺ کی نسبت سے اس کی قبولیت کا بھی یقین ہے۔ شریعت کی رو سے ہر عاقل وبالغ اللہ کی بارگاہ میں اپنے عمل کے لئے جوابدہ ہے۔ لہذا ایک مشترکہ خاندان میں اگر ایک سے زیادہ افراد صاحب نصاب ہیں تو سب پر فرداً فرداً قربانی واجب ہے، محض ایک قربانی سب کے لئے کافی نہیں ہوگی بالحصہ تعین کے بغیر ادا ہی نہیں ہوگی۔

☆ قربانی کی گائے میں عقیقہ کا حصہ ڈال سکتے ہیں، بہتر یہ ہے کہ لڑکے کے لئے دو حصے ہوں اور لڑکی کے لئے ایک حصہ، اگر دو حصے کی استطاعت نہ ہو تو لڑکے کے لئے ایک حصہ بھی ڈالا جاسکتا ہے۔

☆ افضل یہ ہے کہ قربانی کے گوشت کے تین حصے کئے جائیں، ایک حصہ ذاتی استعمال کے لئے، ایک حصہ اعزاء واقرباء اور احباب کے لئے اور ایک حصہ فقراء اور ناداروں پر صرف کیا جائے۔ سارا گوشت رضا الٰہی کے لئے مستحقین کو دے دینا عزیمت اور اعلیٰ درجے کی نیکی ہے اور اگر خود زیادہ ضرورت مند ہے تو کل یا اکثر گوشت ذاتی استعمال میں لانے کی رخصت واجازت ہے، لیکن یہ روح قربانی کے منافی ہے۔

(نوٹ : شریعت کے مطابق ذبح کئے ہوئے حلال جانور کے مندرجہ ذیل اعضاء کھانے منع ہیں۔ دم مسفوح (ذبح کے وقت بہنے والا خون)، ذکر، گائے، بکری کے پیشاب کی جگہ (فرج)، خصیتین (کپورے)، مثانہ، دبر (جانور کے پاخانے کی جگہ) حرام مغز، اوجھڑی اور آنتیں۔ ان میں سے دم مسفوح حرام قطعی ہے اور باقی مکروہ تحریمی ہیں۔

☆ قربانی کا وقت ۱۰ ذی الحجہ کی صبح صادق سے لے کر ۱۲ ذی الحجہ کے غروب آفتاب تک ہے، گیارہویں اور بارہویں شب میں بھی قربانی ہوسکتی ہے مگر رات کو ذبح کرنا مکروہ

ہے۔ ایسے شہر اور قصبات جہاں عید کی نماز پڑھی جاتی ہے، وہاں نماز عید سے پہلے قربانی جائز نہیں ہے۔

☆ قربانی کے جانور نے ذبح سے پہلے بچہ دے دیا، یا ذبح کرنے کے بعد پیٹ سے زندہ بچہ نکلا، دونوں صورتوں میں یا اسے بھی قربان کر دیں، یا زندہ صدقہ کر دیں یا فروخت کر کے قیمت صدقہ کر دیں، اگر بچہ مردہ نکلے تو اسے پھینک دیں، قربانی ہو جائے گی۔

ذبح کا طریقہ

ذبح کرتے وقت جانور کو بائیں پہلو پر قبلہ رو لٹائیں اور خود ذبح کریں یا کسی سے ذبح کرائیں، چھری تیز ہو اور کم از کم تین رگیں کاٹنی چاہئیں۔

ذبح سے پہلے کی دعا

اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ٥ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ لَاشَرِیْكَ لَهٗ وَبِذَالِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ٥ اَللّٰهُمَّ لَكَ وَمِنْكَ پھر بِسْمِ اللّٰهِ، اَللّٰهُ اَكْبَرُ پڑھ کر چھری پھیر دیں۔

ذبح کے بعد کی دعا

اَللّٰهُمَّ تَقَبَّلْ مِنِّیْ كَمَا تَقَبَّلْتَ مِنْ خَلِیْلِكَ اِبْرَاهِیْمَ عَلَیْهِ السَّلَامُ وَحَبِیْبِكَ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اگر دوسرے کی طرف سے ہو تو مِنِّیْ کے بجائے مِنْ فُلَانٍ (اس شخص کا نام) لیں، گائے ہے تو تمام شرکاء کے نام لیں۔

قربانی کی کھال

قربانی کے جانور کی کھال قصاب کو اجرت میں دینا جائز نہیں ہے کھال بیچ کر اس کی قیمت صدقہ کر دینی چاہیے، کسی نادار شخص کو شخصی طور پر بھی دی جاسکتی ہے۔ لیکن دینی اداروں کو دینا افضل ہے، کیونکہ یہ تبلیغ و اشاعت دین کے کام میں اعانت بھی ہے اور صدقہ جاریہ بھی۔

عقیقہ کی دعا: لڑکے کے لئے

اَللّٰھُمَّ ھٰذِہٖ عَقِیْقَۃُ فُلَانِ بْنِ فُلَانٍ دَمُھَا بِدَمِہٖ وَلَحْمُھَا بِلَحْمِہٖ وَعَظْمُھَا بِعَظْمِہٖ وَجِلْدُھَا بِجِلْدِہٖ وَشَعْرُھَا بِشَعْرِہٖ اَللّٰھُمَّ اجْعَلْھَا فِدَاءً لَّہٗ مِنَ النَّارِ بِسْمِ اللّٰہِ، اَللّٰہُ اَکْبَرُ۔

لڑکی کے لئے

اَللّٰھُمَّ ھٰذِہٖ عَقِیْقَۃُ فُلَانَۃِ بِنْتِ فُلَانٍ دَمُھَا بِدَمِھَا وَلَحْمُھَا بِلَحْمِھَا وَعَظْمُھَا بِعَظْمِھَا وَجِلْدُھَا بِجِلْدِھَا وَشَعْرُھَا بِشَعْرِھَا۔ اَللّٰھُمَّ اجْعَلْھَا فِدَاءً لَّھَا مِنَ النَّارِ۔ بِسْمِ اللّٰہِ، اَللّٰہُ اَکْبَرُ۔

(نوٹ: فلاں فلاں کی جگہ لڑکے یا لڑکی کا نام اور ان کے والد کا نام لیں۔)

(ترجمہ): اے اللہ! یہ فلاں بن فلاں (یا فلانہ بنت فلاں) کا عقیقہ ہے اس کی جان کو اس کی جان کے بدلے میں، اس کے گوشت کو اس کے گوشت کے بدلے میں، اس کی ہڈیوں کو اس کی ہڈیوں کے بدلے میں، اس کی جلد اس کی جلد کے بدلے میں، اس کے بال اس کے بالوں کے بدلے میں (صدقہ ہیں)، اے اللہ تو (ازراہ کرم) اس عقیقے کی برکت سے اس بچے کو نار جہنم سے محفوظ فرما (اور اسے ہر قسم کی آفات سے سلامتی عطا فرما)

تکبیرات تشریق

نویں ذی الحجہ کی فجر سے تیرھویں ذی الحجہ کی عصر تک ہر نماز باجماعت کے بعد ایک مرتبہ بلند آواز سے یہ تکبیر کہنا واجب ہے اور تین مرتبہ کہنا افضل ہے۔ عید گاہ آتے اور جاتے بھی باآواز بلند یہ تکبیر کہنا چاہیے۔

اَللّٰہُ اَکْبَرُ، اَللّٰہُ اَکْبَرُ، لَآ اِلٰہَ اِلاَّ اللّٰہُ وَاللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ وَلِلّٰہِ الْحَمْدُ

☆...☆...☆

کتاب النکاح

خفیہ نکاح کا شرعی حکم

سوال: بعض اوقات لڑکا لڑکی خفیہ طور پر نکاح کر لیتے ہیں اس میں یا تو دونوں کے والدین کی رضامندی شامل نہیں ہوتی یا لڑکی کے والدین کی رضامندی شامل نہیں ہوتی بلکہ بعض صورتوں میں انہیں اطلاع تک نہیں ہوتی ایسے نکاح کا شرعی حکم کیا ہے ایک مولوی صاحب نے اخبار میں لکھا ہے کہ ایسا نکاح باطل ہے؟

(امیر الدین۔ حیدر آباد سندھ)

جواب: ''خفیہ نکاح'' سے کیا مراد ہے؟ اگر مراد یہ ہے کہ لڑکا اور لڑکی تنہائی میں ایجاب و قبول کر لیں تو ایسا نکاح فاسد ہے کیونکہ صحت نکاح کیلئے دو عاقل و بالغ مسلمان مردوں یا ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی شرط ہے، یعنی یہ کہ وہ ایسے دو گواہوں کے سامنے ایجاب و قبول کریں خواہ بذات خود لڑکا اور لڑکی ایجاب و قبول کریں یا اپنے مجاز وکیل کے ذریعے۔ یہاں تک کہ علامہ علاؤالدین حصکفی نے فتاویٰ در مختار میں لکھا ہے کہ اگر لڑکا اور لڑکی نے خلوت میں ایجاب و قبول کیا اور یہ کہا کہ ہم اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کو گواہ بنا کر نکاح کرتے ہیں تو نکاح جائز نہیں۔ اگر خفیہ نکاح سے مراد یہ ہے کہ کسی نے والدین کی رضامندی اور اجازت کے بغیر نکاح کر لیا ہے، نکاح کرنے والی لڑکی بالغہ ہے اور اس نے نکاح اپنے ہم منصب کے ساتھ یعنی کفو میں کیا ہے نکاح کا انعقاد مجلس میں گواہوں کی موجودگی میں ہوا ہے۔ لڑکی نے برضا و رغبت براہ راست یا اپنے وکیل مجاز کی معرفت ایجاب و قبول کیا ہے تو نکاح منعقد ہو جائے گا۔ یہ الگ بات ہے کہ اخلاقاً ایسا نہیں ہونا چاہئے بہت سے امور اخلاقی اقدار کے خلاف ہونے کے باوجود قانونی اور شرعی طور پر نافذ ہو جاتے ہیں اور موثر ہوتے ہیں، لیکن جس معاشرے میں دفاتر اور اداروں میں مرد و زن کا آزادانہ اختلاط ہو، تعلیمی اداروں میں مخلوط تعلیم ہو، لڑکیوں کی گھروں سے باہر حجاب شرعی کے بغیر آزادانہ آمدورفت ہو تو ایسے

معاشرے میں اعلیٰ اخلاقی اقدار کی توقع کیسے کی جاسکتی ہے، فقط اس کی تمنا اور آرزو کی جاسکتی ہے۔ البتہ اگر لڑکی نے اپنا نکاح برضا ورغبت کیا ہے مگر غیر کفو میں کیا ہے یعنی وہ رشتہ دین داری، حسن وجمال، منصب اور پیشے کے اعتبار سے اس کے خاندان کیلئے باعث عار ہے تو اس سلسلے میں فقہاء کرام کی مختلف آراء ہیں، بعض کے نزدیک یہ نکاح جائز ہی نہیں ہے جبکہ ولی اس پر راضی نہ ہو وہ اسے فسخ کر سکتا ہے، بعض کے نزدیک ولی کو اس سلسلے میں عدالت کے ذریعے نکاح کو فسخ کرانے کا حق حاصل ہے، بعض کے نزدیک ہم کفو ہونے کیلئے اسلام ہی کافی ہے۔ تاہم موجودہ شہری معاشرے میں جہاں انساب مخلوط ہوں، دین داری اور تقوے کو چھوڑ کر دولت ہی معیارِ عزت قرار پائے وہاں یہ ثابت کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ کون کسی کا ہم کفو ہے اور کون نہیں ہے، بلکہ یہ بحث ہی بے معنی ہو جاتی ہے اگر ہمیں ان نتائج سے بچنا ہے تو اپنی اولاد کی دینی تربیت کا اہتمام کرنا چاہیے۔

ٹیلیفون پر نکاح

سوال: میں نے اپنی کزن کے ساتھ تین گواہوں کی موجودگی میں فون پر نکاح کیا ہے جبکہ میں کراچی میں تھا اور لڑکی سرحد میں، کیا یہ نکاح ہو گیا؟

(نسیم اختر، لی مارکیٹ۔ کراچی)

جواب: شرعاً نکاح کے جواز کیلئے شرط یہ ہے کہ مجلس نکاح میں دو گواہوں کی موجودگی میں ایجاب وقبول ہو، فریقین (یعنی لڑکا اور لڑکی) دونوں موجود ہوں اور براہِ راست ایجاب وقبول کریں یا وہ دونوں یا ان میں سے کوئی ایک موجود نہ ہو تو اپنے اپنے وکیل کے ذریعے ایجاب وقبول کر سکتے ہیں، حکومت کے مجوزہ نکاح نامے میں دونوں کے وکیل مع گواہوں کے کالم اور دستخطوں کی نشاندہی موجود ہے۔ ہمارے ہاں عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ لڑکا محفل نکاح میں موجود ہوتا ہے اور لڑکی

کی طرف سے اس کا وکیلِ مجاز ایجاب و قبول کرتا ہے جو باقاعدہ گواہوں کی موجودگی میں لڑکی سے نکاح کی اجازت لے کر آتا ہے، لہذا اگر لڑکے یا لڑکی نے جو محفل نکاح میں اصالتہً یا وکالتہً موجود نہیں ہے، محض ٹیلیفون پر ایجاب و قبول کیا تو یہ نکاح شرعاً نہیں ہوا اور وہ دونوں بدستور ایک دوسرے کیلئے اجنبی ہیں۔ ایسے نکاح کے جواز کی شرعی صورت یہ ہے کہ لڑکا یا لڑکی جو مجلس نکاح میں موجود نہیں، تحریری طور پر یا ٹیلی فون پر کسی کو اپنا وکیل بنالے اور وہ وکیل اس کی جانب سے بالمشافہ ایجاب و قبول کرے تو یہ نکاح شرعاً جائز ہوگا۔ آپ کے نکاح میں چونکہ یہ شرط مفقود ہے لہذا آپ کا نکاح شرعاً نہیں ہوا اور اس کی کوئی شرعی حیثیت نہیں ہے۔

سول میرج کی شرعی حیثیت

سوال: ''سول میرج'' کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ (ش شاہد۔ کراچی)

جواب: لڑکی اپنا شناختی کارڈ، میڈیکل سرٹیفکیٹ یا کوئی بھی دستاویزی ثبوت پیش کر کے کسی مجاز عدالت کے سامنے اپنے آپ کو شناخت کرا کے اپنی بلوغت کا ثبوت پیش کردے اور عدالت کو مطمئن کردے کہ وہ اپنی آزادانہ مرضی سے بلاجبر کسی سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ عدالت اس کو مطمئن ہونے کے بعد اجازت دے دے اور وہ اپنے پسندیدہ شخص سے باقاعدہ نکاح کرلے تو اسے عرف عام اور قانون کی اصطلاح میں ''سول میرج'' کہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس میں والدین اور سرپرست کی مرضی اور اجازت شامل نہیں ہوتی، تاہم قانوناً یہ شادی منعقد ہو جاتی ہے۔ اس سے معاشرتی مسائل پیدا ہوتے ہیں بعض اوقات نوبت قتل تک جا پہنچتی ہے۔ فقہ حنفی کی رو سے شادی کیلئے عاقلہ و بالغہ لڑکی کی رضامندی ضروری ہے۔ لہذا والدین کو چاہئے کہ وہ شادی کیلئے لڑکی کی آزادانہ مرضی ضرور معلوم کرلیں۔ لڑکی کو بھی چاہئے کہ وہ جذباتی فیصلہ نہ کرے کیونکہ جذباتی فیصلے بعض اوقات تباہ

کن ثابت ہوتے ہیں اور ایسی شادیاں اکثر ناکام رہتی ہیں۔ لڑکی اگر ولی کی اجازت کے بغیر غیر کفو کے ساتھ شادی کرلے تو ولی کو عدالت کے ذریعے نکاح فسخ کرانے کا حق حاصل ہے، کفو سے مراد یہ ہے کہ لڑکا اور لڑکی حسب ونسب، مال و دولت، دینداری اور صنعت و حرفت یعنی پیشے کے لحاظ سے ہم پلہ ہوں۔ آج کل کے جدید شہری ماحول میں عہدہ و منصب اور تعلیم بھی اس معیار میں شامل ہے۔

محرم اور صفر میں نکاح

سوال : کیا محرم اور صفر میں نکاح کرنا منع ہے ؟ (سید اکرم شاہ، لسبیلہ۔ کراچی)

جواب : محرم، صفر یا سال کے کسی بھی مہینے میں نکاح کرنا منع نہیں ہے۔

مایوں اور مہندی کی شرعی حیثیت

سوال : مایوں اور مہندی کی شرعی حیثیت کیا ہے ؟ (شہناز شاہد و شازیہ ڈینیل۔ کراچی)

جواب : مایوں اور مہندی کی شرعی حیثیت کچھ بھی نہیں ہے یہ معاشرتی رسوم ہیں لیکن اگر ان میں خلاف شرع باتیں شامل ہوں مثلاً بے پردگی، گانا بجانا، مرد و زن کا اختلاط وغیرہ تو ان محرمات کے سبب یہ حرام ہوں گی۔ شرعاً صرف نکاح ہے یعنی مجلس میں گواہوں کی موجودگی میں تاکہ اس کا اعلان ہو جائے اور شرعی حجاب کے ساتھ باوقار انداز میں رخصتی ہے اور شب زفاف کے بعد ولیمہ سنت ہے باقی سب خرافات ہیں۔

قرآن میں نکاح کا لکھنا

سوال : ایک شخص نے قرآن مجید کے اندر یہ لکھا کہ میں اپنی بیٹی کا نکاح فلاں شخص سے کراؤں گا، بعد میں اس نے کسی اور سے اپنی بیٹی کا نکاح کرادیا، کیا یہ نکاح ہو گیا؟ نکاح پڑھانے والے کا کیا حکم ہے ؟ (علی محمد جلبانی، ٹنڈوالہ یار)

جواب : مذکورہ بالا صورت میں کسی شخص کا یہ کہنا یا لکھنا کہ میں اپنی بیٹی کا نکاح فلاں شخص

سے کراؤں گا۔ یہ نکاح منعقد نہیں ہوا بلکہ یہ محض ارادۂ نکاح ہے لہذا وہ اپنی بیٹی کا نکاح شریعت کے مطابق کسی سے بھی کرا سکتا ہے اور وہ نکاح جائز ہوگا اور اس کا پڑھانا بھی جائز ہے۔ البتہ کسی سے یہ کہا ہو کہ میں اپنی بیٹی کا نکاح تم سے یا تمہارے بیٹے سے کراؤں گا تو بھی یہ نکاح منعقد نہیں ہوا ہاں اس طرح کا وعدہ کر کے خلاف ورزی کی ہو تو وعدہ خلافی کا گناہ ہوگا۔ قرآن مجید ان کاموں کیلئے، قسمیں کھانے کیلئے نازل نہیں ہوا، یہ تو کتاب ہدایت ہے، تلاوت کرنے، سمجھنے اور اس کے احکام پر عمل کرنے کیلئے ہے۔

قادیانی مرد سے مسلمان عورت کا نکاح

سوال: کیا کسی قادیانی مرد (جس کے قادیانی ہونے پر تین یا اس سے زائد افراد گواہی دے چکے ہوں) کو حنفی مسلمان لڑکی کا رشتہ دینا جائز ہے؟ اگر ناجائز ہے تو ایسی صورت میں لڑکی کے والدین اور لڑکی کیلئے کیا حکم ہے؟ کیا یہ سب دائرۂ اسلام سے خارج ہو جائیں گے یا نہیں؟ اس رشتے کی حمایت کرنے والے افراد کے بارے میں کیا حکم ہے؟ (اے آفتاب، لانڈھی۔ کراچی)

جواب: کوئی شخص پہلے مسلمان تھا اور پھر اسلام سے منحرف ہو کر قادیانی ہو گیا تو یہ مرتد ہے اور مرتد سے مسلمان کا نکاح باطل ہے، اگر کسی شخص کا باپ یا دادا مرتد ہو کر قادیانی ہو گیا تھا بعد میں اس کے اولاد ہوئی جو اس باطل عقیدے پر قائم رہی تو یہ لوگ کافر ہیں اور کافر سے بھی مسلمان عورت کا نکاح جائز نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "اور مشرک مردوں کے ساتھ (مومن عورتوں کا) نکاح نہ کراؤ جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں" (البقرہ: ۲۲۱) اس آیت میں مشرک سے نکاح کی ممانعت کے حکم میں کافر، مجوسی اور بت پرست سب شامل ہیں۔ جو مسلمان والدین جان بوجھ کر اور حلال سمجھ کر اپنی بیٹی کا نکاح قادیانی کے ساتھ کریں تو اس سے کفر لازم آتا ہے انہیں چاہئے کہ فوراً توبہ کریں اور تجدید نکاح کریں۔

تجدید ایمان اور تجدید نکاح

سوال: تجدید ایمان اور تجدید نکاح کا فتویٰ ایک مسلمان پر کب لگایا جائے گا؟

(چشتی دلبر چوہان، گلشنِ حدید، ضلع ملیر۔ کراچی)

جواب: زوجین میں سے جب کسی ایک سے کفر سرزد ہو جائے گا تو ان کا نکاح باطل ہو جاتا ہے اور وہ ایک دوسرے کیلئے اجنبی ہو جاتے ہیں، جس شخص (شوہر ہو یا بیوی) نے ارتکابِ کفر کیا ہے، اس پر لازم ہے کہ کفر سے توبہ کرے، تجدید ایمان کرے اور دو گواہوں کی موجودگی میں تجدید نکاح کریں، لیکن یہ تجدید نکاح عورت کی رضامندی پر موقوف ہے، یک طرفہ طور پر نہیں ہو سکتا، باقاعدہ ایجاب و قبول ہو گا اور مہر بھی مقرر کیا جائے گا۔ اب رہا سوال کہ کن صورتوں میں کسی پر التزامِ کفر کیا جائے گا تو سارے کفریات کا احاطہ ممکن نہیں ہے تاہم چند اصولی باتیں سمجھ لیں۔ مثلاً سارے قرآن مجید یا کسی ایک آیت کا انکار کرنا، مطلقاً حدیث کا انکار کرنا، دین کے ان سب عقائد، ارکان اور اصول یا ان میں سے کسی ایک کا انکار جو نصوص صریحہ قطعیہ سے ثابت ہیں، توہینِ رسالت اور مسلمہ شعائر دین کی توہین و تحقیر، شریعت کے حلال کو حرام قرار دینا اور حرام کو حلال قرار دینا، جیسے زنا، سرقہ، قتل اور شراب نوشی کو حرام جان کر کرنا گناہ کبیرہ، فسق و فجور اور ضلالت ہے اور ان گناہوں میں سے کسی ایک کو حلال سمجھ کر کرنا کفر ہے۔ باقی جب کوئی مسئلہ سامنے آتا ہے تو اس کے بارے میں سیاق و سباق کو سامنے رکھ کر فتویٰ صادر کیا جاتا ہے۔

نامناسب حرکت

سوال: شوہر اگر غلطی سے اپنی بیوی کا دودھ چوس لے تو کیا اس سے نکاح پر اثر پڑے گا؟

(ش ب، جگہ نامعلوم)

جواب: انسانی جزو سے نفع اٹھانا حرام و ممنوع ہے۔ لہٰذا آپ کے شوہر کا یہ فعل شرعاً حرام

ہے، تاہم اس سے نکاح پر کوئی اثر نہیں پڑتا، کیونکہ رضاعت یعنی دودھ کے رشتے سے جو حرمت نکاح ثابت ہوتی ہے، وہ ایام رضاعت (مدتِ شیر خوارگی) تک محدود ہے اور اس کی زیادہ سے زیادہ مدت شرعاً دو سال کی عمر تک ہے اور بعض فقہاء سے احتیاطاً ڈھائی سال تک کا قول مروی ہے۔

مہر کی شرعی مقدار

سوال: مہر کی شرعی مقدار کیا ہے یا مہر شرعی کسے کہتے ہیں؟

(سید ذاکر شاہ، لانڈھی۔ کراچی)

جواب: مہر شرعی وہی ہے جس پر فریقین نکاح کا آپس میں اتفاق ہو جائے، شریعت نے اس کی کوئی انتہائی حد مقرر نہیں کی بلکہ اسے فریقین کی باہمی رضامندی پر چھوڑا ہے اور اس میں مختلف مالی حیثیتوں کے افراد کیلئے کم یا زیادہ کی گنجائش رکھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ایک بار حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے زیادہ مقدار میں مہر مقرر کرنے پر گرفت فرمانا چاہی تو ایک عورت نے کھڑے ہو کر دریافت کیا کہ جس چیز کو شریعت نے کھلا چھوڑا ہے، آپ کو اس کی تحدید کا کیا حق ہے؟ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس خاتون کے موقف کو درست تسلیم کرتے ہوئے فرمایا "عورت نے درست کہا، عمر کی بات غلط ہے۔" بس شرط یہ ہے کہ محض کسی کو دباؤ میں رکھنے کیلئے بھاری مہر مقرر نہیں کرنا چاہئے جبکہ نظریہ یہ ہو کہ کس کو لینا ہے اور کس کو دینا ہے، کیونکہ یہ سوچ شریعت کی منشا اور روح کے خلاف ہے۔ ادا کرنے کی نیت بھی ہو اور ادا کرنا بھی چاہئے۔ البتہ حدیث پاک میں کم از کم مہر کی مقدار دس درہم (یعنی تقریباً 30.618 گرام چاندی یا اس کی قیمت) مقرر کی گئی ہے۔

حضور ﷺ اور حضرت خدیجہ کا خطبۂ نکاح

سوال: حضور ﷺ کا جب حضرت خدیجہ سے نکاح ہوا تو اس کا خطبہ کس نے پڑھا اور اس کے کلمات کیا تھے؟

(فاطمہ بنت عبداللہ گلشن اقبال، کراچی)

جواب: حضرت محمد (ﷺ) کا جب حضرت خدیجہ سے نکاح ہوا تو اس وقت آپ کی عمر ۲۵ سال اور حضرت خدیجہ کی عمر ۴۰ سال تھی۔ تقریب نکاح میں حضور ﷺ کی طرف سے وکالت کا فریضہ آپ کے چچا حضرت ابو طالب نے انجام دیا اور حضرت خدیجہ کی وکالت ان کے چچا عمرو بن اسد نے کی۔ تقریب نکاح میں قبیلہ مضر کے رؤساء اور مکہ کے امراء واشراف جمع تھے۔ حضرت ابو طالب نے جو فصیح وبلیغ خطبہ ارشاد فرمایا، اس کا ترجمہ یہ ہے:

"سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جس نے ہمیں حضرت ابراہیم کی اولاد سے، حضرت اسماعیل کی کھیتی سے، معد کی نسل سے اور مضر کی اصل سے پیدا فرمایا۔ نیز ہمیں اپنے گھر کا پاسبان اور اپنے حرم کا منتظم مقرر کیا، ہمیں ایک ایسا گھر دیا جس کا حج کیا جاتا ہے اور ایسا حرم بخشا جہاں امن میسر آتا ہے، نیز ہمیں لوگوں کا حکمران مقرر کیا۔ حمد کے بعد، میرا یہ بھتیجا جس کا نام محمد بن عبداللہ (ﷺ) ہے، اس کا دنیا کے جس بڑے سے بڑے آدمی کے ساتھ موازنہ کیا جائے گا، اس کا پلڑا بھاری ہو گا۔ اگر یہ مالدار نہیں تو کیا ہوا، مال تو ایک ڈھلنے والا سایہ ہے اور بدل جانے والی چیز ہے۔ اور محمد (ﷺ) جس کی قرابت کو تم خوب جانتے ہو، اس نے خدیجہ بنت خویلد کا رشتہ طلب کیا ہے اور ساڑھے بارہ اوقیہ سونا مہر مقرر کیا ہے اور خدا مستقبل میں اس کی شان بہت بلند ہو گی۔"

☆...☆...☆

كتاب الطلاق

طلاق کا احسن طریقہ

سوال: طلاق اگرچہ ایک انتہائی ناپسندیدہ فعل ہے، لیکن بعض اوقات اس کی نوبت آہی جاتی ہے۔ طلاق دینے کا احسن طریقہ کیا ہے جس کے نتیجے میں پیچیدگیاں کم سے کم ہوں؟ (سید ناصر علی قادری، گلشن اقبال)

جواب: اسلامی تعلیمات کا منشا اور مزاج یہی ہے کہ عورت، مرد کے مابین "رشتۂ مناکحت" تاحیات قائم رہے، مگر بعض حالات میں طلاق اور خلع کا راستہ کھلا ہے۔ طلاق کی وہ صورت جسے فقہاء نے "احسن" قرار دیا ہے اور اسے "طلاقِ سُنّی" سے تعبیر کیا ہے درج ذیل ہے۔ (نوٹ: "طلاقِ سُنّی" کہنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ طلاق دینا رسول اللہ ﷺ کی سنت ہے، البتہ آپ ﷺ نے اپنی زوجۂ مطہرہ حضرت حفصہ کو طلاق دی تھی، لیکن بعد میں رجوع کرلیا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ طلاق کا وہ طریقہ ہے جو خود رسول اللہ ﷺ نے تعلیم فرمایا)۔ شوہر نے جن ایّام طہر (پاکیزگی، یہ اصطلاح "حیض" کے مقابلے میں استعمال ہوتی ہے) میں اپنی بیوی سے ہم بستری نہ کی ہو، ان میں اپنی بیوی کو ایک "طلاق رجعی" دے دے یعنی یوں کہے کہ "میں نے تمہیں ایک طلاق دی" یا "میں تمہیں ایک طلاق دیتا ہوں" اس کے بعد تین حیض گزرنے پر "عدت" مکمل ہوجاتی ہے۔ "طلاق رجعی" کا فائدہ یہ ہے کہ "عدت" کے دوران یہ شوہر جب چاہے رجوع کرسکتا ہے، اس میں کوئی شرعی رکاوٹ نہیں ہے۔ یہ رجوع عمل سے بھی ہوسکتا ہے۔ محض زبانی یہ کہہ کر بھی کہ "میں رجوع کرتا ہوں" اور اس کیلئے کسی فتوے یا عدالتی فیصلے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔ بس بحیثیت مسلمان مسئلہ شرعیہ معلوم ہونا چاہئے، اور اگر خدانخواستہ شوہر نے عدت کے اندر رجوع نہ کیا ہو تو عدت گزرنے پر یہی "طلاق رجعی" "ایک "طلاق بائن" ہوجاتی ہے اور میاں بیوی جب چاہیں بغیر کسی "حلالے" یا کسی رکاوٹ کے باہمی رضامندی سے دوبارہ عقد نکاح کرسکتے ہیں۔ اور اس عقدِ ثانی کے بعد صرف ایک تبدیلی رونما ہوگی کہ شوہر کو آئندہ صرف دو طلاقوں کا حق حاصل رہے گا، اور آئندہ اگر کسی وجہ سے اس نے "دو طلاقیں" (ایک ساتھ یا الگ الگ وقفوں میں) دے دیں تو طلاقِ مغلظہ ہوجائے گی۔

طلاق لینے کا طریقہ

سوال: طلاق لینا چاہتی ہوں، کیا طریقہ اختیار کروں؟ (زینب حبیب۔ کراچی)

جواب: اگر شوہر صحیح ہو، شریعت کے مطابق تمام حقوق ادا کررہا ہو، اپنی مالی حیثیت کے مطابق نان نفقہ یعنی خوراک، لباس اور رہن سہن کی سہولتیں بھی دے رکھی ہوں تو طلاق لینا شرعاً انتہائی ناگوار بات ہے، اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی ناشکری بھی ہے، حتی الامکان کوشش کرکے اپنے جذبات وخواہشات کو قابو میں رکھیں۔ اگر خدانخواستہ آپ اپنے جذبات سے ایسی ہی مغلوب ہیں کہ آپ کیلئے اللہ تعالیٰ کی حدود میں رہ کر شوہر کے ساتھ ازدواجی زندگی گزارنا مشکل ہے، یا خدانخواستہ آپ کسی گناہ میں مبتلا ہوسکتی ہیں تو پھر قرآن مجید نے گلوخلاصی کی یہ صورت، سورۃ البقرہ میں تعلیم فرمائی ہے کہ عورت اپنا حق مہر معاف کردے یا لے رکھا ہے تو شوہر کو واپس کردے اور شوہر اس کے بدلے میں اسے آزادی دے دے، یہ شریعت کی اصطلاح میں "خلع" کہلاتا ہے، اس سے ایک طلاق بائن واقع ہوجاتی ہے، اور اگر اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے دوبارہ دلوں کو مائل فرمادے تو دونوں باہمی رضامندی سے نکاح کرسکتے ہیں، عدت کے اندر بھی اور عدت کے بعد بھی۔ "خلع" کی یہ صورت عدالت کے باہر بھی ہوسکتی ہے، اس کیلئے عدالت سے رجوع کرنا ضروری نہیں ہے۔

تحریری طلاق

سوال: میری شادی تین سال قبل ہوئی تھی۔ میری بیوی گاؤں میں رہتی ہے، میں نے اسے تین طلاقیں لکھ کر بھیجی ہیں، کیا اس طرح طلاق واقع ہوجاتی ہے؟

(نظام الدین بالادی، ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ کراچی)

جواب: طلاق زبانی دی جائے یا تحریری طور پر، واقع ہوجاتی ہے اور تین طلاق دینے سے عورت حرام ہوجاتی ہے، لہٰذا اب وہ آپ کی بیوی نہیں رہی اور جس وقت تین طلاق لکھ کردی ہے، عدت کا حساب اس وقت سے ہوگا۔

طلاق مغلظہ کے باوجود بیوی کا شوہر کے ساتھ رہنا اور اولاد کے نسب کا مسئلہ

سوال: ایک شخص نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیں اور اس کے بعد وہ میاں بیوی بدستور ازدواجی زندگی بسر کرتے رہے، طلاق کے تقریباً ۶ ماہ بعد ان کے ہاں ایک بچی پیدا ہوئی اور اب وہ دوبارہ پانچ ماہ کی حاملہ ہے، اس دوران شوہر نے بیوی پر دباؤ ڈالا کہ وہ طلاق کے معاملے کو صیغۂ راز میں رکھے۔ مگر جب بیوی کے والدین کو معلوم ہوا تو انہوں نے اپنی بیٹی کو اپنے ہاں بلوالیا۔ اب شوہر نے یہ موقف اختیار کیا کہ وہ نیوٹاؤن مسئلہ معلوم کرنے گئے تھے مگر وہاں کوئی عالم نہ ملا، پھر انہوں نے ایک وکیل سے مشورہ کیا تو اس نے کہا کہ طلاقیں تین طہر میں الگ الگ دینے سے موثر ہوتی ہیں، ورنہ نہیں، تم مزے سے زندگی گزارو۔ شوہر نے یہ بھی عذر تراشا کہ وہ طلاقیں دیتے وقت غنودگی کی کیفیت میں تھا۔ بعد میں وہ بڑا پچھتایا، لیکن سارا واقعہ اسے پوری طرح یاد ہے اور معلوم ہے، اب دریافت طلب مسئلہ یہ ہے کہ (۱) آیا تین طلاقیں دیتے ہی واقع ہو گئی تھیں؟ (۲) اگر جواب اثبات میں ہے تو اس کے بعد دونوں کے میاں بیوی کی حیثیت سے رہنے کا کیا حکم ہے؟ (۳) عدت کب سے شروع ہوئی اور کب ختم ہوئی؟ (۴) پہلی بچی کے نسب کا کیا حکم ہے؟ (۵) دوسرے حمل سے پیدا ہونے والے بچے کا حکم؟ (۶) جن لوگوں یا خاندان کے افراد نے طلاق سے باخبر ہونے کے باوجود اس جوڑے کے ساتھ میل جول رکھا، ان کا کیا حکم ہے؟ (۷) وکیل صاحب کا کیا حکم ہے؟

(نوٹ: تفصیلی سوال کا خلاصہ درج کیا گیا ہے)

(عبداللہ۔ دستگیر کالونی۔ کراچی)

جواب: صورت مسئولہ میں بادی النظر میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ طلاق دیتے وقت خاتون حاملہ تھیں کیونکہ تین طلاقیں شوہر نے ۱۴ اپریل ۹۹ء کو دیں اور ۱۰ اکتوبر ۹۹ء کو بچی پیدا ہوئی۔ تاہم حالتِ حمل میں بھی طلاق دی جائے تو شرعاً مؤثر ہوتی ہے اور اس کی عدت وضع حمل تک ہے۔ لہٰذا ۱۰ اکتوبر ۹۹ء کو بچی پیدا ہوتے ہی عدت ختم

ہو گئی اور اب وہ خاتون شوہر کیلئے مکمل طور پر اجنبی ہو گئی۔ ایک مجلس میں تین طلاقیں دی جائیں تو وہ شرعاً تین ہی شمار ہوتی ہیں، اس پر ائمہ اربعہ کا اجماع ہے اور طلاق ثلاثہ مغلظہ کے بعد شوہر کیلئے اپنی بیوی کے ساتھ عدت کے اندر بھی وطی کرنا حرام ہے، لہذا دورانِ عدت اگر میاں بیوی مباشرت کرتے رہے ہیں تو انہیں حرام اور گناہ کبیرہ کے ارتکاب پر اللہ تعالیٰ سے ہمیشہ توبہ کرتے رہنا چاہئے۔ اس بچی کے ثبوت نسب میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے۔ یہ اس شخص کی صحیح النسب بیٹی ہے اور اس کی وارث بھی بنے گی۔ پہلی بچی کی پیدائش کے بعد جو ان دونوں نے میاں بیوی کے طور پر رہتے ہوئے زندگی گزاری اور اس دوران جتنی بار بھی مباشرت کی، وہ شرعاً زنا کے حکم میں ہے، جو گناہِ کبیرہ ہے اور دونوں کو تاحیات اس ارتکابِ گناہ پر اللہ تعالیٰ سے عجز و نیاز کے ساتھ اور صدقِ دل سے معافی مانگتے رہنا چاہئے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "بلاشبہ اللہ تعالیٰ (اس جرم کو تو) معاف نہیں فرماتا کہ اس کے ساتھ شریک ٹھہرایا جائے اور اس کے علاوہ جس کیلئے چاہے سب گناہوں کو بخش دیتا ہے۔" لیکن یہ عفو و مغفرت بندے کا حق نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کی شان کرم پر موقوف ہے۔ اس گناہ کی تلافی کا مالی کفارہ نہیں ہے۔ شوہر کا یہ کہنا کہ وہ غنودگی یا نیند کے عالم میں تھے، اس لئے درست نہیں کہ انہیں سب کچھ یاد ہے، اپنی غلطی اور اس کی سنگینی کا بھی انہیں اسی وقت احساس تھا۔ دارالاسلام میں احکام شرعیہ ضروریہ سے جہالت عذر نہیں ہے، اور کراچی ایسے شہر میں مسائل شرعیہ بتانے والے سینکڑوں علماء موجود ہیں اور دسیوں دارالافتاء ہیں، ایک نیوٹاؤن ہی نہیں ہے۔ تاہم وکیل کے گمراہ کرنے پر چونکہ انہیں بقاء نکاح کا شبہ تھا اور خاتون بدستور ان کے فراش پر رہیں، لہذا بچہ ثابت النسب ہوگا۔ خاتون کے سابق شوہر کی اولاد ہوگا اور اس کا وارث بھی بنے گا، اور دونوں بچوں کی کفالت کے مصارف ان کے باپ کے ذمے ہوں گے۔

فتاویٰ عالمگیری ج ۱، ص ۵۴۰ پر ہے:

"ولو طلقها ثلاثا ثم تزوجها قبل ان تنكح زوجا غيره فجاءت منه بولد ولا يعلمان بفساد النكاح فالنسب ثابت وان كانا يعلما ن بفساد النكاح يثبت النسب ايضا عند ابى حنيفة۔" "یعنی اگر شوہر نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیں، پھر قبل اس کے کہ وہ کسی دوسرے شخص کے ساتھ نکاح کرتی (اور وہ اس کو طلاق دیتا اور عدت گزر جاتی) اس نے اس سے نکاح (ثانی) کرلیا اور اس کے نتیجے میں بچہ پیدا ہو گیا اور ان دونوں (میاں بیوی) کو فسادِ نکاح کا علم نہیں تھا تو بچے کا نسب ثابت ہو جائے گا، اور اگر انہیں فسادِ نکاح کا علم بھی تھا تب بھی امام اعظم ابو حنیفہ کے نزدیک بچہ ثابت النسب ہو گا۔"

نوٹ: اس جیسی صورتحال میں جو سوال میں مذکور ہے، اگر قرب وجوار کے لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ طلاق مغلظہ کے باوجود، وہ لوگ میاں بیوی کی حیثیت سے رہ رہے ہیں تو انہیں ایسے لوگوں کو فہمائش کرنی چاہئے اور اگر وہ پھر بھی باز نہ آئیں تو ان کا سماجی مقاطعہ کرنا چاہئے۔

اسی طرح اگر خاوند کے والدین اور اہل خانہ طلاقِ مغلظہ کا علم ہونے کے باوجود سکوت اختیار کئے رہے تو وہ بھی شدید گنہگار ہیں اور انہیں توبہ کرنی چاہئے۔ جس وکیل نے گمراہ کیا ہے وہ بھی ضال اور مُضل ہے اور اسے اللہ تعالیٰ سے توبہ کرنی چاہئے۔

حاملہ کو طلاق

سوال: کسی شخص نے اپنی بیوی کو طلاق دی اور بعد میں پتہ چلا کہ وہ حاملہ ہے تو کیا ایسی صورت میں طلاق واقع ہو جائے گی؟ (سید عزیز برنی، دستگیر کالونی۔ کراچی)

جواب: کسی بات کا اخلاقاً معیوب ہونا، شقاوت اور سنگ دلی کا مظہر ہونا، بے مروتی اور قطع رحمی کا باعث بننا اور اس کا قانوناً وشرعاً نافذ ہونا، دو الگ امور ہیں۔ ہماری روزمرہ زندگی میں بہت سی ایسی باتیں وقوع پذیر ہوتی ہیں جو انتہائی بد اخلاقی کے زمرے میں آتی ہیں، لیکن ان کے ارتکاب سے قانونی وفطری نتائج ضرور مرتب ہوتے ہیں، حالتِ حمل میں دی گئی طلاق کی بھی یہی صورتحال ہے کہ اگرچہ یہ انتہائی سنگ

دلی، بے رحمی اور بے مروتی کی بات ہے، لیکن اگر خدانخواستہ کسی نے اپنی حاملہ بیوی کو طلاق دے دی تو واقع ضرور ہو جائے گی، سورۃ الطلاق آیت نمبر ۴ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: ”اور حاملہ عورتوں کی عدت وضع حمل ہے۔“ یعنی بچہ پیدا ہوتے ہی عدت ختم ہو جائے گی اور فرمان باری تعالیٰ ہے ”اگر وہ (طلاق یافتہ عورتیں) حاملہ ہوں تو وضع حمل تک انہیں نفقہ دو۔“ قرآن کا حاملہ عورت کی عدت بیان کرنا، اس بات کی دلیل ہے کہ حالتِ حمل میں طلاق واقع اور موثر ہو جاتی ہے۔

طلاق کا حق بیوی کو دینا

سوال: نکاح کے وقت اگر شوہر اپنی بیوی کو طلاق کا حق تفویض کرنا چاہے تو کیا یہ درست ہے؟ اس کا صحیح شرعی طریقہ کیا ہے؟ (انیسہ کریم، کھارادر۔ کراچی)

جواب: شوہر چاہے تو طلاق کا حق بیوی کو تفویض کر سکتا ہے، لیکن یہ تب ہوگا جب عورت اس کے نکاح میں آجائے۔ اس کا صحیح شرعی طریقہ یہ ہے کہ نکاح کے وقت لڑکی براہ راست لڑکے سے کہے ”میں نے اپنے نفس کو اتنے مہر کے عوض اس شرط کے ساتھ تیرے نکاح میں دیا کہ بعد میں جب کبھی بھی میں چاہوں، مجھے خود کو طلاق دینے کا اختیار حاصل ہوگا۔“ یا لڑکی کا وکیل لڑکے سے کہے کہ ”میں نے اپنی مؤکلہ فلاں بنت فلاں کو اتنے مہر کے عوض اس شرط کے ساتھ تیرے نکاح میں دیا کہ بعد میں جب کبھی میری موکلہ چاہے اسے اپنے آپ کو طلاق دینے کا اختیار حاصل رہے گا۔“ اور ان دونوں صورتوں میں لڑکا اصالتاً یا وکالتاً کہے کہ مجھے اس شرط کے ساتھ آپ سے نکاح قبول ہے، تو ایسی صورت میں وہ نکاح منعقد ہو جائے گا اور بیوی کو تاحیات غیر مشروط حق طلاق حاصل رہے گا۔ اور اگر نکاح کے وقت لڑکی اس دائمی اختیار طلاق کو کسی شرط کے ساتھ مشروط کرے کہ مثلاً (ا) اگر تو نے مجھے نان نفقہ نہ دیا، (ب) یا تو نے مجھے مارا پیٹا، (ج) یا تو نے مجھے والدین سے ملنے نہ دیا وغیرہ تو ان شرائط کے پائے جانے کی صورت میں اسے اختیار طلاق حاصل ہوگا ورنہ نہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

طلاق بائن کا ایک دقیق فقہی مسئلہ

علامہ مفتی عبدالعزیز حنفی، رئیس: دارالافتاء، دارالعلوم امجدیہ سے ایک علمی بحث

موضوع بحث

POINT OF DISCUSSION

"طلاق بائن کو دوسری طلاق بائن صرف اس وقت لاحق ہوتی ہے، جب دوسری کو پہلی کی خبر بنانا ممکن نہ ہو، خواہ دوسری بائن سے بھی طلاق کی نیت کی ہو۔"

پس منظر

ایک مستفتی "محمد عتیق اللہ" طلاق کا ایک استفتاء لے کر دارالعلوم امجدیہ میں علامہ مفتی عبدالعزیز حنفی کے پاس گیا، انہوں نے صورت مسئولہ کو دیکھ کر "طلاق مغلظہ" کا فتویٰ صادر فرمایا، فتویٰ کے استدلال کی بنیاد علامہ شامی کی اس عبارت پر تھی کہ: تَلْحَقُ الْبَائِنَ فِیْ ظَاهِرِ الرِّوَایَةِ بِشَرْطِ النِّیَّةِ (جلد ۲، صفحہ ۱۴۵)"۔ اس عبارت کا مفہوم انہوں نے یہ سمجھا کہ: "اگر شوہر نے اپنی بیوی کو ایک طلاق بائن دی ہو اور پھر بہ نیت طلاق دوسری طلاق بائن دیدے تو یہ دوسری طلاق بائن، پہلی بائن کو لاحق ہو جاتی ہے۔"

مستفتی کے سوال اور علامہ مفتی عبدالعزیز حنفی صاحب کے جواب کی عبارت لفظ بہ لفظ درج ذیل ہے:

الاستفتاء

بخدمت جناب مفتی صاحب

السلام علیکم!

میں ایک شرعی مسئلے کی بابت آپ سے مشورہ چاہتا ہوں کہ میرا ایک بھائی غصہ کی حالت میں اپنی بیوی کو ایک مرتبہ کہتا ہے میں نے تمہیں طلاق دیا اس کے تیسرے دن دوبارہ رجوع کر لیا۔ اس کے بعد تقریباً پانچ ماہ گزرنے کے بعد غصہ کی حالت میں اس نے اپنی بیوی

سے دو مرتبہ کہا "میں نے تمہیں آزاد کیا، میں نے تمہیں آزاد کیا۔"

برائے مہربانی قرآن و سنت کی روشنی میں اس مسئلے کو حل فرمائیں کیا شوہر اپنی بیوی سے دوبارہ رجوع کر سکتا ہے یا نہیں؟

(سائل: محمد عتیق اللہ، سیکٹر 11-BB246 نارتھ کراچی)

باسمہٖ تعالیٰ

الجواب:- یہ سوال خود شوہر محمد سمیع اللہ ولد محمد یاسین نے ہمارے دار الافتاء آکر پیش کیا ہے اس نے اپنے سوال میں لکھا ہے کہ میں نے اپنی بیوی سیدہ روبی تبسم بنت پرویز حسین کو پہلے ایک طلاق دی پھر تیسرے دن رجوع بھی کر لیا۔ اس کے تقریباً پانچ ماہ بعد غصہ کی حالت میں دو مرتبہ یہ کہا "میں نے تمہیں آزاد کیا، میں نے تمہیں آزاد کیا۔" صورت مسئولہ میں جب شوہر نے ایک طلاق دی تھی، تو یہ ایک طلاق رجعی واقع ہوئی تھی۔ طلاق رجعی کا حکم یہ ہے کہ شوہر اگر چاہے تو عدت کے اندر رجوع کر سکتا ہے۔ رجوع قول سے بھی ہوتا ہے اور فعل سے بھی۔ شوہر نے تیسرے دن جب رجوع کر لیا تو اس کا رجوع کرنا صحیح تھا اور یہ رجوع بھی ہو گیا تھا اور شمار میں یہ طلاق باقی رہی۔ مگر جب اس کے بعد اس نے یہ کہا کہ (۱) "میں نے تمہیں آزاد کیا" (۲) "میں نے تمہیں آزاد کیا"، تو ہم نے خود شوہر سے جب یہ دریافت کیا کہ دوسری مرتبہ جو آپ نے لفظ آزاد کہا، اس سے آپ کی کیا مراد تھی؟۔ تو اس نے ہمیں زبانی بتایا کہ میری دوسرے لفظ سے مراد بھی طلاق تھی۔ لہذا جب دوسرے لفظ "تمہیں آزاد کیا" سے بھی شوہر نے طلاق کی نیت کی، تو اس صورت میں یہ طلاق بائن دوسری بائن طلاق کو لاحق ہو گئی اور یہ طلاق بائن اس سے قبل دی گئی طلاق سے مل کر تین طلاقیں ہوئیں۔ چنانچہ فتاوی شامی میں ہے: تَلْحَقُ الْبَائِنَ فِي ظَاهِرِ الرِّوَايَةِ بِشَرْطِ النِّيَّةِ (ص ۶۴۵ ج ۲)۔ لہذا شخص مذکور کی بیوی پر تین طلاق واقع ہو گئیں اور اس کی بیوی بحرمت مغلظہ اس پر حرام ہو گئی۔ اب ان دونوں کا دوبارہ آپس میں نکاح بھی بغیر حلالہ شرعی نہیں ہو سکتا۔ قرآن کریم میں ہے: فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى

تَنۡکِحَ زَوۡجاً غَیۡرَہٗ۔ یعنی پھر اگر تیسری طلاق اسے دی، تواب وہ عورت اسے حلال نہ ہو گی جب تک دوسرے خاوند کے پاس نہ رہے۔

عبدالعزیز حنفی غفرلہ

دارالافتاء دارالعلوم امجدیہ عالمگیر روڈ کراچی

۱۰ر رجب المرجب ۱۴۱۹ھ، ۳۱ر اکتوبر ۱۹۹۸ء

ہماری دانست میں علامہ مفتی عبدالعزیز حنفی صاحب کا یہ فتویٰ درست نہیں تھا، ہمارا حسن ظن یہ تھا کہ ہو سکتا ہے کہ کثرت مشاغل اور قلت توجہ کے سبب مفتی صاحب سے تسامح ہو گیا ہو، لہٰذا ہم نے اس فتوے کا صحیح جواب مفصل ومدلل لکھا اور مفتی صاحب سے گزارش کی کہ وہ دلائل شرعیہ کی روشنی میں اپنی غلطی پر مطلع ہونے کے بعد اپنے سابق فتوے سے رجوع فرمائیں اور درست فتویٰ جاری فرمائیں۔ بعینہ اسی مسئلے پر ہمارا فتویٰ درج ذیل ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب ھوالموفق للصواب، بتوفیق اللہ ووسیلۃ حبیبہ الکریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم

صورت مسئولہ میں مسمّٰی محمد سمیع اللہ نے اپنی بیوی کو ایک طلاق رجعی دی اور پھر دورانِ عدت رجوع کرلیا، یہ درست ہے۔ لیکن یہ طلاق مجموعی نصاب طلاق میں شامل ہونے کے لئے بدستور مؤثر رہے گی۔ اس کے بعد اس نے اپنی بیوی سے بہ نیت طلاق کہا: "میں نے تمہیں آزاد کیا، میں نے تمہیں آزاد کیا۔" یہ طلاق بائن کے کلمات ہیں۔ درمختار میں "اَنۡتِ حُرَّۃٌ" (تو آزاد ہے) کو طلاق بائن کے کلمات میں شمار کیا ہے، اور اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی نے لکھا ہے: "اَنۡتِ حُرَّۃٌ" (تو آزاد ہے) اور "اَعۡتَقۡتُکِ" (میں نے تمہیں آزاد کیا)، معنیً مترادف ہیں (ردالمحتار ص ۴۶۵، ج ۲ مطبوعہ بیروت)، فتاوی عالمگیری مطبوعہ کوئٹہ ص ۳۷۶، ج ۱) میں بھی یہی درج ہے۔

اس تمہید کی روشنی میں پیش آمدہ صورتحال میں محمد سمیع اللہ کی بیوی کو ایک طلاق بائن واقع ہو گئی اور پہلی طلاق رجعی کے ساتھ مل کر مجموعی طور پر دو طلاقیں واقع ہو چکی ہیں، اور اب فریقین عدت کے دوران یا عدت گزرنے کے بعد باہمی رضامندی سے دوبارہ نکاح

کر سکتے ہیں، لیکن آئندہ شوہر کے پاس صرف ایک طلاق کی گنجائش باقی رہے گی اور خدانخواستہ اس نے ایک طلاق دے دی تو حرمت مغلظہ ہو جائے گی۔

دار العلوم امجدیہ کے فاضل مفتی کا "میں نے تمہیں آزاد کیا، میں نے تمہیں آزاد کیا" کو دو بائن طلاقیں شمار کر کے اسے حرمت مغلظہ قرار دینا درست نہیں ہے، کیونکہ در مختار علی ہامش رد المحتار (ج ۲، ص ۴۷۱-۴۷۰) مطبوعہ بیروت میں ہے:

إِذَا أَمْكَنَ جَعْلُهُ إِخْبَاراً عَنِ الْأَوَّلِ كَأَنْتَ بَائِنٌ، كَأَنْتِ بَائِنٌ، بَائِنٌ، أَوْ أَبَنْتُكِ بِتَطْلِيقَةٍ فَلَا يَقَعُ لِأَنَّهُ إِخْبَارٌ فَلَا ضَرُورَةَ فِي جَعْلِهِ إِنْشَاءً بِخِلَافِ أَبَنْتُكِ بِأُخْرَى أَوْ أَنْتِ طَالِقٌ بَائِنٌ۔

(ترجمہ) طلاق بائن کو (دوسری) بائن لاحق نہیں ہوتی، جبکہ دوسری کو پہلی کی حکایت و خبر قرار دینا درست ہو، جیسے شوہر یوں کہے: تو بائن ہے، بائن ہے یا یہ کہے کہ میں نے تجھے ایک طلاق بائن دی، تو یہ دوسری بائن واقع نہیں ہوگی، کیونکہ یہ پہلی ہی کی حکایت و خبر ہے۔ تو اسے انشاء یعنی نئی طلاق قرار دینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، ہاں اگر وہ کوئی ایسے کلمات کہہ دے جنہیں پہلی کی خبر قرار دینا ممکن نہ ہو تو وہ دوسری طلاق شمار ہوگی، جیسے یوں کہے کہ: "میں نے تجھے دوسری طلاق بائن دی۔"

اسی طرح فتاویٰ عالمگیری (ص ۳۷۷، ج ۱) مطبوعہ کوئٹہ میں ہے:

لَا يَلْحَقُ الْبَائِنُ الْبَائِنَ بِأَنْ قَالَ لَهَا أَنْتِ بَائِنٌ، ثُمَّ قَالَ لَهَا أَنْتِ بَائِنٌ، لَا يَقَعُ إِلَّا طَلْقَةٌ وَاحِدَةٌ بَائِنَةٌ لِأَنَّهُ يُمْكِنُ جَعْلُهُ خَبَراً عَنِ الْأَوَّلِ۔

طلاق بائن، بائن کو لاحق نہیں ہوتی، مثلاً کسی نے اپنی بیوی سے کہا، تو بائن ہے، پھر اس سے کہا تو بائن ہے، تو اس سے ایک ہی طلاق بائن واقع ہوگی، کیونکہ دوسری کو پہلی کی حکایت و خبر قرار دینا ممکن ہے۔

اعلیٰ حضرت عظیم البرکت امام اہل سنت فاضل بریلوی قدس سرہ العزیز سے مسئلہ دریافت کیا گیا کہ:

ایک شخص نے بحالتِ غصہ اپنی زوجہ سے بہ نیت طلاق ایک وقت میں تین بار کہا کہ "میں نے تجھے آزاد کہا" اس صورت میں کون سی طلاق واقع ہوگی مغلظہ یا بائنہ یا رجعی؟

آپ نے جواباً ارشاد فرمایا:

یہاں تین طلاق کا حکم دینا یوں غلط ہے کہ تمام متون و شروح و فتاویٰ میں تصریح ہے کہ کنایہ بائنہ طلاق بائن کے بعد طلاق جدید نہیں ٹھہرتا بلکہ اسی طلاق اول سے اخبار ہوتا ہے "الا ان ینص بما لا یحتملہ" (یعنی سوائے اس کے کہ ایسے الفاظ سے تصریح کردے کہ پہلی طلاق بائن کی حکایت و خبر واقع ہونے کا سرے سے احتمال ہی نہ رکھے) اس کے بعد اعلیٰ حضرت نے درمختار کی وہ عبارت استشہاد کے طور پر نقل فرمائی ہے، جس کا ہم اوپر حوالہ (مع ترجمہ) دے چکے ہیں، (فتاویٰ رضویہ ص ۵۸۵، ج ۱۲ مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن لاہور)۔ اسی طرح اسی ایڈیشن کے ص ۵۷۸، پر اعلیٰ حضرت رقم طراز ہیں کہ: "اگر زید نے ان تینوں لفظوں میں کل یا بعض کسی سے طلاق دینے کا قصد کیا تھا تو ایک طلاق بائن واقع ہوئی۔" پھر آگے اعلیٰ حضرت نے فتاویٰ عالمگیری کی وہ عبارت بطور استشہاد درج فرمائی ہے، جس کا ہم نے اوپر حوالہ دیا ہے۔ اسی طرح اسی ایڈیشن کے ص ۵۷۲ پر اعلیٰ حضرت "فَاِنَّ الْبَائِنَ لَایَلْحَقُ الْبَائِنَ کَمَا فِی الْمُتُوْنِ" کہہ کر فرماتے ہیں: "صورت مذکورہ میں طلاق مغلظ تو کسی طرح نہ ہوئی، ہاں اگر ان چار لفظوں میں جو زید نے کہے اگر کسی ایک لفظ یا دو تین یا چاروں سے عورت کو طلاق دینے کی نیت زید نے کی تو ایک طلاق بائن ہوگئی۔"

مفتی دار العلوم امجدیہ نے فتاویٰ شامی ص ۶۴۵، ج ۲ کے حوالے سے اپنے موقف کے حق میں یہ عبارت نقل کی ہے: "تَلْحَقُ الْبَائِنَ فِیْ ظَاهِرِ الرِّوَایَةِ بِشَرْطِ النِّیَّةِ" یہ عبارت سیاق و سباق کے بغیر نامکمل و ناتمام نقل کی گئی ہے، پہلے اصل عبارت ملاحظہ ہو:

"وَاَمَّا الْکِنَایَةُ الرَّوَاجِعُ کَاِعْتَدِّیْ وَاسْتَبْرِئِیْ رَحِمَكِ وَاَنْتِ وَاحِدَةٌ وَمَاأُلْحِقَ بِهَا فَإِنَّهَا وَاِنْ کَانَتْ تَلْحَقُ الْبَائِنَ فِیْ ظَاهِرِ الرِّوَایَةِ بِشَرْطِ النِّیَّةِ لٰکِنَّهَا لَمَّا وَقَعَ بِهَاالرَّجْعِیُّ کَانَتْ فِیْ مَعْنَی الصَّرِیْحِ کَمَا فِی الْبَدَائِعِ اَیْ فَهِیَ مُلْحِقَةٌ بِالصَّرِیْحِ فِیْ حُکْمِ اللِّحَاقِ لِلْبَائِنِ اَفَادَهٗ فِی الْبَحْرِ۔"

(ترجمہ) "اور لیکن وہ کنایات جن سے رجعی طلاقیں واقع ہوتی ہیں...... جیسے اِعْتَدِّیْ، اِسْتَبْرِئِیْ رَحِمَكِ، اَنْتِ وَاحِدَةٌ اور ان سے ملتے جلتے کلمات...... یہ اگرچہ نیت طلاق کی شرط کے ساتھ ظاہر الراویہ کے مطابق بائن کو لاحق ہوتے ہیں، لیکن چونکہ ان سے طلاق رجعی واقع ہوتی ہے لہذا یہ معنیً صریح ہیں، جیسے "بدائعُ الصّنائع" میں ہے، یعنی یہ بائن کو لاحق ہونے میں طلاق صریح کے حکم میں ہیں، اَلْبَحْرُالرَّائِقُ کا یہی مستفاد ہے۔"

چونکہ کتب فقہ و فتاویٰ کی مغلق عبارات کو محض سرسری نظر سے سمجھنا اور مصنف کے اصل مفہوم تک رسائی حاصل کرنا دشوار امر ہے، اس لئے مفتی دارالعلوم امجدیہ نے یہاں کئی ٹھوکریں کھائی ہیں اور وہ یہ ہیں :

(۱) انہوں نے سیاق و سباق سے غیر مربوط ناقص و ناتمام عبارت نقل کردی، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انہیں صحیح مفہوم کو سمجھنے میں مغالطہ ہوا۔ یہ پوری عبارت استفتاء کے جواب سے متعلق ہی نہیں ہے، استفتاء میں تو یہ سوال سامنے آیا کہ : آیا طلاق بائن، بائن کو لاحق ہوتی ہے یا نہیں؟ علامہ شامی کی محولہ بالا عبارت بنیادی طور پر اس امر سے بحث کرتی ہے کہ "طلاق صریح، طلاق بائن کو لاحق ہوتی ہے، تو دونوں صورتوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

(۲) علامہ شامی نے دراصل اس عبارت میں طلاق رجعی کی دو قسمیں یا دو صورتیں بیان فرمائی ہیں، ایک یہ کہ لفظاً اور معنیً دونوں اعتبار سے طلاق صریح ہو جیسے "اَنْتِ طَالِقٌ" اس کے بائن کو لاحق ہونے میں کوئی اشتباہ نہیں ہوتا، دوسرے یہ کہ لفظاً تو

صریح نہ ہو لیکن معنیً صریح ہو، جیسے اِعْتَدِّیْ ، اِسْتَبْرِئِیْ رَحِمَكِ ، أَنْتِ وَاحِدَةٌ وَغَيْرُهَا، انہیں علامہ شامی "الکنایات الرواجع" کی اصطلاح استعمال کر کے ذکر کرتے ہیں اور پھر فرماتے ہیں کہ "اگر ایسے کلمات نیت طلاق کے ساتھ کہے جائیں تو یہ "ظاہر الروایہ" کے مطابق بائن کے ساتھ لاحق ہو جاتے ہیں، یعنی چونکہ ان کلمات سے طلاق رجعی واقع ہوتی ہے، اس لئے بائن کے ساتھ "لحاق" کے معاملے میں یہ طلاق صریح ہی کے حکم میں ہیں۔ ان اَدِلّہ کی روشنی میں دار العلوم امجدیہ کے مفتی صاحب سے گزارش ہے کہ وہ اپنے فتوے پر نظر ثانی فرمائیں۔

مفتی منیب الرحمٰن

مہتمم دار العلوم نعیمیہ

۱۱ر رجب المرجب ۱۴۱۹ھ، ۹ر نومبر ۱۹۹۸ء

نوٹ: - علامہ مفتی عبد العزیز حنفی کے استدلال کی بنیاد اس بات پر تھی کہ شوہر نے جب دوبار کہا "میں نے تمہیں آزاد کیا" تو اس سے دو بائن طلاقیں واقع ہو گئیں اور دلیل یہ دی کہ بائن کو بائن لاحق ہوتی ہے، جب یہ فتویٰ ہمارے پاس آیا تو ہم نے ۹ر نومبر ۱۹۹۸ء کو متعدد حوالہ جات کے ساتھ اس جواب کا رد لکھا اور ثقہ علماء کرام اور مفتیان عظام نے اس کی بھرپور تائید کی، ان مؤیدین میں جامعہ نظامیہ رضویہ لاہور اور تنظیم المدارس اہلسنت پاکستان کے ناظم اعلیٰ علامہ مفتی محمد عبد القیوم ہزاروی کی ذات گرامی بھی شامل ہے، جن کی سرپرستی و نگرانی میں رضا فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام فتاویٰ رضویہ کی تخریج، تحقیق اور عربی عبارات کے تراجم کے ساتھ جدید دلکش انداز میں طباعت واشاعت کا عظیم منصوبہ گزشتہ کئی برسوں سے انتہائی کامیابی اور سرعت رفتار کے ساتھ جاری وساری ہے۔

ہمارے استدلال کی بنیاد اس مسلمہ فقہی اصول پر تھی کہ طلاق بائن کو دوسری بائن صرف اس وقت لاحق ہوتی ہے جب دوسری کو پہلی کی خبر بنانا ممکن نہ ہو، اور صورت مسئولہ میں دوسری بائن کو پہلی بائن کی خبر بنانا ممکن ہے، اس لئے صرف ایک طلاق بائن واقع ہوئی اور پہلی طلاق صریح کو ملا کر یہ دو طلاقیں واقع ہوئیں۔ اور اب زوجین عدت کے دوران یا عدت

گزرنے کے بعد باہمی رضامندی سے آپس میں نکاح کر سکتے ہیں۔ ہمارا مدلل و مفصل فتویٰ سطور بالا میں آپ نے ملاحظہ فرمایا، لیکن مقام افسوس ہے کہ مفتی عبدالعزیز حنفی صاحب قبول حق پر آمادہ نہ ہوئے۔ اس کے بعد کی پیش رفت حسب ذیل ہے:

۲۹ر نومبر ۱۹۹۸ء کو دارالعلوم امجدیہ کے مفتی صاحب نے بزعم خویش ہمارے جواب کا رد لکھا اور اپنے موقف کو درست ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی، اس پر ۱۰ر دسمبر ۱۹۹۸ء کی تاریخ کے ساتھ حضرت علامہ مفتی محمد اختر رضا قادری ازہری کی تائید بھی ثبت ہے، لیکن ایسے مبہم انداز میں جسے کسی بھی فتوے پر ثبت کیا جاسکتا ہے۔ ہم تک یہ "جواب الجواب" رمضان المبارک سے قبل پہنچا۔ ان کا مکمل نظر ثانی شدہ جوابی فتویٰ، جس میں انہیں اپنے سابقہ موقف پر اصرار ہے، "متابعۃ الجواب" کی صورت میں ہمیں موصول ہوا۔ اس لئے ہم آئندہ سطور میں اس کا ذکر اسی عنوان سے کریں گے۔ پہلے مفتی عبدالعزیز حنفی صاحب کا "متابعۃ الجواب" ملاحظہ فرمائیے:

متابعۃ الجواب

سائل محمد عتیق اللہ کی جانب سے طلاق کے بارے میں ہم سے جو سوال کیا گیا تھا ہم نے اس سلسلے میں میاں بیوی دونوں کو اپنے دارالافتاء میں بلایا شوہر محمد سمیع اللہ ولد محمد یاسین نے ہمارے سامنے جو تفصیلی بیان دیا اس کی فوٹو کاپی بھی ہم من و عن اس جواب کے ساتھ منسلک کر رہے ہیں۔ شوہر کا بیان یہ ہے:

"عرض یہ ہے کہ میں محمد سمیع اللہ ولد محمد یاسین شوہر روبی تبسم نے اپنی بیوی سے روزمرہ کی لڑائی جھگڑے کے باعث اور ان کے مطالبہ پر ایک طلاق دی تھی تاکہ بیوی اپنی اصلاح کرے اور مزید طلاق کی نوبت نہ آئے اس کے بعد بیوی نے یقین دہانی کرائی کہ آئندہ ایسا نہیں ہوگا، اس یقین دہانی کے بعد میں نے رجوع کر لیا اور ہم میاں بیوی کی طرح رہے۔ لیکن تھوڑے عرصے کے بعد پھر وہی لڑائی جھگڑا شروع ہو گیا پھر میں نے سمجھایا کہ یہ طریقہ اچھا نہیں ہے اس طرح گھر بسنے کی بجائے اجڑ جاتا ہے بہت سمجھانے اور اصلاح کرنے کے

باوجود میری بیوی کو سمجھ نہ آیا۔ برابر لڑائی جھگڑا بحث ومباحثہ کرتی رہی اور کئی مرتبہ مجھ سے طلاق کا مطالبہ کیا آخر کار میں نے مجبور اور تنگ ہو کر اپنی زوجیت سے خارج کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ یہ جان کر کہ ایک طلاق تو میں نے پہلے دے دی تھی جس سے میں نے رجوع کرلیا تھا۔ اب مزید دو طلاق دے کر اپنی زوجیت سے ہمیشہ کے لئے خارج کردوں لہذا میں نے اسی ارادہ اور نیت سے دو مرتبہ لفظ آزاد کہا میں نے الفاظ اس طرح سے ادا کیا "میں نے تمہیں آزاد کیا، میں نے تمہیں آزاد کیا۔" یہ دو لفظ میں نے علیحدہ علیحدہ طلاق کی نیت سے ادا کیا۔ یعنی پہلا لفظ میں نے تمہیں آزاد کیا اس سے بھی طلاق کی نیت کی اور دوسری مرتبہ بھی میں نے تمہیں آزاد کیا اسے بھی میں نے تیسری طلاق کی نیت سے کہا۔ یعنی دو مرتبہ میری مراد اور نیت علیحدہ علیحدہ طلاق ہی کی تھی۔"

اس بیان کے حوالہ سے شریعت کی روشنی میں ہم نے اس کا جو جواب دیا تھا وہ صحیح ہے۔ مگر دارالعلوم نعیمیہ کراچی کے پروفیسر صاحب نے اپنی غلط فہمی کی وجہ سے اسے غلط ثابت کرنے بلکہ حرام کو حلال بنانے کی ناکام کوشش کی ہے۔ نیز پروفیسر صاحب نے جتنی بھی عبارات نقل کی ہیں اس میں انہوں نے وہ عبارات نقل نہیں کی جن سے یہ ثابت ہو رہا ہے کہ جب دوسرے لفظ بائن سے دوسری طلاق کی نیت کرے تو یہ دوسری طلاق ہے اور جو عبارت ہم نے پیش کی ہے اسے ناتمام ونامکمل سمجھا یہ ان کی فہم کا قصور ہے۔

(۱) اولاً ان کو یہ جاننا اور سمجھنا چاہئے کہ کسی مسئلہ کی تائید میں اسی قدر عبارت پیش کی جاتی ہے جتنی کہ نفس مسئلہ سے متعلق ہوتی ہے، تمام صفحات تحریر نہیں کئے جاتے، واضح رہے کہ الفاظ کنایات سے جب نیت طلاق ہو یا دلالت حال یعنی مذاکرہ طلاق ہو یا پھر طلاق کے وقت شوہر حالت غضب میں ہو تو طلاق واقع ہو جاتی ہے۔ اس لئے کہ الفاظ کنایات طلاق کے لئے تو وضع نہیں کئے گئے ہیں دوسرے معنی کا بھی احتمال رکھتے ہیں، چنانچہ درمختار میں ہے (کنایه) عِنْدَ الْفُقَهَاءِ (مَالَمْ يُوْضَعْ لَهُ) أَيِ الطَّلَاقِ (وَاحْتَمَلَهُ) وَغَيْرَهُ وَالْكِنَايَاتُ (لَا تُطَلَّقُ بِهَا) قَضَاءً (اِلَّا بِنِيَّةٍ اَوْ دَلَالَةِ الْحَالِ) وَهِيَ حَالَةُ مُذَاكَرَةِ الطَّلَاقِ اَوِ

اَلْغَضَبِ فَالْحَالَاتُ ثَلَاثٌ رِضاً وَغَضَبٌ وَ مُذَاکَرَۃٌ (ص ۶۳۵، ج ۲)۔ یہ تین حالات ہیں اور دلالتِ حال کی وجہ سے تو تمام الفاظ کنایات سے طلاق واقع ہوتی ہے۔ لیکن اس بات کی فخر الاسلام وغیرہ بعض مشائخ نے مخالفت کی ہے انہوں نے فرمایا الفاظ کنایات میں بعض ایسے الفاظ بھی ہیں جب تک ان سے نیت طلاق نہ ہو اس وقت تک طلاق واقع نہیں ہوتی چنانچہ فتاویٰ شامی میں ہے اِنَّ الْکِنَایَاتِ کُلَّھَا یَقَعُ بِھَا الطَّلَاقُ وَقَدْ تَبِعَ فِیْ ذَالِکَ الْقُدُوْرِیُّ وَالسَّرْخَسِیُّ فِی الْمَبْسُوْطِ وَخَالَفَھَا فَخْرُالْاِسْلَامِ وَغَیْرُہٗ مِنَ الْمَشَائِخِ فَقَالُوْا بَعْضُھَا لَا یَقَعُ بِھَا اِلاَّ بِالنِّیَّۃِ (ص ۶۳۶، ج ۲) اور بائن کو بائن اس وقت تک لاحق نہیں ہوتی جب تک دوسری بائن کو پہلی طلاق بائن سے خبر بنانا ممکن ہو۔ چنانچہ در مختار میں ہے: لَا یَلْحَقُ الْبَائِنُ الْبَائِنَ اِذَا اَمْکَنَ جَعْلُہٗ اِخْبَارًا عَنِ الْاَوَّلِ کَاَنْتِ بَائِنٌ بَائِنٌ اَوْ اَبَنْتُکِ بِتَطْلِیْقَۃٍ فَلَا یَقَعُ لِاَنَّہٗ اِخْبَارٌ فَلَا ضَرُوْرَۃَ فِیْ جَعْلِہٖ اِنْشَاءً (در مختار ص ۶۴۸، ج ۲) اور جب دوسری کو پہلی سے خبر بنانا ممکن نہ ہو تو دوسری انشاء طلاق کے لئے ہوگی اور یہ اس صورت میں جبکہ لفظ منافی ہو دوسری کو پہلی سے خبر بنانے یا دوسری بائن سے وہ دوسری طلاق کی نیت کرے تو اس نیت کی وجہ سے دوسری کو پہلی کی خبر نہیں بنا سکتے، چنانچہ علامہ شامی نے اِذَا اَمْکَنَ پر لکھا قَالَ فِی الْبَحْرِ وَیَنْبَغِیْ اَنَّہٗ اِذَا اَبَانَھَا ثُمَّ قَالَ لَھَا اَنْتِ بَائِنٌ نَاوِیاً طَلْقَۃً ثَانِیَۃً اَنْ تَقَعَ الثَّانِیَۃُ بِنِیَّۃٍ لِاَنَّہٗ بِنِیَّۃٍ لَا یَصْلَحُ خَبَرًا (ص ۶۴۸، ج ۲) بحر میں فرمایا اور مناسب ہے کہ جب شوہر نے بیوی کو بائن طلاق دی پھر اسے دوسری طلاق کی نیت کرتے ہوئے کہا تو بائن ہے تو شوہر کی نیت کی وجہ سے یہ دوسری طلاق واقع ہو جائے گی۔ اس لئے کہ شوہر کی نیت کی وجہ سے یہ دوسری پہلی کی خبر بننے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ اس کے بعد فرمایا فَھُوَ کَمَا اَبَنْتُکِ بِاُخْرٰی یعنی یہ ایسا ہی ہے جیسے کہ وہ کہے کہ میں نے تجھے بائن کیا دوسری طلاق سے۔ تو جس طرح لفظ اُخْرٰی کی وجہ سے

اس دوسری طلاق بائن کو پہلی سے خبر نہیں بنا سکتے اسی طرح دوسرے لفظ بائن سے طلاق ثانی کی نیت کی تو اس صورت میں بھی اس دوسری بائن طلاق کو پہلی بائن سے خبر نہیں بنا سکتے لہذا یہ دوسری بائن اس صورت میں پہلی بائن کو لاحق ہوگی۔ بتانا یہ مقصود ہے کہ اگر الفاظ کنایہ کی تکرار سے محض طلاق کی نیت کی تو اس سے تو ایک طلاق واقع ہوگی اس صورت میں کنایہ بائن پہلی بائن کو لاحق نہیں ہوگی مگر جب دوسری بائن سے دوسری بائن طلاق کی نیت کرے تو اس صورت میں یہ دوسری پہلی کو لاحق ہوگی۔

اور حضرت صدر الشریعہ خلیفہ اعلیٰ حضرت مفتی امجد علی رحمتہ اللہ علیہ نے بھی اپنی کتاب ''بہار شریعت'' میں در مختار اور رد المحتار کے حوالے سے یہی مسئلہ تحریر فرمایا ہے جو ہم نے اپنے جواب میں تحریر کیا۔ فقہ حنفی کی اردو میں سب سے پہلی مستند و معتمد و متفق علیہ و مایہ ناز کتاب ''بہار شریعت'' (شرعی مسائل کا انسائیکلوپیڈیا) میں ہے ''اور بائن بائن کو لاحق نہیں ہوتی جبکہ یہ ممکن ہو کہ دوسری کو پہلی کی خبر دینا کہہ سکیں مثلاً پہلے کہا تھا کہ تو بائن ہے اس کے بعد پھر یہ لفظ کہا تو اس سے دوسری واقع نہ ہوگی کہ یہ پہلی طلاق کی خبر ہے یا دوبارہ کہا میں نے تجھے بائن کر دیا اور اگر دوسری سے پہلے کو خبر دینا نہ کہہ سکیں مثلاً پہلے طلاق بائن دی پھر کہا میں نے دوسری بائن دی تو اب دوسری پڑے گی یونہی پہلی صورت میں بھی دو واقع ہوں گی جبکہ دوسری طلاق کی نیت ہو۔'' (بہار شریعت ص ۱۹، ج ۸)

(۲) ثانیاً۔ دار العلوم نعیمیہ کے پروفیسر صاحب نے خود اپنے فتوے میں منقولہ فقہ کی عبارت اِلاَّ اَنْ یَّنصَّ لِمَا لَا یَحْتَمِلُہٗ پر بھی غور نہیں کیا یہ عبارت تو ہماری مؤید ہے اور افسوس یہ ہے کہ انہوں نے اپنے لکھے ہوئے ہی کو نہ سمجھا۔

(۳) ثالثاً۔ دار العلوم نعیمیہ کراچی کے پروفیسر صاحب نے اعلیٰ حضرت محدث بریلوی رحمتہ اللہ علیہ کے فتاویٰ رضویہ سے جو عبارت نقل کی ہے اس میں انہوں نے قطع و برید سے کام لیا فتاویٰ رضویہ میں اور ہم سے پوچھے گئے استفتاء میں موجود فرق کو بھی نہیں سمجھا وہاں صرف تین مرتبہ الفاظ کنایہ استعمال کیئے گئے ہیں نیت کا تذکرہ نہیں ہے جبکہ یہاں ہم سے پوچھے گئے

استفتاء میں سائل خود تصریح کررہا ہے کہ اس نے دوسری مرتبہ جو کہا کہ "تمہیں آزاد کیا ہے" سے علیحدہ دوسری طلاق کی نیت ہے، اور یہ پہلی سے مل کر تیسری طلاق ہے اس فرق کو سمجھنا ہر ذی عقل پر لازم ہے اور اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ نے در مختار کی جو عبارت لَا یَلْحَقُ الْبَائِنُ الْبَائِنَ اِذَا اَمْکَنَ جَعْلُہٗ اِخْبَارًا لکھی تھی پروفیسر صاحب نے وہ مکمل عبارت نہیں لکھی جس سے یہ ثابت ہورہا تھا کہ طلاق بائن بائن کو اس وقت لاحق نہیں ہوتی جب دوسری بائن کو پہلی بائن کی خبر بنا سکتے ہوں۔ اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ نے جیسا کہ خود اس کے آخر میں لکھا کہ یہاں ایک پڑنے کی صحیح وجہ یہ ہے جو فقیر نے بیان کی اور اعلیٰ حضرت عظیم البرکت محدث بریلوی رحمتہ اللہ علیہ نے وہ وجہ در مختار کے حوالے سے یہ بیان فرمائی یہاں دوسری طلاق بائن کو پہلی کی خبر بنا سکتے ہیں لہذا دوسری بائن کو انشائے طلاق بنانا کوئی ضروری نہیں بِخِلَافِ اَبَنْتُكِ بِاُخْرٰی بر خلاف اس کے کہ شوہر نے اَبَنْتُكِ بِاُخْرٰی کہا تو اس صورت میں دوسری بائن کو پہلی بائن سے خبر بنانا ممکن نہیں۔ یا پھر شوہر دوسری بار لفظ بائن طلاق ثانی کی نیت سے کہے تو اس صورت میں بھی دوسری بائن طلاق ہوگی۔ تو اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ نے جو لکھا ہے وہ حق ہے۔ لیکن پروفیسر صاحب نے اسے سمجھا نہیں اس لئے کہ صرف الفاظ کنایات کی تکرار سے تو ایک ہی طلاق ہوتی ہے جبکہ ہر لفظ سے جداگانہ طلاق کی نیت نہ ہو اگر ان میں سے کسی لفظ سے شوہر کی نیت طلاق کی نہ ہو تو اصلاً کچھ بھی واقع نہیں ہوتا لیکن جب دوسرے لفظ بائن سے دوسری طلاق کی نیت کی تو اس نیت کی وجہ سے دوسری بائن طلاق واقع ہوگی۔

چنانچہ اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ نے بھی خود اس بات کی تصریح فرمائی ہے فتاویٰ رضویہ جلد پنجم ص ۲۱۷ میں ہے ثُمَّ مَا اَفَادُوْا هٰهُنَا مِنْ اَنَّهٗ لَوْ نَوٰی بِطَالِقٍ وَاحِدَةً وَبِبَائِنٍ اُخْرٰی یُؤَیِّدُ مَا سَنُحَقِّقُهٗ اِذَا اَرَادَ بِقَوْلِهٖ اَنْتِ بَائِنٌ بَائِنٌ بَائِنَتَیْنِ فَهُوَ کَمَا نَوٰی وِفَاقًا لِلْعَلَّامَةِ الْبَحْرِ مُلْتَقِطًا یعنی جس نے اپنے قول انت بائن بائن سے دو بائن طلاق مراد لی تو پس وہ ویسی ہیں جیسی

اس نے نیت کی علامہ بحر کا اس پر اتفاق ہے۔ جامعہ اسلامیہ گلستان جوہر کراچی کے مفتی صاحب بھی دارالعلوم نعیمیہ کراچی کے پروفیسر کی رو میں بہہ گئے اسی لئے تو انہوں نے بھی لکھا کہ "بائن بائن کو لاحق نہیں ہوتی اور اس کی وجہ صرف ثانی کا اول کے لئے خبر بننے اور حکایت ہونے کا امکان ہے"۔ "نیت کچھ بھی ہو" ان کا یہ کہنا غلط ہے کہ "نیت کچھ بھی ہو۔" ان کو معلوم ہونا چاہئے کتب فقہ میں یہ مسئلہ لکھا ہے کہ جب دوسری بائن سے شوہر دوسری طلاق کی نیت کرے تو اب اس نیت کی وجہ سے ثانی کو اول کے لئے خبر نہیں بنا سکتے۔ جامعہ اسلامیہ گلستان جوہر کے مفتی صاحب کا یہ کہنا کہ علامہ شامی نے بحر الرائق کا رد فرمایا اس سے نفس مسئلہ کے متعلق ہمارے دیئے گئے جواب میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا اس لئے کہ علامہ شامی کے رد کرنے سے علامہ بحر کے قول کو ناقابل دلیل نہیں قرار دیا جاسکتا کیونکہ علامہ بحر کا بھی فقہ میں ایک اعلیٰ مقام ہے اور خاص اسی عبارت پر اعلیٰ حضرت مجدد دین وملت رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہ کے حاشیہ جد الممتار علی رد المحتار مطبوعہ رضا اکیڈمی بمبئی صفحہ نمبر ۵۳۱ پر یہ عبارت "اَقُوْلُ لَا یَرْتَابُ اَحَدٌ اَنَّ الْکِنَایَاتِ لَا بُدَّلَهَا مِنْ نِیَّةٍ لٰکِنْ هٰهُنَا ثَلٰثَةُ اَشْیَاءَ نِیَّةُ الطَّلَاقِ عَلَی الْاِطْلَاقِ وَهٰذَا هُوَالَّذِیْ لَا بُدَّ مِنْهُ فِی الْکِنَایَاتِ، وَنِیَّةُ التَّاکِیْدِ، وَنِیَّةُ الْاِسْتِیْنَافِ بِاَنْ یُّرِیْدَ وَیَقْصِدَ اِیْقَاعَ طَلَاقٍ جَدِیْدٍ غَیْرِ الْاَوَّلِ وَالْعَلَّامَةُ الْبَحْرِ لَا یَقُوْلُ بِاشْتِرَاطِ نِیَّةِ التَّاکِیْدِ حَتّٰی یَرِدَ عَلَیْهِ اَنَّهُمْ لَمْ یَشْتَرِطُوْا ذٰلِکَ بَلْ اِنَّمَا یَقُوْلُ بِاشْتِرَاطِ عَدَمِ نِیَّةِ الْاِسْتِیْنَافِ کَقَوْلِهٖ اَبَنْتُکِ بِاُخْرٰی فَاِنَّ الْوُقُوْعَ اِنَّمَا هُوَ بِاَبَنْتُکِ لَا بِاُخْرٰی، وَاِنَّمَا هُوَ مُعَیَّنٌ لِنِیَّةِ الْاِسْتِیْنَافِ عِنْدَالنَّاسِ، فَلِمَ لَاتَکْفِیْهِ نِیَّةٌ فِیْمَا بَیْنَهٗ وَبَیْنَ رَبِّهٖ، وَکَلَامُهُمْ غَیْرُ صَرِیْحٍ فِیْ اَنَّهٗ لَایُقْبَلُ مِنْهُ الْاِسْتِیْنَافُ اَصْلاً، وَاِنْ نَوٰی وَیُحْمَلُ عَلَی التَّاکِیْدِ جَبْرًا عَلَیْهِ وَکَرْهاً، وَهَلْ هُوَ اِلَّا حَجْرٌ لَهٗ عَنْ تَصَرُّفِ قَصْدِهٖ قَصْدًا

خَاصًّا مَعَ کَوْنِہٖ اَھْلاً وَالْمَرْاَۃُ مَحَلاً وَاللَّفْظُ صَالِحاً وَھُوَالْمُشَدِّدُ عَلٰی نَفْسِہٖ فَلِمَ لَایُقْبَلُ فَیَتَأَمَّلُ وَاللّٰہُ تَعَالٰی اَعْلَمُ" کو پڑھ لیتے تو ان کو شاید یہ تائید کرنے کی ضرورت ہی نہ پڑتی اور اب رہی ان کی یہ بات کہ "استثناء" ہوتا تو فقہاء اس پر تحریر فرماتے اتنی تعجب خیز بات ہے جوش مخالفت کے باعث ان کو یہ معلوم نہ ہوا کہ اِذَا اَمْکَنَ کی قید اس کا فائدہ دے رہی ہے۔ اعلیٰ حضرت مجدد دین وملت الشاہ احمد رضا خان محدث بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کا حوالہ دینے والے نعیمیہ کے پروفیسر صاحب پر تعجب ہے کہ انہوں نے فقہ کی عبارت کے معنی ہی نہ سمجھا اِذَا اَمْکَنَ والی عبارت میں یہ ہے کہ جب دوسری کو خبر بنانا ممکن ہو جب خبر بنایا جائے گا ورنہ وہ انشاء ہوگی اور انہوں نے انشاء کو ہی ناممکن بنادیا لہٰذا یہ حضرات اپنی تحریرات پر نظر ثانی کریں۔

عبدالعزیز حنفی غفرلہ

دارالافتاء دارالعلوم امجدیہ عالمگیر روڈ کراچی

۹ر شعبان المعظم ۱۴۱۹ھ، ۲۹ نومبر ۱۹۹۸ء

تائید

علامہ مفتی محمد اختر رضا خان القادری الازہری صاحب مُدَّظِلُّہُمْ

لَقَدْ اَصَابَ مَنْ اَجَابَ وَاللّٰہُ تَعَالٰی اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ وَاِلَیْہِ الْمَرْجِعُ وَالْمَآبُ وَاَنَا الْفَقِیْرُ اِلٰی رَحْمَۃِ اللّٰہِ الْمُفْتِیُ محمد اختر رضا القادری الازھری غُفِرَلَہٗ

۲۰ر شعبان المعظم ۱۴۱۹ھ

۹۸-۱۲-۱۰

نوٹ:۔ مفتی عبدالعزیز حنفی صاحب نے اپنے سابق موقف پر اصرار کرتے ہوئے یہ "متابعۃ الجواب" تحریر فرمایا اور ہمارے حسن ظن کے برعکس قبول حق پر آمادہ نہ ہوئے تو ہم نے ان کی مزید تشفی اور احقاقِ حق کیلئے "ردِ متابعۃ الجواب" لکھا جو سطور ذیل میں پیش خدمت ہے۔

رد "متابعۃ الجواب"

(۱) مسلمہ اصول کی خلاف ورزی :

جب کسی مسئلے، فتویٰ یا عبارت پر کوئی علمی مناقشہ و مباحثہ شروع ہو جائے تو اصل مبحث (Point of Duscussion) وہی عبارت رہتی ہے نہ کہ اس کی کوئی تبدیل شدہ و ترمیم شدہ صورت، تبدیل شدہ عبارت کو سابقہ بحث کی متابعت (Follow up) قرار دینا، دیدہ و دانستہ فریب دہی اور خیانت کہلائے گی یا نرم سے نرم الفاظ میں اسے خود فریبی ہی کہیں گے، خاص طور پر اس صورت میں جب یہ انجام کار سعیٔ لاحاصل ٹھہرے اور ہاتھ کچھ نہ آئے۔

(۲) استفتاء میں لفظی و معنوی تحریف :

ایک دن مسماۃ روبی تبسم کے بھائی اور مسمّٰی محمد سمیع اللہ ہمارے دار العلوم میں آئے اور بتایا کہ دار العلوم امجدیہ کے مفتی صاحب نے ہمیں گھر پر فون کر کے دوبارہ بلایا ہے، ہم نے کہا ضرور جائیے، ہو سکتا ہے کہ مفتی صاحب نے حق منکشف ہونے اور اتنے وقیع علماء کی تائیدات پڑھ کر اپنے موقف پر نظر ثانی کی ہو اور اپنے سابقہ موقف سے رجوع کر لیا ہو، کیونکہ کسی بھی حق پرست عالم دین کا شعار یہی ہوتا ہے کہ وہ حق آشکارا ہونے کے بعد اس کے آگے سر تسلیم خم کر دیتے ہیں اور در حقیقت اس میں علم کا وقار اور عالمِ حق کی عظمت کا راز مضمر ہوتا ہے۔ لیکن جب وہ واپس پلٹ کر ہمارے پاس آئے تو بتایا کہ مفتی صاحب نے مستفتی سے ایک نیا بیان لکھوایا ہے اور فرمایا ہے کہ "اب یہ میری عزت کا مسئلہ ہے" ایسے ہی موقع کیلئے قرآن نے فرمایا:

"وَاِذَا قِيْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ "(البقرہ: ۲۰۶)(ترجمہ)
"اور جب اس سے کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ سے ڈر، تو پندارِ نفس اسے گناہ پر آمادہ کر دیتا ہے۔"
ورنہ ہماری ناموس و آبرو تو ناموسِ دین کا صدقہ اور ناموسِ سید الابرار کا صدقہ ہے، بقول اعلیٰ حضرت عظیم البرکت۔

تری بات کوئی کیوں پوچھے رضا
تجھ سے کتنے ہزار پھرتے ہیں

چنانچہ علامہ مفتی عبدالعزیز حنفی نے اپنی زیر نگرانی مرتبہ دوسرے استفتاء میں کئی ایسے جملے شامل فرمادیئے جوان کے اصل استفتاء وفتویٰ میں ہرگز مذکور نہ تھے۔ مثلاً:

(۱) آخر کار میں نے مجبور اور تنگ ہو کر اپنی زوجیت سے خارج کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ (۲) یہ جان کر کہ ایک طلاق تو میں نے پہلے ہی دے دی تھی جس سے میں نے رجوع کرلیا تھا، اب مزید دو طلاق دے کر اپنی زوجیت سے ہمیشہ کیلئے خارج کردوں۔ (۳) یہ دو لفظ میں نے علیحدہ علیحدہ طلاق کی نیت سے ادا کیے۔ (۴) اور دوسری مرتبہ بھی میں نے تمہیں آزاد کیا، اسے بھی میں نے تیسری طلاق کی نیت سے کہا۔ یعنی دونوں مرتبہ میری مراد اور نیت علیحدہ علیحدہ طلاق ہی کی تھی، وغیرہ۔

اس تحریر کے انصاف پسند اور جویائے حق قارئین اور اہل علم سے میری مؤدبانہ و عاجزانہ گزارش ہے کہ علامہ مفتی عبدالعزیز حنفی کے اولین استفتاء وفتویٰ کا مکمل متن، جسے ہم نے اس بحث کے شروع میں من و عن نقل کردیا ہے، اور مفتی صاحب موصوف کے "متابعۃ الجواب" میں جو تحریف کرکے ایک بالکل نیا استفتاء مرتب کیا گیا ہے، ایک بار رک کر پھر دونوں کو پڑھیں، مقامِ حیرت ہے کہ صورتِ مسئلہ یا واقعہ ایک ہی ہے، مستفتی اور مفتی بھی وہی ہیں، تو پھر استفتاء میں ترمیم و تحریف کیوں؟ کیا یہ اہل حق کا شیوہ ہے؟ ہم فیصلہ اپنے قارئین پر چھوڑتے ہیں۔ ازراہ کرم آپ بارِ دگر دونوں کا تقابلی مطالعہ فرمائیں، خط کشیدہ جملوں کو بار بار پڑھیں تو وہ آپ کو مستفتی کے اولین استفتاء میں نہیں ملیں گے، یہ قبلہ مفتی صاحب کی فن کاری و لفظی ہیر پھیر ہے اور اسی تضاد سے اصل کہانی آپ کی سمجھ میں آجائے گی، کہ آیا اصل مسئلہ "احقاقِ حق" اور "ابطالِ باطل" کا ہے یا "تحفظِ انا" اور پندارِ نفس کا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کی شان دیکھیے کہ اس محنت شاقہ اور ڈیڑھ ماہ کی سعی لاحاصل کے بعد بھی ان کے ہاتھ نامرادی کے سوا کچھ نہ آیا۔ ہمارے اس عاجزانہ دعوے کا ثبوت سطور ذیل سے مل جائے گا۔

(۳) علامہ مفتی عبدالعزیز حنفی کا اپنے سابق جواب پر استقرار سے گریز:

اگر دارالعلوم کے فاضل مفتی کا اپنے سابق جواب پر قلبی اطمینان اور شرح صدر تھا تو حضرت مفتی محمد اختر رضا خان قادری اور دیگر اجلّہ علماء کرام سے اسی کی تائید و تصویب کرا دیتے، اسے انہوں نے ریکارڈ سے غائب کیوں فرما دیا؟ قصۂ اندروں کیا ہے؟

(۴) اصل فتویٰ کی "بناء استدلال" کا ذکر "متابعۃ الجواب" میں سرے سے غائب، آخر کیوں؟

علامہ مفتی عبدالعزیز حنفی نے اپنے اولین اصل فتوے میں اپنے استدلال کی بنیاد فتاویٰ شامی طبع قدیم جلد ۲ ص ۶۴۵ کی ایک عبارت پر قائم کی تھی، اس پر ہمارا بنیادی اعتراض یہ تھا کہ یہ عبارت "اَلْکِنَایَاتُ الرَّوَاجِعُ" سے متعلق ہے، استفتاء کی صورت مسئولہ سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے، لہٰذا بناء استدلال ہی غلط تھی، مفتی صاحب نے ہمارے اس اعتراض کا کوئی جواب تو نہیں دیا، لیکن عملاً "متابعۃ الجواب" میں اس عبارت کو بالکل ترک کر دیا، یہ بالفعل تو غلطی کا اعتراف ہے اور اس سے رجوع کے مترادف ہے، لیکن اعتراف صریح کیلئے حوصلہ اور جرأت ایمانی چاہئے۔ ہم نے ازراہِ ادب واحترام اس امر کا ذکر بھی نہیں کیا تھا کہ مذکورہ عبارت کا مفتی صاحب نے جو ترجمہ درج فرمایا تھا، وہ بھی نحوی اعتبار سے (Grammaticaly) غلط تھا، مفعول کو فاعل قرار دے کر ترجمہ فرمایا گیا تھا "تَلْحَقُ الْبَائِنَ بِشَرْطِ النِّیَّۃِ فِیْ ظَاھِرِ الرِّوَایَۃِ" کا ترجمہ وہ فرماتے ہیں کہ بائن، بشرطیکہ نیت کی ہو، ظاہر الروایہ کے مطابق لاحق ہوتی ہے یہاں وہ "اَلْبَائِنُ" کو "تَلْحَقُ" کا فاعل قرار دے کر ترجمہ کر رہے ہیں، حالانکہ "اَلْبَائِنَ" مفعول واقع ہو رہا ہے اور "تَلْحَقُ" کا فاعل ضمیر مستتر ہے۔ جو "اَلْکِنَایَاتُ الرَّوَاجِعُ" کی طرف لوٹ رہی ہے۔

(۵) علامہ مفتی عبدالعزیز حنفی کا نظریہ:

علامہ مفتی عبدالعزیز حنفی کا نظریہ یہ ہے کہ جب الفاظ کنایہ مکرر ہوں، دوسرے مکرر لفظ سے دوسری طلاق کی نیت کی جائے تو وہ نیت معتبر و مؤثر ہوتی ہے اور اس طرح دوسری

طلاق بائن پہلی بائن کو لاحق ہو جاتی ہے۔

(۶) علامہ مفتی عبدالعزیز حنفی کی تازہ بنائے استدلال:

اپنی سابق بنائے استدلال سے علامہ مفتی عبدالعزیز حنفی نے عملی اور سکوتی رجوع کر کے اب تازہ بناء "البحرالرائق" اور "جد الممتار" کی عبارات پر رکھی ہے، لیکن ادباً عرض ہے کہ انہوں نے ان دونوں کتابوں کی عبارات سے مغالطہ کھایا، بنابریں غلط نتیجہ اخذ کیا، جیسا کہ ہم سطور ذیل میں واضح کریں گے۔

(۷) البحرالرائق کی اصل عبارت اور اس کا صحیح مفہوم:

پہلے اصل عبارت ملاحظہ فرمائیے:

وَيَنْبَغِيْ اَنَّهُ اِذَا اَبَانَهَا ثُمَّ قَالَ لَهَا اَنْتِ بَائِنٌ نَاوِياً طَلْقَةً ثَانِيَةً يَنْبَغِيْ اَنْ تَقَعَ الثَّانِيَةُ بِنِيَّتِهِ لِاَنَّهُ بِنِيَّتِهِ لَايَصْلُحُ خَبَرًا فَهُوَ كَمَالَوْ قَالَ اَبَنْتُكِ بِاُخْرٰى اِلاَّ اَنْ يُّقَالَ اَنَّ الْوُقُوْعَ اِنَّمَا هُوَ بِلَفْظٍ صَالِحٍ لَهُ وَهُوَ اُخْرٰى بِخِلَافِ مُجَرَّدِ النِّيَّةِ (البحرالرائق جلد ۳ ص ۳۰۸ مطبوعہ مصر)

عبارت کا اصل مفہوم:

"جب ایک شخص اپنی بیوی کو طلاق بائن دے، پھر اس کو دوسری بار کہے کہ تم بائن ہو، اور اس سے دوسری طلاق کی نیت کرے تو چاہئے کہ اس سے دوسری طلاق واقع ہو، کیونکہ اس کی نیت کی وجہ سے اب دوسری طلاق پہلی طلاق کی خبر نہیں بن سکتی، پھر "اِلاَّ اَنْ يُّقَالَ"، فرما کر اس قول کا رد فرمادیا کہ یہ اس وقت ہو سکتا ہے جب کوئی دوسر الفظ اس نیت کی صلاحیت رکھے (علامہ شامی نے فرمایا "یوں کہنا تھا، جب کوئی دوسر الفظ اس نیت کی معاونت کرے) جیسا کہ کوئی شخص اپنی بیوی کو طلاق بائن دینے کے بعد کہے، "میں نے تجھے دوسری طلاق بائن دی" تو یہاں پر "دوسری (اُخریٰ) کا لفظ دوسری طلاق کی نیت کی صلاحیت رکھتا ہے (یا معاونت کرتا ہے) بر خلاف اس کے کہ وہ صرف دوسری طلاق کی نیت کرے۔"

اور صورت مسئولہ میں جب سائل نے دوسری بار اپنی بیوی کو کہا "میں نے تمہیں آزاد کیا" تو اس میں صرف دوسری طلاق کی نیت کی ہے، کوئی ایسا لفظ نہیں جو دوسری طلاق کی نیت کی معاونت کرے، جیسا کہ اس جملے میں ہے کہ "میں نے تجھے دوسری بائن طلاق دی" لہذا یہاں بائن بائن کو لاحق نہیں ہوگی۔

البحر الرائق کے حاشیے پر علامہ سید ابن عابدین شامی حنفی متوفی ۱۲۵۲ھ نے اس مسئلے کو بہت زیادہ واضح فرمادیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"فقہاء نے کہا ہے کہ کنایاتِ طلاق میں ثانی اول کو اس وقت لاحق ہوتی ہے جب دوسری کو پہلی کی خبر بنانا ممکن نہ ہو، اور انہوں نے یہ نہیں کہا کہ دوسری اول کو اس وقت لاحق ہوتی ہے جب دوسری طلاق میں دوسری طلاق کی نیت کی جائے، اور یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ جب دوسری طلاق کو پہلی طلاق کی خبر بنانا ممکن ہو تو دوسری طلاق پہلی طلاق کو لاحق نہیں ہوگی، خواہ دوسری طلاق سے علیحدہ طلاق ہی کی نیت کیوں نہ کرے۔" یہ ہم نے علامہ شامی کی مکمل عبارت کا ماحصل اور خلاصہ درج کیا ہے، تاہم جو حضرات اصل عبارت ملاحظہ فرمانا چاہیں، ان کی تسکین خاطر کیلئے پوری عبارت ذیل میں درج ہے:

(اَنَّهُ اِذَا اَبَانَهَا اِلخ۔) لَایَخْفٰی اِنْدِ فَاعُهٗ بِمَامَرَّ عَنِ الْمُحِیْطِ مِنْ اِلْغَاءِ النِّیَّةِ فِیْ اَصْلِ الْبَیْنُوْنَةِ لِکَوْنِهَا حَاصِلَةً وَکَذَا مَا قَدَّمَهٗ عَنِ الْحَاوِیْ مِنْ قَوْلِهٖ وَلَا یَقَعُ بِکِنَایَاتِ الطَّلَاقِ شَیْءٌ وَاِنْ نَوٰی عَلٰی اَنَّ تَعْبِیْرَهُمْ بِاِمْکَانِ کَوْنِهٖ خَبَراً ظَاهِرٌ فِیْ کَوْنِهٖ اِحْتِرَازاً عَمَّا لَایُمْکِنُ جَعْلُهٗ خَبَراً، لَا عَمَّا لَوْنَوٰی بِهٖ طَلْقَةً ثَانِیَةً لِاَنَّ کُلَّ بَائِنٍ لَابُدَّ فِیْهِ مِنَ النِّیَّةِ، فَاِذَا نَوٰی بِالْبَائِنِ الثَّانِی الطَّلَاقَ وَاَمْکَنَ جَعْلُهٗ خَبَراً عَنِ الْاَوَّلِ لَایَقَعُ وَلَیْسَ الْمُرَادُ اَنْ یَّنْوِیَ الطَّلَاقَ الْاَوَّلَ بِخُصُوْصِهٖ وَاِلَّا کَانَ عَلَیْهِمْ اَنْ یَّقُوْلُوْا بِخِلَافِ اِذَا نَوٰی بِهِ الْاَوَّلَ وَلَهُمْ عَنِ التَّعْبِیْرِ بِهٰذَا اِلَی التَّعْبِیْرِ بِالْاِمْکَانِ الْمَذْکُوْرِ دَلِیْلٌ" وَاضِحٌ عَلٰی اَنَّهٗ مَتٰی اَمْکَنَ جَعْلُ الثَّانِیْ خَبَراً لَایَقَعُ وَاِنْ نَوٰی بِهٖ طَلْقَةً اُخْرٰی۔ (منحۃ الخالق علی حامش البحر الرائق ج ۳ ص ۳۰۸)

علامہ شامی کی اس تصریح سے واضح ہوگیا کہ صورت مسئولہ میں سائل نے جب دوسری طلاق کی نیت سے مکرر کہا: "میں نے تمہیں آزاد کیا" تو اس صورت میں صرف ایک طلاق بائن واقع ہوئی اور دوسری واقع نہیں ہوئی۔

(۸) جد الممتار کی عبارت سے استدلال:

علامہ مفتی عبدالعزیز حنفی نے دوسری دلیل اعلیٰ حضرت کی حسب ذیل عبارت سے دی ہے:

۱۰۰۰۔ قَوْلُهٗ (۴۸) لَاشَكَّ اَنَّ الْمُرَادَ بِهِ الْبَائِنُ الْمَنْوِیُّ (۴۷۱/۴۷۷)اَقُوْلُ لَا يَرْتَابُ اَحَدٌ اَنَّ الْكِنَايَاتِ لَابُدَّ لَهَا مِنْ نِيَّةٍ لٰكِنْ ههُنَا ثَلٰثَةُ اَشْيَاءَ ، نِيَّةُ الطَّلَاقِ عَلَى الطَّلَاقِ وَهٰذَا هُوَالَّذِیْ لَابُدَّ مِنْهُ فِی الْكِنَايَاتِ، وَنِيَّةُ التَّاكِيْدِ، وَنِيَّةُ الْاِسْتِيْنَافِ بِاَنْ يُّرِيْدَ وَيَقْصُدَ اِيْقَاعَ طَلَاقٍ جَدِيْدٍ غَيْرِ الْاَوَّلِ۔ وَالْعَلَّامَةُ الْبَحْرُ لَايَقُوْلُ بِاِشْتِرَاطِ نِيَّةِ التَّاكِيْدِ حَتّٰى يَرِدَ عَلَيْهِ اَنَّهُمْ لَمْ يَشْتَرِطُوْا ذٰلِكَ بَلْ اِنَّمَا يَقُوْلُ بِاِشْتِرَاطِ عَدَمِ نِيَّةِ الْاِسْتِيْنَافِ لِاَنَّهٗ بَعْدَ نِيَّةِ الْاِسْتِيْنَافِ كَقَوْلِهٖ اَبَنْتُكِ بِاُخْرٰی، فَاِنَّ الْوُقُوْعَ اِنَّمَا هُوَ بِاَبَنْتُكِ لَابِاُخْرٰی، وَاِنَّمَا هُوَ مُعَيَّنٌ لِنِيَّةِ الْاِسْتِيْنَافِ عِنْدَالنَّاسِ، فَلِمَ لَا تَكْفِيْهِ نِيَّتُهٗ فِيْمَا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ رَبِّهٖ، وَكَلَامُهُمْ غَيْرُ صَرِيْحٍ فِیْ اَنَّهٗ لَايُقْبَلُ مِنْهُ الْاِسْتِيْنَافُ اَصْلًا، وَاِنْ نَوٰی وَيُحْمَلُ عَلَى التَّاكِيْدِ جَبْرًا عَلَيْهِ وَكَرْهًا، وَهَلْ هُوَ اِلَّا حَجَرٌ لَهٗ عَنْ تَصَرُّفٍ قَصْدِهٖ قَصْدًا خَاصًّا مَعَ كَوْنِهٖ اَهْلًا، وَالْمَرْئَةُ مَحَلًّا، وَاللَّفْظُ صَالِحًا، وَهُوَالْمُشَدِّدُ عَلٰى نَفْسِهٖ، فَلِمَ لَايُقْبَلُ فَلْيَتَامَّلْ وَاللّٰهُ تَعَالٰی اَعْلَمُ ۱۲ (جد الممتار ج ۲ ص ۵۳۱۔۵۳۲ مطبوعہ رضا اکیڈمی بمبئی۔ ۳)

اس عبارت سے بھی مفتی صاحب مذکور کو سوائے کلی ناکامی کے اور کچھ حاصل نہیں ہوگا، اس عبارت میں اعلیٰ حضرت نے یہ اعتراض کیا ہے کہ جب ایک شخص اپنی بیوی کو کہتا ہے "تو بائن ہے"، پھر دوسری طلاق کی نیت سے دوبارہ کہتا ہے "تو بائن ہے"، تو دوسری طلاق کے وقوع سے کیا چیز مانع ہے؟ وہ شخص طلاق دینے کا اہل ہے، اس کی بیوی طلاق کا محل ہے اور لفظ دوسری طلاق کی صلاحیت رکھتا ہے اور وہ شخص خود اپنے اوپر تنگی کر رہا ہے تو پھر دوسری طلاق کی نیت کو کیوں قبول نہیں کیا جائے گا، اس میں تامل کرنا چاہیے۔

اہل علم سے یہ امر مخفی نہیں کہ جب محققین کسی قول کے بعد تامل کرنے کا حکم دیتے ہیں تو اس میں کسی لطیف امر کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہوتا ہے اور یہاں تامل میں اس اعتراض کے جواب کی طرف اشارہ ہے، اور وہ یہ ہے کہ یہاں دوسری بائن طلاق کی نیت کا معاون کوئی اور لفظ نہیں ہے، جیسے "میں نے تجھے دوسری بائن طلاق دی" (اَبَنْتُكِ بِأُخْرٰی) میں لفظ "دوسری" (بِأُخْرٰی) ہے، جیسا کہ خود علامہ ابن نجیم اور علامہ شامی نے اس کی تصریح کی ہے اور اعلیٰ حضرت نے بھی اس قول کو نقل فرمایا ہے۔

اور صورت مسئولہ میں بھی جب سائل نے "میں نے تجھے آزاد کیا" کو مکرر کہا اور اس سے دوسری طلاق کی نیت کی تو اس نیت کا معاون کوئی دوسرا لفظ نہیں ہے، اس لئے یہاں بھی دوسری طلاق واقع نہیں ہوگی۔

رہا یہ امر کہ کنایات طلاق میں جب دوسرے لفظ سے دوسری طلاق کی نیت کی جائے تو اعلیٰ حضرت کے نزدیک صرف ایک طلاق واقع ہوگی اور دوسری طلاق نہیں ہوگی، تو اس پر دلیل اسی کتاب کی اسی بحث میں یہ عبارت ہے:

۹۹۹۔ قَالَ (۴۷) اِذَا اَمْكَنَ جَعْلُهٗ اِخْبَارًا عَنِ الْاَوَّلِ (۴۷۱/۴۷۴) ف: اَقُوْلُ لَيْسَ الْمُرَادُ خُصُوْصَ اِمْكَانِ خَبَرِيَّتِهٖ بَلِ الْمُرَادُ اِمْكَانُ اَنْ لَّا يُجْعَلَ طَلَاقاً بِرَاْسِهٖ بِاَنْ يُّجْعَلَ خَبَرًا اَوْ تَاكِيْدًا اَوْ تَفْرِيْعاً اَوْ غَيْرَ ذٰلِكَ، دَلِيْلُهٗ مَافِى الْهِنْدِيَّةِ عَنِ الْمُحِيْطِ لَوْ قَالَ حَرَّمْتُ نَفْسِىْ عَلَيْكِ فَاسْتَتِرِىْ وَنَوٰى بِهِمَا

طَلَاقًا فَهِيَ وَاحِدَةٌ بَائِنَةٌ، لِأَنَّهُ لَا يَقَعُ عَلَى بَائِنٍ بَائِنٌ وَكَذَالِكَ اِذَا قَالَ نَوَيْتُ بِقَوْلِي حَرَّمْتُ نَفْسِي وَاحِدَةً وَبِقَوْلِي اِسْتَتِرِي ثَلٰثًا فَهِيَ وَاحِدَةٌ الخ- فَلْيَحْفَظْ ۱۲ (جد الممتار ج ۲ ص ۵۳۱)

ایک شخص نے اپنی بیوی سے کہا: "میں نے تجھ کو اپنے نفس پر حرام کرلیا، پس تو پردہ کر" اور ان دونوں لفظوں سے طلاق کا ارادہ کیا تو صرف ایک طلاق بائن واقع ہوگی، کیونکہ بائن پر بائن واقع نہیں ہوتی، اسی طرح اگر اس نے یہ کہا کہ میں نے "اپنے نفس پر حرام کیا" اس لفظ سے ایک طلاق کا ارادہ کیا تھا اور "تو پردہ کر" اس سے تین طلاق کا ارادہ کیا تھا، تب بھی ایک ہی طلاق واقع ہوگی، اس کو خوب یاد رکھنا چاہئے۔

اعلیٰ حضرت نے اس جزئیے کو عالمگیری سے نقل کیا ہے اور عالمگیری نے المحیط سے نقل کیا ہے۔ اس جزئیہ میں کنایات طلاق میں دوسرے لفظ سے دوسری طلاق کی نیت، بلکہ تین طلاق کی نیت کے باوجود اعلیٰ حضرت قدس سرہ العزیز نے ایک ہی طلاق واقع ہونے کی تصریح کی ہے، جبکہ اس جزئیہ میں بھی عند اللہ اور عند الناس کا فرق جاری ہو سکتا ہے، اور وہ شخص بھی طلاق دینے کا اہل ہے، اس کی بیوی بھی طلاق کا محل ہے اور وہ لفظ، نیتِ طلاق کی صلاحیت بھی رکھتا ہے، اور دوسرے لفظ سے دوسری طلاق یا تین طلاق کی نیت کر کے وہ شخص اپنے اوپر تنگی کرنے والا ہے، اس کے باوجود "صاحب المحیط"، "صاحب الھندیہ" اور خود اعلیٰ حضرت قدس سرہ العزیز نے یہاں دوسرے لفظ سے دوسری طلاق یا تین طلاقوں کی نیت کو موثر نہیں مانا، نیز جب کوئی شخص اپنی بیوی کو دوبار ایک ہی لفظ کو مکرر کر کے کہے "تو بائن ہے، بائن ہے" تو یہاں ظاہراً تاکید ہے، اور جب وہ کہتا ہے: "میں نے تجھ کو اپنے نفس پر حرام کرلیا، سو تو پردہ کر" تو یہاں دوسرا لفظ مختلف ہے اور اس کا ظاہر تاکید نہیں ہے، تو جب یہاں اس دوسرے لفظ سے وہ دوسری طلاق کا یا تین طلاق کا ارادہ کرے تب بھی ایک ہی طلاق واقع ہوگی، تو جب وہ "تو بائن ہے، تو بائن ہے" کہے اور دوسرے لفظ سے دوسری طلاق کا ارادہ کرے تو بطریقِ اولیٰ ایک طلاق واقع ہوگی۔ اسی لئے اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ نے وہاں "فَلْيَتَامَّلْ" فرمایا تھا اور یہاں "فَلْيَحْفَظْ" فرمایا۔ یعنی وہاں "تامل" (خوب غور کر،

سوچ سمجھ لے، گہرائی اور گیرائی میں جاکر سوچ تاکہ تجھ پر اس کی حکمت آشکارا ہو) میں اپنے اعتراض کے جواب کی طرف اشارہ فرمایا اور یہاں "فَلْیَحْفَظْ" فرمایا کہ اس جزئیے کو خوب یاد کرلو، پلے باندھ لو، ہمیشہ کام آئے گا۔ اعلیٰ حضرت عظیم البرکت کی یہ عبارت ہمارے موقف کی صحت اور صواب ہونے پر اور مفتیٔ دار العلوم امجدیہ کے موقف کے بطلان اور ناصواب ہونے پر واضح اور روشن دلیل ہے۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا نے فتاویٰ رضویہ کے باب الکنایات میں جمہور فقہاء کی تصریحات کے مطابق متعدد فتاویٰ دیئے ہیں، سر دست ہم ان میں سے چار فتاویٰ کی نقول آئندہ صفحات پر پیش کر رہے ہیں، جن عبارات سے ہمارے موقف کی تائید ہوتی ہے، ہم نے متعلقہ جگہ ان پر خط کھینچ دیا ہے اور آخر میں وجہ استدلال بھی بیان کردی ہے۔

حضرت صدر الشریعہ علامہ مفتی امجد علی رحمہ اللہ تعالیٰ خلیفۂ اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی قدس سرہ العزیز کی تصنیف عظیم "بہار شریعت" بلاشبہ اردو میں مسائل شریعت کا انسائیکلوپیڈیا ہے، یہ عظیم المرتبت کتاب مستند، معتمد، معتبر، متفق علیہ اور مایہ ناز ہے، لیکن اس اعترافِ عظمت کے باوجود ہم بصد عجز و نیاز و بغایتِ ادب یہ عرض کریں گے کہ ہر قسم کی غلطی اور امکان خطا سے کلی طور پر مبرا صرف کتاب ربانی قرآن مجید ہے، اور خود اعلیٰ حضرت کی تصریح کے مطابق معصوم عن الخطاء صرف اور صرف ذات پاک سید المرسلین ﷺ اور انبیاء کرام و رسل عظام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے نفوس قدسیہ ہیں۔

بہار شریعت کا جزئیہ، جس کا مفتیٔ دار العلوم امجدیہ نے اپنے موقف کی تائید میں حوالہ دیا ہے، ہماری نظر میں تھا، لیکن ہم نے اس کو اولاً تو اس لئے ترک کردیا کہ یہ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قدس سرہ العزیز کے متعدد فتاویٰ اور "جد الممتار" کی تحقیق کے خلاف ہے، ثانیاً اس لئے کہ بہار شریعت میں یہ جزئیہ "در مختار" اور "رد المحتار" کے حوالہ سے لکھا ہوا ہے، ہمارے حسنِ ظن کے مطابق مفتیٔ دار العلوم امجدیہ کو بھی یہ معلوم ہوگا کہ دوسرے لفظ سے دوسری طلاق کی نیت کے مقبول ہونے کا جزئیہ "در مختار" میں اصلاً مذکور نہیں ہے، اور "رد المحتار" میں علامہ شامی نے دلائل سے اس کے برخلاف ثابت کیا ہے کہ

دوسرے لفظ سے دوسری طلاق کی نیت کے باوجود ایک ہی طلاق واقع ہوگی۔ اگر مفتیٔ دارالعلوم امجدیہ کو اس بارے میں ہمارے اس قول کی صداقت پر شبہ ہے تو "در مختار" اور "ردالمحتار" دونوں موجود ہیں، "فَاْتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝"

جہاں تک مفتیٔ دارالعلوم امجدیہ کے فتویٰ پر حضرت علامہ مفتی محمد اختر رضا قادری مدظلہم کی تصدیق و تائید کا تعلق ہے تو ان کے بارے میں بھی ہمارا حسنِ ظن یہی ہے کہ وہ حالت سفر میں اپنے مشاغل کثیرہ کی وجہ سے "فتاویٰ رضویہ" "جد الممتار" اور دیگر "کتب فتاویٰ" کی متعلقہ ابحاث کا بالاستیعاب مطالعہ نہیں فرما سکے، مفتیٔ دارالعلوم امجدیہ کی فقاہت و ثقاہت کے بارے میں مکمل معلومات نہ ہونے کے باعث اعتماد کر بیٹھے، ہم ان سے بھی مسئلے سے متعلق تمام ریکارڈ کے بالاستیعاب مطالعہ کے بعد نظر ثانی اور مفتیٔ دارالعلوم امجدیہ کے "متابعۃ الجواب" کی تصویب و تائید سے رجوع کی مؤدبانہ گزارش کریں گے۔

الحمد للہ علیٰ احسانہ ہم نے مفتیٔ دارالعلوم امجدیہ کے تمام اشکالات دور کر کے یہ مسئلہ بے غبار کر دیا ہے کہ کنایات مکررہ میں ایک ہی طلاق واقع ہوتی ہے، خواہ ہر لفظ سے طلاق کی نیت کی جائے۔ ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ مفتیٔ دارالعلوم امجدیہ کو توفیق دے کہ وہ بے جا ضد اور انا کو ترک کر کے حق اور صواب کو قبول فرمائیں اور ہم پر حرام کو حلال کرنے کا اتہام ناروا لگانے کے بجائے حلال شرعی کو حرام قرار دینے کی روش سے باز آجائیں، وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ، هٰذَا مَاعِنْدِيْ وَاللّٰهُ تَعَالٰى وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ۔

مفتی منیب الرحمٰن
مہتمم دارالعلوم نعیمیہ

پس نوشت

جناب مفتی عبدالعزیز حنفی صاحب کی دانستہ مغالطہ آرائی یا خود فریبی:

مفتیٔ دارالعلوم امجدیہ نے اپنے "متابعۃ الجواب" میں یہ مغالطہ آرائی بھی فرمائی ہے کہ

ہم نے اپنے فتویٰ میں "فتاویٰ رضویہ" سے جو عبارت نقل کی ہے اس میں صرف تین مرتبہ الفاظ کنایہ استعمال کیئے گئے ہیں، نیت کا تذکرہ نہیں، یہ کذب صریح ہے، ان کی اس خود فریبی پر مبنی تحریر من وعن انہی کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیے :

"ثالثاً دارالعلوم نعیمیہ کراچی کے پروفیسر صاحب نے اعلیٰ حضرت محدث بریلوی رحمہ اللہ تعالیٰ کے فتاویٰ رضویہ سے جو عبارت نقل کی ہے اس میں انہوں نے قطع وبرید سے کام لیا فتاویٰ رضویہ میں اور ہم سے پوچھے گئے استفتاء میں موجود فرق کو بھی نہیں سمجھا وہاں صرف تین مرتبہ الفاظ کنایہ استعمال کیئے گئے ہیں نیت کا تذکرہ نہیں ہے۔"

موصوف کی دانستہ غلط بیانی کو واضح کرنے کے لئے ہم نے اپنے فتوے میں بطور استشہاد فتاویٰ رضویہ ج ۱۲ص ۵۷۸۔ ۵۷۲ مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن کا جو حوالہ درج کیا تھا، اس کی نقل ملاحظہ کیجئے۔ اس میں "قصد" اور "نیت" کے الفاظ موجود ہیں۔

اسی ایڈیشن کے صفحہ ۵۷۸ پر اعلیٰ حضرت رقم طراز ہیں کہ : "اگر زید نے ان تینوں لفظوں میں کل یا بعض، کسی سے طلاق دینے کا قصد کیا تھا تو ایک طلاق بائن واقع ہوئی"...... پھر آگے اعلیٰ حضرت نے فتاویٰ عالمگیری کی وہ عبارت بطور استشہاد درج فرمائی ہے جس کا ہم نے اوپر حوالہ دیا ہے۔ اسی طرح اسی ایڈیشن کے صفحہ ۵۷۲ پر اعلیٰ حضرت "فَاِنَّ الْبَائِنَ لَایَلْحَقُ الْبَائِنَ کَمَا فِی الْمُتُوْنِ" کہہ کر فرماتے ہیں :

"صورت مذکورہ میں طلاقِ مغلظہ تو کسی طرح نہ ہوئی، ہاں اگر ان چار لفظوں میں جو زید نے کہے اگر کسی ایک لفظ یا دو تین یا چاروں سے عورت کو طلاق دینے کی نیت زید نے کی تو ایک طلاق بائن ہوگی، اب ہم حجت قاطعہ، ملزمہ کے طور پر اعلیٰ حضرت کے فتاویٰ مع سوال وجواب پیش کر رہے ہیں، ملاحظہ فرمائیے :

مسئلہ ۲۷۸-از پیلی بھیت محلہ پکریا' مسئولہ محمد بشیر احمد صاحب۔ ۱۵ / رجب ۱۳۳۹ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ مسمّی زید جس کی علمی لیاقت علم عربی میں قریب دستار بندی ہے اپنی بیوی کو چند بار یہ الفاظ بحالت صحت نفس کہے کہ میں تم کو خوشی سے اجازت دیتا ہوں جہاں تمہارا دل چاہے چلی جاؤ خواہ تم دوسرا خاوند کر لو خواہ بلا خاوند

رہو، مگر بی بی چندبار یہ الفاظ سن کر بھی خاموش رہی تو کچھ دن کے بعد یہ کہا کہ مجھ کو افسوس ہے کہ کیسی بے حیا عورت ہے کہ میں خوشی سے اجازت چلے جانے کی دیتا ہوں اور میرا پیچھا نہیں چھوڑتی جب بی بی پر یہ ملامت ڈالی تو بی بی نے جانے کی تیاری کی زید نے کاغذات دیہہ زمیندار بی بی جس کا زید کارکن تھا حوالہ کردیئے تواب اس مسئلہ میں شرع شریف کا کیا حکم ہے اور بیوی اب زید سے راضی نہیں ہے اور زید سے قطع تعلق کرتی ہے۔

الجواب

یہ الفاظ کنایہ ہیں نیت پر حکم ہے، اگر زید نے بہ نیت طلاق کہے ایک طلاق ہو گئی اور عورت نکاح سے نکل گئی، اس سے بلا حلالہ اس کی رضامندی سے دوبارہ نکاح کرسکتا ہے جبکہ اس سے پہلے اس عورت کو دو طلاقیں نہ دے چکا ہو، اور اگر وہ قسم کھا کر انکار کردے کہ میں نے یہ الفاظ بہ نیت طلاق نہ کہے تھے تو طلاق نہ مانی جائے گی، اگر جھوٹی قسم کھائے گا وبال اس پر رہے گا۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

مسئلہ ۲۷۹- از آرہ، مسئولہ مولوی عبدالغفور صاحب، ۱۳/ شعبان ۱۳۳۹ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین کہ زید نے اپنی بی بی منکوحہ زینب سے کہا بصورت نااتفاقی کہ ہم تمہارے ہاتھ کا کھانا نہیں کھائیں گے، تب اس پر بی بی مذکور نے کہا کہ جب کھانا نہیں کھاؤ گے تو ہم کو صفائی دے دو۔ تب زید نے کہا کہ صفائی دے دیا بی بی نے کہا صفائی دے دیا تو پھر کہا کہ صفائی دے دیا پھر بی بی نے کہا صفائی دے دیا تو کہا صفائی دے دیا تو بی بی نے کہا کہ تب ہم کہیں چلے جائیں تو زید نے کہا کہ کہیں چلی جاؤ اس صورت مذکورہ میں طلاق مغلّظہ واقع ہوا کہ نہیں اگر طلاق واقع نہیں ہوا تو کیا دلیل بحوالہ کتب معتبرہ تحریر فرمائیں، بینوا توجروا۔

الجواب

صورت مذکورہ میں طلاقِ مغلّظہ کسی طرح نہ ہوئی فان البائن لایلحق البائن[1] کما فی المتون (کیونکہ بائنہ طلاق بائنہ کو لاحق نہیں ہوتی، جیسا کہ متون میں ہے۔ ت) ہاں اگر ان چار لفظوں میں جو زید نے کہے اگر کسی ایک لفظ یا دو تین یا

[1] درمختار باب الکنایات مطبع مجتبائی دہلی ۱/ ۲۲۵

چاروں سے عورت کو طلاق دینے کی نیت زید نے کی تو ایک طلاق بائن ہو گئی عورت نکاح سے نکل گئی عورت کی رضا سے اس سے نکاح دوبارہ کر سکتا ہے اور اگر اصلاً کسی لفظ سے نیتِ طلاق نہ کی تو وہ بدستور اس کی زوجہ ہے طلاق نہ ہوئی۔

مسئلہ ۲۸۲- مرسلہ حکیم احمد حسین صاحب محلہ طویلہ، ۷ شوال ۱۳۰۸ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید و ہندہ میاں بی بی میں باہم جھگڑا رہتا تھا اکثر اسے تکلیف دیتا اور مارتا ایک دن اس سے زیور مانگا اس نے انکار کیا کہا تجھے چاقو سے مار ڈالوں گا ہندہ بخوفِ جان والدین کے یہاں چلی آئی تو شوہر نے چوری کا الزام بھی لگایا اور تھانہ میں رپٹ کا ارادہ کیا لوگوں نے سمجھایا اس وقت یہ گفتگو ہوئی جو لکھی جاتی ہے، ناصح کیا فضیحت کراؤ گے۔ زید: وہ میری بیوی ہی نہیں رہی فضیحت کیسی۔ ناصح: دیکھو لغو باتیں نہ کرو۔ زید: جب وہ میری بلا اجازت چلی گئی میرے نکاح سے باہر ہے اور وہ میرے کام کی نہ رہی مجھ کو اس سے کچھ غرض نہیں۔ ناصح: دیکھو کنایہ اشارہ سے بھی طلاق ہو جاتی ہے ذرا سوچ سمجھ کر کہو تم پڑھے لکھے آدمی ہو۔ زید: مجھ کو اس سے کچھ غرض نہیں نہ وہ میری بیوی ہے۔ آیا اس گفتگو سے وہ عورت مطلقہ ہوئی یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب

زید کا پچھلا قول کہ "نہ وہ میری بیوی ہے" مذہب مختار پر اصلاً الفاظ طلاق سے نہیں یہاں تک کہ بہ نیت طلاق بھی کہے تاہم واقع نہ ہوگی۔ عالمگیری میں ہے:

لَوْقَالَ: "تُوزَنِ مِنْ نِیْ" لَا یَقَعُ وَاِنْ نَوٰی ھُوَالْمُخْتَارُ کَذَا فِیْ جَوَاھِرِ الْاَخْلَاطِیِّ[1]۔ اگر کہا تو میری بیوی نہیں ہے، تو طلاق کی نیت کے باوجود طلاق نہ ہوگی، یہی قول مختار ہے، جیسا کہ جواہر اخلاطی میں ہے۔ (ت)

اسی طرح "مجھ کو اس سے کچھ غرض نہیں" یہ بھی لفظ طلاق نہیں کہ غرض بمعنی شوق مستعمل ہے کما فی القاموس (جیسا کہ قاموس میں ہے۔ ت) یا قصد و خواہش کما فی المنتخب (جیسا کہ منتخب میں ہے۔ ت) یا حاجت کما فی شروح النصاب (جیسا کہ شروح نصاب میں ہے۔ ت) اور ان اشیاء کی نفی سے طلاق واقع نہیں

---

[1] فتاوٰی ہندیہ الفصل السابع فی الطلاق بالالفاظ الفارسیۃ نورانی کتب خانہ پشاور ۱/۳۸۲

ہوتی اگرچہ بہ نیت طلاق اطلاق کرے۔ عالمگیری میں ہے:

لَوْ قَالَ لَا حَاجَةَ لِیْ فِیْكِ یَنْوِی الطَّلَاقَ فَلَیْسَ بِطَلَاقٍ کَذَا فِی السِّرَاجِ الْوَھَّاجِ اِذَا قَالَ لَاأُرِیْدُكِ اَوْلَا اُحِبُّكِ اَوْلَا اَشْتَھِیْكِ اَوْلَا رَغْبَةَ لِیْ فِیْكِ فَاِنَّهٗ لَا یَقَعُ وَاِنْ نَوٰی فِیْ قَوْلِ اَبِیْ حَنِیْفَةَ رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالٰی کَذَا فِی الْبَحْرِ الرَّائِقِ[1]۔

اگر کہا "مجھے تیرے بارے کوئی حاجت نہیں" اور طلاق کی نیت کی ہو تو بھی طلاق نہ ہوگی، سراج وہاج میں ایسے ہی ہے۔ اور جب کہا "میں تجھے نہیں چاہتا" "میں تجھے پسند نہیں کرتا" "تیرے بارے مجھے رغبت نہیں" اگر نیت ہو تب بھی امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالٰی کے نزدیک طلاق نہ ہوگی، البحرالرائق میں یوں ہی ہے۔ (ت)

اِذْھَبِیْ یَحْتَمِلُ رَدًّا وَنَحْوُ خَلِیَّةٌ بَرِیَّةٌ یَصْلَحُ سَبًّا (اِلٰی قَوْلِهٖ) فِی الْغَضَبِ تُوُقِّفَ الْاَوَّلَانِ اِنْ نَوٰی وَقَعَ وَاِلَّا لَا[2]۔

اس لئے کہ یہ جواب بھی بن سکتا ہے، اور تو جدا ہے، تو بری ہے، یہ الفاظ ڈانٹ کا احتمال رکھتے ہیں اس کے قول کہ "غصہ میں پہلے دونوں الفاظ موقوف رہیں گے، اگر طلاق کی نیت کی تو طلاق واقع ہوگی ورنہ نہیں"۔ (ت)

مبسوط امام سرخسی میں ہے:

وَعَنْ اَبِیْ یُوْسُفَ رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالٰی اَنَّهٗ اَلْحَقَ بِھٰذِهِ الْاَلْفَاظِ خَلَّیْتُ سَبِیْلَكِ، فَارَقْتُكِ لَاسَبِیْلَ اِلَیْكِ، لَا

امام ابویوسف رحمہ اللہ تعالٰی کے نزدیک یہ "میں نے تیرا راستہ کھول دیا"، "میں تجھ سے جدا ہو" اور "میری تجھ پر کوئی

---

[1] فتاوٰی ہندیہ — الفصل الخامس فی الکنایات — نورانی کتب خانہ پشاور ۱/۳۷۵

[2] درمختار — باب الکنایات — مطبع مجتبائی دہلی ۱/۲۵-۲۲۴

مِلْكَ لِیُ عَلَيْكِ لِاَنَّهَا تَحْتَمِلُ السَّبَّ، اَیُ لاَ مِلْكَ لِیُ عَلَيْكَ لِاَنَّكِ اَدُوَنُ مِنُ اَنُ تَملُکِیُ وَفَارَقْتُكِ اِتِّقَاءً لِشَرِّكِ وَخَلَّيْتُ سَبِيلَكِ لِهوَانِكِ عَلَیَّ ۱ ۔ (مُلَخَّصاً)

ملکیت نہیں" کے ساتھ ملحق ہے کیونکہ یہ الفاظ ڈانٹ کا احتمال بھی رکھتے ہیں یعنی "میری تجھ پر ملکیت نہیں" کا یہ معنی بھی ہو سکتا ہے کہ تو اس قابل نہیں کہ میں تیرا مالک ہوں، اور میں تجھ سے جدا ہوا یعنی تیرے شر سے جدا ہوں، میں نے تیرا راستہ کھولا کیونکہ میرے ہاں تو حقیر ہے۔ (ملخصا) (ت)

فتح القدیر میں ہے:

یُدَیَّنُ فِی الْغَضَبِ لِاَنَّ هٰذِهِ الْاَلْفَاظِ تُذْکَرُ لِلْاِبْعَادِ وَحَالَةَ الْغَضَبِ یَبْعُدُ الْاِنْسَانُ عَنِ الزَّوْجَةِ ۲ ۔

غصہ میں ان الفاظ کے متعلق خاوند کی تصدیق کی جائے گی کیونکہ یہ الفاظ دور کرنے کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں جبکہ غصہ کی حالت میں انسان بیوی سے دور رہتا ہے۔ (ت)

یہ بات کہ ان میں اصلاً کسی لفظ سے طلاق کی نیت نہ کی تھی اگر زید قسم کھا کر کہہ دے قبول کرلیں گے اور حکم طلاق نہ دیں گے اگر زید جھوٹی قسم کھائے گا وبال اس پر ہوگا یہ قسم گھر میں عورت بھی کر سکتی ہے۔

درمختار میں ہے:

وَیَکْفِیُ تَحْلِیُفُهَا لَهٗ فِیُ مَنْزِلِهٖ، وَاللّٰهُ تَعَالیٰ اَعْلَمُ۔

عورت کا مرد سے گھر میں قسم لینا کافی ہے، واللہ تعالیٰ اعلم (ت)

(فتاوٰی رضویہ جلد ۱۲ صفحات ۵۷۱ تا ۵۷۴، مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن لاہور)

---

۱ مبسوط امام سرخسی باب ما تقع بہ الفرقۃ الخ دار المعرفۃ بیروت ۶/ ۸۱

۲ فتح القدیر فصل فی الطلاق قبل الدخول مکتبہ نوریہ رضویہ سکھر ۳/ ۴۰۲

اسی میں ہے:

رَجُلٌ قَالَ لِامْرَأَتِہٖ مرابکار نیستی وَنَوٰی بِہِ الطَّلَاقَ لَا یَقَعُ کَذَافِی الظَّھِیْرِیَّۃِ [۱]

کسی شخص نے اپنی بیوی سے کہا "تو میرے لئے کام کی نہیں" تو نیت کے باوجود طلاق نہ ہوگی' جیسا کہ ظہیریہ میں ہے۔ (ت)

ہاں "وہ میری بیوی نہ رہی" کنایاتِ طلاق سے ہے۔ عالمگیری میں ہے:

لَوْقَالَ صِرْتِ غَیْرَ اِمْرَأَتِیْ فِیْ رَضَا اَوْسُخْطٍ تُطَلَّقُ اِذَا نَوٰی کَذَافِی الْخُلَاصَۃِ [۲]

اگر خاوند نے رضا یا ناراضگی سے کہا "تو میری بیوی نہ رہی" اگر طلاق کی نیت ہو تو طلاق ہوجائے گی' جیسا کہ خلاصہ میں ہے (ت)

اسی طرح یہ لفظ بھی کہ "وہ میرے نکاح سے باہر ہے" صریح نہیں کنایہ ہے'

لِاَنَّ الْخُرُوْجَ مِنَ النِّکَاحِ یَکُوْنُ بِالطَّلَاقِ وَبِکُلِّ فُرْقَۃٍ جَاءَ تْ مِنْ قِبَلِہٖ کَتَقْبِیْلِہٖ بِنْتَھَا اَوْمِنْ قِبَلِھَا کَتَقْبِیْلِھَا اِبْنَہٗ وَغَیْرَ ذٰلِکَ فَلَمْ یَتَعَیَّنْ لِاِفَادَۃِ الطَّلَاقِ وَصَارَ کَقَوْلِہٖ لَمْ یَبْقَ اَوْلَیْسَ بَیْنِیْ وَبَیْنَکِ نِکَاحٌ بَلْ ھُمَا عِبَارَتَانِ عَنْ مَعْنًی وَاحِدٍ، وَھٰذَایَتَوَقَّفُ عَلَی النِّیَّۃِ فَکَذَا ذَاکَ

کیونکہ نکاح سے خروج' طلاق کے ساتھ اور دیگر وجوہ سے بھی ہوسکتا ہے۔ مثلاً خاوند بیوی کی بیٹی کا (شہوت کے ساتھ) بوسہ لے یا بیوی خاوند کے بیٹے کا اسی طرح بوسہ لے یا اس کے علاوہ بھی کئی طرح سے فرقت کے اسباب ہوسکتے ہیں' لہذا یہ لفظ طلاق کیلئے خاص نہ رہا' جب وہ کہے "نکاح باقی نہ رہا" یا "تیرے میرے درمیان نکاح نہیں ہے" بلکہ یہ دونوں ہم معنی ہیں تو نیت پر موقوف ہوں گے' یہ بھی ایسا ہے (ت)

عالمگیری میں ہے:

---

[۱] فتاوٰی ہندیہ الفصل السابع فی الطلاق بالالفاظ الفارسیۃ نورانی کتب خانہ پشاور ۱/ ۳۸۰

[۲] فتاوٰی ہندیہ الفصل الخامس فی الکنایات، نورانی کتب خانہ پشاور ۱/ ۳۷۶

لَوْقَالَ لَهَا لَا نِكَاحَ بَيْنِيْ وَبَيْنَكِ اَوْقَالَ لَمْ يَبْقَ بَيْنِيْ وَبَيْنَكِ نِكَاحٌ يَقَعُ الطَّلَاقُ اِذَانَوٰی۔[1]

اگر کہا "تیرے میرے درمیان نکاح باقی نہیں رہا" اگر نیت ہو تو طلاق ہو گی ورنہ نہیں (ت)

یوں ہی "وہ میرے کام کی نہ رہی" بھی کنایات سے ہے کَمَا حَقَّقْنَاهُ فِیْ مَا عَلَّقْنَاهُ عَلٰی رَدِّ الْمُحْتَارِ (جیسا کہ ہم نے اس کی تحقیق ردالمحتار کے حاشیہ میں کر دی ہے۔ت) مگر سوقِ کلام سے ظاہر یہ ہے کہ زید نے یہ الفاظ بطور اخبار کہے، نہ بہ نیتِ انشائے طلاق۔ تیسرا لفظ دوسرے پر معطوف ہے اور دوسرا پہلے کی شرح و بیان علت، اور اس اخبار کا مبنیٰ وہ غلط گمان جو عوام زمانہ میں شائع ہے کہ عورت بے اجازت شوہر گھر سے چلی جائے تو نکاح سے نکل جاتی ہے اور جو اخبار و اقرار طلاق بربنائے غلط فہمی مسئلہ ہو دیانۃً اصلاً مؤثر نہیں،

فِی الْخَیْرِیَّةِ عَنِ الْاَشْبَاهِ عَنْ جَامِعِ الْفُصُوْلَیْنِ وَالْقُنْیَةِ، اِذَا اَقَرَّ بِالطَّلَاقِ بِنَاءً عَلٰی مَا اَفْتٰی بِهِ الْمُفْتِیْ ثُمَّ تَبَیَّنَ عَدَمُ الْوُقُوْعِ فَاِنَّهٗ لَا یَقَعُ۔[2]

خیریہ میں اشباہ سے اور وہاں سے جامع الفصولین اور قنیہ سے منقول ہے کہ اگر مفتی کے فتوٰی کی بناء پر طلاق ہونے کا اقرار کیا تو پھر معلوم ہوا کہ طلاق نہ ہوئی تو اس اقرار کو طلاق نہ قرار دیا جائے گا۔ (ت)

خیر بہر حال مدار کار نیت پر ہے، اگر زید نے ان تینوں لفظوں میں کل یا بعض کسی سے طلاق دینے کا قصد کیا تھا تو ایک طلاق بائن واقع ہوئی کہ عورت راضی ہو تو اب یا عدت کے بعد جب چاہے بے حلالہ اس سے نکاح کر سکتا ہے۔ عالمگیری میں ہے:

لَا یَلْحَقُ الْبَائِنُ الْبَائِنَ بِاَنْ قَالَ لَهَا اَنْتِ بَائِنٌ ثُمَّ قَالَ لَهَا اَنْتِ بَائِنٌ لَا یَقَعُ اِلَّا طَلْقَةٌ وَاحِدَةٌ بَائِنَةٌ۔[3]

اگر کہا، تجھے ایک بائنہ طلاق، اس کے بعد دوبارہ کہا تجھے بائنہ طلاق، تو ایک ہی بائنہ طلاق ہو گی کیونکہ پہلی بائنہ کے بعد دوسری بائنہ اسکو لاحق نہیں ہو سکتی (ت)

---

[1] فتاوٰی ہندیہ، الفصل الخامس فی الکنایات، نورانی کتب خانہ پشاور ۱/ ۳۷۵

[2] فتاوٰی خیریہ کتاب الطلاق دارالمعرفۃ بیروت ۱/ ۴۷

[3] فتاوٰی ہندیہ الفصل الخامس فی الکنایات نورانی کتب خانہ پشاور ۱/ ۳۷۷

اور اگر ان تین میں کسی لفظ سے طلاق دینے کی نیت نہ کی اگرچہ اخیر کے دونوں لفظ بہ نیت طلاق کہے ہوں تو اصلاً طلاق نہ ہوئی وہ بدستور اس کی زوجہ ہے اور نیتِ طلاق نہ ہونے میں شوہر کا قول قسم کے ساتھ معتبر ہے اگر وہ بقسم کہہ دے کہ میں نے ان تینوں لفظوں میں کسی سے نیت انشائے طلاق نہ کی تھی قطعاً مان لیں گے اور انہیں زوج و زوجہ جانیں گے اگر وہ اس قسم میں جھوٹا ہے تو وبال اس پر ہے عورت پر الزام نہیں۔ درمختار میں ہے:

اَلْقَوْلُ لَهٗ بِيَمِيْنِهٖ فِيْ عَدَمِ النِّيَّةِ[1] (نیت نہ ہونے میں خاوند کی بات معتبر ہوگی۔ ت)

واللہ تعالیٰ اعلم۔

(فتاویٰ رضویہ جلد نمبر ۱۲ صفحات ۵۷۶، ۵۷۷، ۵۷۸، مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

مسئلہ نمبر ۲۸۴: از پیلی بھیت محلہ بشیر خاں متصل مکان بینہ شاہ مرسلہ نظام الدین شانہ گر ۲۹ رمضان المبارک ۱۳۱۱ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ایک شخص نے اپنی عورت مدخولہ سے تین بار کہا "میں نے تجھے آزاد کیا" اس صورت میں نکاح قائم رہا یا نہیں؟ اور اب اس سے نکاح کر سکتا ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب

یہ لفظ کہ "مرد نے عورت سے کہا" اگر ان سے طلاق کے معنی مراد نہ تھے جب تو طلاق اصلاً نہ ہوئی اور اگر بہ نیت طلاق کہے تو ایک طلاق پڑ گئی عورت نکاح سے نکل گئی مگر حلالہ وغیرہ کی کچھ ضرورت نہیں، نہ اسے کچھ انتظار کی حاجت، دونوں آپس میں راضی ہوں تو اسی وقت پھر نئے سرے سے نکاح کر لیں، ہاں اگر شوہر نے خود ہی ان میں کوئی لفظ تین طلاقوں کی نیت سے کہا تو بیشک طلاق مغلظہ ہوگئی کہ اب بے حلالہ کے اس سے نکاح نہیں کر سکتا۔

---

[1] درمختار باب الکنایات مطبع مجتبائی دہلی ۱/ ۲۲۴

فِی الْهِنْدِیَّةِ لَوْقَالَ اَعْتَقْتُكِ، طَلُقَتْ بِالنِّیَّةِ كَذَا فِیْ مِعْرَاجِ الدِّرَایَةِ اھ[1] وَفِی الدُّرِّ[2] كِنَایَةُ مَالَمْ یُوْضَعْ لَهٗ اَیْ الطَّلَاقَ وَاحْتَمَلَهٗ وَغَیْرَهٗ وَیَقَعُ الْبَائِنُ اِنْ نَوَاهَا اَوِاثْنَتَیْنِ وَثَلٰثٌ اِنْ نَوَاهُ، وَلَا یَلْحَقُ الْبَائِنُ اِذَا اَمْكَنَ جَعْلُهٗ اِخْبَارًا عَنِ الْاَوَّلِ كَانْتِ بَائِنٌ، بَائِنٌ، اَوْ اَبَنْتُكِ بِتَطْلِیْقَةٍ فَلَا یَقَعُ لِاَنَّهٗ اِخْبَارٌ، فَلَا ضَرُوْرَةَ فِیْ جَعْلِهٖ اِنْشَاءً بِخِلَافِ اَبَنْتُكِ بِاُخْرٰی اَوْقَالَ نَوَیْتُ الْبَیْنُوْنَةَ الْكُبْرٰی لِتَعَذُّرِ حَمْلِهٖ عَلَی الْاِخْبَارِ فَیُجْعَلُ اِنْشَاءً اھ[2] مُلْتَقَطًا

ہندیہ میں ہے اگر خاوند نے کہا "میں نے تجھے آزاد کیا" تو نیتِ طلاق سے طلاق ہو جائے گی، جیسا کہ معراج الدرایہ میں ہے اھ اور دُر میں ہے وہ لفظ کنایہ ہوتا ہے جو طلاق کے لئے وضع نہ ہو اور وہ طلاق اور غیر طلاق دونوں قسم کا احتمال رکھتا ہو تو ایسے لفظ سے بائنہ طلاق ہو گی ایک یا دو کی نیت سے ایک، اور تین کی نیت سے تین ہوں گی اور ایسا لفظ پہلی بائنہ طلاق کو لاحق نہ ہو گا مگر جب وہ پہلی طلاق کی حکایت کا احتمال رکھتا ہو تو اس کو خبر و حکایت ہی قرار دیا جائے گا، مثلاً یوں کہے "تو بائن بائن ہے" یا کہے "میں نے ایک طلاق بائنہ دی ہے" تو دوسری بائنہ واقع نہ ہو گی، کیونکہ اس کو انشاء بنانے کی ضرورت نہیں، اس کے برخلاف جب یوں کہے "میں نے تجھے دوسری بائنہ طلاق دی" یا کہے "میں نے بڑی بائنہ کی نیت کی ہے" تو اس صورت میں اس کو خبر قرار دینا درست نہیں ہو سکتا، لہذا اس کو انشاء ہی ماننا پڑے گا اھ ملتقطا (ت)

(فتاویٰ رضویہ جلد نمبر ۱۲ ص ۵۸۱، ۵۸۲ مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن)

---

[1] فتاویٰ ہندیہ الفصل الخامس فی الکنایات نورانی کتب خانہ پشاور ۱/ ۳۷۶
[2] در مختار باب الکنایات مطبع مجتبائی دہلی ۱/ ۲۲۴

مسئلہ نمبر ۳۲۰: از ملک متوسط شہر رائپور محلہ بیجناتھ بارہ مرسلہ منشی محمد اسحٰق مولود خواں عرائض نویس ۹/ جمادی الآخرہ ۱۳۱۲ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین اس مسئلہ میں کہ ایک شخص مسمی طالع ورخاں نے بحالت غیظ وغضب ایک خط اپنے خسرِ حقیقی کے نام لکھا جس کا خلاصہ یہ ہے جناب ماموں نجم خاں صاحب دام ظلہٗ بعد السلام علیکم واضح ہو میں نے آپ سے بارہا کہا کہ عمدہ کو یہاں سے مت لے جاؤ، مگر آپ لے ہی گئے بغیر رضامندی، آپ نے اپنی ہی ضد کی' میں بھی اُس کے اطوار سے نہایت درجہ ناخوش تھا' اس چار مہینہ کے عرصہ میں کبھی میری خدمت نہ کی' اطوار ناشائستہ جو اس میں ہیں ان کا دفع غیر ممکن ہے' اس سے بڑھ کر خراب عادات عمدہ میں ہیں' لہٰذا خوشی تمام آپ کو اجازت دیتا ہوں کہ اس کا نکاح کسی دوسرے شخص کے ساتھ کردو' کیونکہ جس حالت میں میرا دل اس سے خوش نہیں اور اس کا بھی مجھ سے نہیں ایسی حالت میں ایک دوسرے کی جان کے ضرور خواہاں رہیں گے ایسا نہ ہونا سبب' برضاورغبت آپ کو اجازت دیا' اس کا خرابہ نہ ہونا سبب دوسرے نکاح کی اجازت دیا' تاکہ خدائے پاک مجھ کو اپنے فضل سے مرتکب گناہ نہ کرے' اس خط کو بطور طلاق نامہ کے تصور فرمائیں اگر آپ اس کا نکاح کرادیں گے تو مجھ کو کسی نوع کا عذر تکرار آگے نہیں اور نہ کروں گا صرف ڈیڑھ سو روپیہ نکاح میں صرف ہوا اس کا تو البتہ افسوس ہے کہ حج کا روپیہ خرچ ہو گیا مگر کیا علاج ہے کچھ چارہ نہیں' مرضیٔ مولیٰ از ہمہ اولیٰ۔ آپ اپنے دل میں بھی اس کا رنج نہ کریں تحریر مختصر کو کثیر تصور فرمائیں، عمدہ سے اور مجھ سے اب کچھ سروکار نہ رہا، جو رشتہ پہلے تھا وہی اب قائم رہے گا' سرمست خاں اس خط کو حرف بحرف پڑھ کر ماموں صاحب اور عمدہ کو بھی سنادیں تاکہ اس پر شرعاً طلاق واجب ہوجائے، کیونکہ وہ میری بلااجازت گئی تو نکاح کے باہر ہونا اظہر من الشمس ہے' فقط بندہ طالع ورخاں از مقام ساکولی

جس وقت یہ خط پہنچا سرمست خاں نے عمدہ اور اس کے والد نجم خاں کو سنادیا' بعد ایک ہفتہ کے طالع ورخاں اپنے خسر کے یہاں آئے اور کہنے لگے کہ میری زوجہ عمدہ کو میرے ساتھ روانہ کردو، نجم خاں نے روبرو چند آدمیوں کے بھیجنے کا اقرار کیا پھر بعد دو گھنٹہ کے طالع

ور خاں لینے آئے تو معلوم ہوا کہ نجم خاں دیہات پر چلا گیا' بعد چند ماہ کے نجم خاں نے طالع ور خاں سے صراحتاً کہہ دیا کہ ہم لڑکی کو کیسے روانہ کریں تم نے تو طلاق نامہ لکھ کر روانہ کر دیا' پھر بائیس ۲۲ ماہ کے بعد طالعور خاں نے اپنے خسر کے نام یہ خط لکھا :

جناب ماموں صاحب! بعد سلام علیک واضح ہو میں نے یہاں پر کئی علماء سے دریافت کیا سب یہی کہتے ہیں طلاق ہو چکی اس لئے عرض پرداز ہوں کہ آپ اپنی لڑکی کا نکاح کرا دیجئے' مجھ سے کوئی واسطہ نہ رہا آپ رنجیدہ نہ ہوں امر مجبوری ہے ورنہ کوئی صورت لانے کی کیا ہو تا فقط۔

پھر نو ماہ کے بعد خسر کو خط لکھا کہ فرنگی محل کے علماء سے خط بھیج کر فتویٰ طلب کیا تھا' جواب آیا کہ طلاق ہو چکی' مہر کے نسبت انہوں نے فتویٰ دیا کہ نصف مہر دینا چاہئے' مگر میں اور جوابوں کا منتظر ہوں' پس عرض یہ ہے کہ صورت مرقومہ بالا میں عمدہ پر طلاق ہوئی یا نہیں؟ اگر ہوئی تو کن لفظوں سے؟ اور کس قسم کی؟ اور کتنی طلاق متحقق ہوئیں؟ غرض عمدہ طالعور خاں کے نکاح میں رہی یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب

اللّٰهم هداية الحق والصواب۔ اس خط میں آٹھ لفظ تھے :

(۱) بخوشی تمام اجازت دیتا ہوں کہ اس کا نکاح کسی دوسرے کے ساتھ کر دو۔

(۲) برضا و رغبت آپ کو اجازت دیا۔

(۳) اس کا خرابانہ ہونا سبب دوسرے نکاح کی اجازت دیا۔

(۴) اس خط کو بطور طلاق نامہ تصور فرمائیں۔

(۵) اگر آپ اس کا نکاح کرا دیں گے تو مجھ کو کسی نوع کا عذر تکرار آگے نہیں اور نہ کروں گا۔

(۶) عمدہ سے اور مجھ سے کوئی سروکار نہ رہا۔

(۷) اس خط کو ماموں صاحب اور عمدہ کو سنا دیں کہ اس پر شرعاً طلاق واجب ہو جائے۔

(۸) وہ میری بلا اجازت گئی تو نکاح کے باہر ہونا اظہر من الشمس ہے۔

ان میں لفظ چہارم صالح ایقاع طلاق نہیں کہ بطور طلاق نامہ تصور فرمائیں' کے صاف یہ معنی کہ حقیقت میں طلاق نامہ نہیں' فتاویٰ امام قاضی خاں میں ہے :

امرأة قالت لزوجها مرا طلاق ده فقال الزوج داده انگار او کرده انگار لایقع وان نوی کانه قال لها بالعربیة احسبی انك طالق وان قال ذلك لایقع وان نوی[1] اھ ملخصاً

بیوی نے خاوند سے کہا "مجھے طلاق دے" خاوند نے جواب میں کہا "تو دی ہوئی یا کی ہوئی خیال کرلے" تو طلاق نہ ہوگی اگرچہ طلاق کی نیت کی ہو کیونکہ عربی میں اس کا معنی یوں ہے "تو گمان کرلے تو طلاق والی ہے" اور اگر یوں بالفاظِ عربی کہا تو طلاق نہ ہوگی چاہے طلاق کی نیت کی ہو۔ اھ ملخصا (ت)

اسی میں ہے:

لوقیل لرجل اطلقت امرأتك فقال عدها مطلقة اواحسبها مطلقة لاتطلق امرأته[2] اھ تمام تحقیق ذلك فی فتاوٰنا المفصلة۔

ایک شخص نے دوسرے سے کہا "کیا تو نے اپنی بیوی کو طلاق دی ہے" اور دوسرا جواب میں کہے "تو اس کو طلاق دی ہوئی شمار کرلے' تو مطلقہ سمجھ لے" تو بیوی کو طلاق نہ ہوگی۔ اھ' اس کی مکمل تحقیق ہمارے مفصل فتووں میں ہے (ت)

لفظ پنجم ظاہراً ترک نزاع کا وعدہ ہے:

آگے بمعنی آئندہ اوھو تعلیق علی الانکاح ان ارید بقوله آگے بعد الانکاح' اواخبار عن النیة فی بعض الالفاظ السابقة ان اریدبه من بعد ما کتبت ھذا۔

آگے بمعنی آئندہ یا یہ نکاح کردینے پر معلق ہے اگر اس نے "آگے" کے لفظ سے نکاح کردینے کے بعد کی نیت کی ہو' یا پہلے مذکور الفاظ میں سے کسی لفظ میں نیت کی خبر دینا ہے جبکہ اس نے وہ لفظ لکھنے کے بعد مراد لی ہو۔ اسے محفوظ کرلو۔ (ت)

---

[1] فتاوٰی قاضی خاں کتاب الطلاق نولکشور لکھنو ۱/ ۲۱۰
[2] فتاوٰی قاضی خان کتاب الطلاق نولکشور لکھنو ۱/ ۲۱۳

لفظ ششم بھی الفاظِ طلاق سے نہیں، سر بمعنی خیال وخواہش اور کار بمعنی حاجت ہے، سروکار نہیں یعنی غرض، مطلب، حاجت کام نہیں، اور ان الفاظ سے طلاق نہیں ہوتی اگرچہ بہ نیتِ طلاق کہے۔ خانیہ وبزازیہ وغیرہما میں ہے:

لوقال لاحاجة لی فیك ونوی الطلاق لایقع وکذالوقال مرابکار نیستی وکذا لو قال ما اریدك [1]

اگر خاوند نے کہا "مجھے تجھ میں کوئی حاجت نہیں" تو طلاق کی نیت کے باوجود طلاق نہ ہوگی۔ یوں ہی اگر اس نے کہا "تو میرے کام کی نہیں" یوں ہی اگر اس نے کہا "میں تجھے نہیں چاہتا" تو طلاق نہ ہوگی۔ (ت)

بحر الرائق میں ہے:

اذا قال لاحاجة لی فیك اولا اریدك او لااحبك اولااشتھیك اولا رغبة لی فیك فانه لایقع وان نوی [2]

اگر خاوند نے یہ الفاظ کہے "مجھے تجھ میں حاجت نہیں، میں تجھے نہیں چاہتا، میں تجھے پسند نہیں کرتا، مجھے تیری خواہش نہیں، تجھ میں میرے لئے رغبت نہیں" تو طلاق کی نیت کے باوجود طلاق نہ ہوگی۔ (ت)

لفظ ہشتم بھی محض لغو وغلط ہے کہ ایک باطل خیال جہاں پر نکاح سے باہر ہونا بتاتا ہے بے اجازتِ شوہر عورت چلی جائے تو نکاح سے باہر نہیں ہوتی اور جو اقرار غلط بنا پر ہو معتبر نہیں۔ خانیہ میں ہے:

صبی قال ان شربت فکل امرأة اتزوجھا فھی طالق فشرب وھو صبی فتزوج وھو بالغ وظن

ایک بچے نے کہا "اگر میں یہ پی لوں تو جس عورت سے بھی نکاح کروں تو اس کو طلاق" پھر اس نے دورانِ بچپن وہ چیز پی

---

[1] فتاوٰی قاضی خاں کتاب الطلاق نولکشور لکھنؤ ۱/ ۲۱۳

[2] البحر الرائق باب الکنایات ایچ ایم سعید کمپنی کراچی ۳/ ۳۰۳

صهره ان الطلاق واقع فقال هذا البالغ (آرے حرام است برمن) لاتحرم امرأته هوالصحیح لانه مااقربالحرمة ابتداء وانما اقر بالسبب الذی تصادقا علیه وذٰلك السبب باطل [۱] اھ ملخصًا

لی' پھر بالغ ہونے کے بعد اس نے کسی عورت سے نکاح کیا اور اس کے سسرال نے خیال کیا کہ اس کے مذکور قول کی وجہ سے طلاق ہوگئی ہے تو اس لڑکے نے کہا "ہاں یہ مجھ پر حرام ہے" تو اس صورت میں صحیح قول کے مطابق اس کی بیوی اس پر حرام نہ ہوگی' کیونکہ یہاں ابتداءً بیوی کو حرام نہیں کہا بلکہ اس نے اس سبب کے وجود کا اقرار کیا جس پر یہ دونوں سچے ہیں اور جس سبب پر اس نے یہ اقرار کیا وہ باطل ہے۔ اھ ملخصاً (ت)

بقیہ چار الفاظ میں تین لفظ پیشین کا حاصل اجازتِ نکاح دینا ہے اور وہ بیشک کنایات سے ہے'

فانه ینبئ عن رفع قید النکاح واخراجها عن عصمة لنفسه کقوله تزوجی [۲] کما فی الخانیة وابتغی الازواج [۳] کما فی الکنز و ووهبتك للازواج [۴] کما فی الهندیة

کیونکہ یہ الفاظ نکاح کی قید کو ختم کرنے کی خبر دیتے ہیں اور اپنی عصمت سے نکالنے کی خبر دیتے ہیں جیسے کہ خاوندیوں کے "تو نکاح کر" جیساکہ خانیہ میں ہے "تو خاوند تلاش کر" جیساکہ کنز میں ہے "میں نے تجھ کو خاوندوں کے سپرد کیا" جیساکہ ہندیہ میں ہے۔ (ت)

---

[۱] فتاوٰی قاضی خاں باب التعلیق نولکشور لکھنؤ ۱/ ۲۳۵

[۲] فتاوٰی قاضی خاں فصل فی الکنایات نولکشور لکھنؤ ۱/ ۲۱۶

[۳] کنزالدقائق باب الکنایات ایچ ایم سعید کمپنی کراچی ص ۱۱۶

[۴] فتاوٰی ہندیہ الفصل الخامس فی الکنایات نورانی کتب خانہ پشاور ۱/ ۳۷۶

مگر ان تین اور ان کے ساتھ کتنی ہی کنایات بائنہ ہوں سب سے ہوگی تو ایک ہی طلاق بائن ہوگی اگرچہ سب سے نیت کی ہو فان البائن لایلحق البائن (کیونکہ بائن طلاق کے بعد دوسری بائنہ لاحق نہیں ہوسکتی۔(ت)

لفظ ہفتم طلاق صریح ہے مگر اس شرط پر معلق کہ سرمست خاں، نجم خاں اور عمدہ کو حرف بحرف خط پڑھ کر سنادے'

فان لفظہ تاکہ تفید ھٰھنا ترتب الطلاق علی الاسماع ای ربط حصول ذاك بحصول ھذا وھذا ھو معنی التعلیق و فی الدرالمختار یکفی معنی الشرط[1]

اس لئے کہ "تاکہ" کا لفظ یہاں سنانے پر طلاق کو مرتب کرنے کے لئے ہے یعنی اس چیز کے حاصل ہوجانے پر اس چیز کا حصول بتانے کے لئے ہے اور یہی تعلیق کا معنی ہوتا ہے۔ اور درمختار میں ہے کہ تعلیق کا معنی ہی شرط کے لئے کافی ہوتا ہے۔ (ت)

تو ان آٹھ لفظوں کا حاصل صرف دو (۲) لفظ رہے' ایک کنایہ جس سے بلحاظ نیت طلاق بائن پڑے گی دوسرا صریح معلق جس سے بعد تحقق شرط طلاق رجعی ہوگی' صریح کا حکم تو دیانۃً و قضاءً دونوں میں ایک ہی ہے کہ اگر سرمست خاں نے خط مذکور دونوں کو حرف بحرف سنادیا تو طلاق ہوگئی اور اگر ان میں ایک کو سنانے میں بھی کچھ کمی رہی ہے جسے حرف بحرف سنانا نہ کہیں تو نہ ہوئی مگر حکم کنایہ یہاں مختلف ہے دیانۃً حاجت نیت ہے۔ ردالمحتار میں ہے:

لایقع دیانۃ بدون النیۃ ولووجدت دلالۃ الحال فوقوعہ بواحد من النیۃ او دلالۃ الحال انما ھو فی القضاء فقط کما ھو صریح البحر وغیرہ[2]

کنایہ کی صورت میں نیت کے بغیر طلاق نہ ہوگی اور اگر دلالتِ حال بھی پائی جائے تو طلاق کا وقوع نیت یا دلالت حال میں سے ایک کے ساتھ ہوگا یہ صرف قضاءً طلاق ہوتی ہے۔ بحر وغیرہ کی صراحت یہی ہے۔(ت)

---

[1] درمختار باب التعلیق مطبع مجتبائی دہلی ۱/ ۲۳۰

[2] ردالمحتار باب الکنایات داراحیاء التراث العربی بیروت ۲/ ۴۶۳

اور قضاءً بوجہ قرائن سباق وسیاق وقوعِ طلاق کا حکم علی الاطلاق۔

فان اللفظ وان کان مما یصلح ردا کما فی الغرر والبحر والخانیة لکن قد حفته قرائن ترد معنی الرد کقوله لھذا وقوله ایسا نہ ہونا سبب وقوله اس کا خرابانہ ہونا سبب وقوله تاکہ خدائے پاک الخ فان ھذہ التعلیلات والتفریعات لاتلائم قصد الرد کما لایخفی ودلالة القال کدلالة الحال

غرر، بحر اور خانیہ میں جیسا کہ مذکور ہے کہ لفظ اگرچہ جواب بن سکتا ہو مگر وہاں قرائن کا ہجوم اس کے جواب ہونے کو مردود قرار دیتا ہے، جیسا کہ یہاں ایسا نہ ہونا سبب' اس کا خرابانہ ہونا سبب' تاکہ خدائے پاک الخ'' کے الفاظ ہیں' کیونکہ یہ الفاظ تعلیل اور تفریع ہونے کی بناء پر' جواب کے ارادہ سے مناسب نہیں ہیں' جیسا کہ مخفی نہیں ہے' اور دلالتِ قال' دلالتِ حال کی طرح ہے۔(ت)

رد المحتار میں نہر الفائق سے ہے: دلالة الحال تعم دلالة المقال[1] (دلالتِ حال' دلالتِ قال کو بھی شامل ہے۔ت) مگر خط کی بناء پر وقوعِ طلاق کا حکم اسی حالت میں ہو سکتا ہے جب کہ شوہر مقر یا گواہان عادل شرعی دو (۲) مرد یا ایک مرد دو (۲) عورت سے ثابت ہو کہ یہ خط اس کا ہے ورنہ صرف مشابہتِ خط پر حکم نہیں۔ اشباہ میں ہے:

ان کتب علی وجه الرسالة مصدرا معنونا و ثبت ذلك باقراره اوبالبینة فکالخطاب[2]

اگر خط کا عنوان شروع کر کے لکھا اور پھر اس کے اقرار یا گواہوں سے ثابت ہو جائے تو یہ لکھنا زبانی خطاب کی طرح ہے۔(ت)

پس صورت مستفسرہ میں حکم قضایہ ہے کہ اگر اس خط کا طالعور خاں کا ہونا نہ اس کے اقرار سے ثابت نہ گواہانِ عادل سے' جب تو اصلاً حکم طلاق نہیں' اور اگر اقرار یا شہادت سے ثبوت ہے تو عمدہ پر طلاق بائن پڑ گئی' اگر سر مست خاں نے عمدہ و نجم خاں دونوں کو حرف

---

[1] رد المحتار باب الکنایات داراحیاء التراث العربی بیروت ۲/۴۶۳

[2] الاشباہ والنظائر الفن الثالث احکام الکتابة ادارۃ القرآن کراچی ۲/۹۸۔۲۹۷

بحرف سنادیا جب تو دو طلاقیں بائن ہوئیں۔

فان الصریح یلحق البائن والرجعی اذالحقه صارمثله لعدم امکان اثبات الرجعة کما فی البزازیة وغیرها۔

اس لئے کہ صریح طلاق، بائنہ کو لاحق ہو سکتی ہے اور جب بائنہ کے بعد اس کو رجعی لاحق ہو تو وہ رجعی طلاق بھی بائنہ کی طرح ہو جاتی ہے کیونکہ ایسی صورت میں رجوع کا امکان نہیں رہتا، جیسا کہ بزازیہ وغیرہ میں ہے۔ (ت)

ورنہ ایک ضرور ہوئی، بہر حال عمدہ نکاح سے نکل گئی، یہی تفصیل جو حکم قضائی ہے عمدہ کو اسی پر عمل واجب ہے۔ فان المرأة کالقاضی[1] کما فی الفتح وغیرہ (کیونکہ بیوی اس میں قاضی کی طرح ہے، جیسا کہ فتح وغیرہ میں ہے۔ ت)

اور حکم دیانت یہ ہے کہ اگر یہ خط طالع ورخاں کا ہے اور اس نے الفاظِ کنایہ میں کل یا بعض سے نیت ازالۂ نکاح کی تو طلاق بائن ہوئی پھر اس کے ساتھ وہ خط سنانے کی شرط بھی پوری پائی گئی تو دو (۲) طلاقیں بائن ہوئیں بہر حال عمدہ نکاح سے باہر ہوئی اور اگر نیت نہ کی تو سنانے کی شرط پائے جانے کی حالت میں ایک طلاق رجعی پڑی جس میں اسے اختیار رجعت تا ایامِ عدت تھا اور اگر اس شرط میں بھی کمی رہی تو اصلاً طلاق نہ پڑی، یونہی اگر یہ خط اس کا نہیں جب بھی طلاق نہ ہوئی اگرچہ گواہ گواہی دیں یا خود اس نے غلط اقرار کر دیا ہو۔

فان الاقرار الکاذب لااثر له دیانة هذا جملة القول والتفصیل فی فتونا المذکورة۔

اس لئے کہ جھوٹے اقرار کا کوئی اثر دیانتاً نہیں ہے، یہ تمام خلاصۂ کلام ہے اور تفصیل ہمارے فتاوٰی میں مذکور ہے۔ (ت)

اور جب کہ عمدہ وطالع ورخاں میں خلوتِ صحیحہ ہو گئی ہو جیسا کہ بیانِ سوال سے ظاہر ہے کہ وہ چار مہینے شوہر کے یہاں رہی تو بعد طلاق کل مہر واجب الادا ہے، نصف ساقط ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ واللہ تعالٰی اعلم۔

---

[1] البحرالرائق کتاب الطلاق باب الطلاق الصریح ایچ ایم سعید کمپنی کراچی ۳ /۲۵۷

ان فتاویٰ میں امام اہلسنت مولانا احمد رضا خاں قادری رحمہ اللہ تعالیٰ نے صراحت فرمادی کہ :

(۱) چندبار یہ الفاظ بر نیت طلاق کہے 'یعنی ہر بار یہ الفاظ نیت طلاق سے کہے اور تاکید خلاف اصل ہے' اصل استیناف ہے (ردالمحتار ج ۲ ص ۴۶۰) اس کے باوجود اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ نے صرف ایک طلاق بائن کا فتویٰ دیا۔

(۲) ایک شخص نے اپنی بیوی کو چار بار "صفائی دے دیا" کہا اور چاروں دفعہ طلاق کی نیت کی' پھر بھی اعلیٰ حضرت نے صرف ایک طلاق بائن کا حکم لگایا ہے اور دلیل یہی دی کہ بائن' بائن کو لاحق نہیں ہوتی۔

(۳) انہوں نے تصریح فرمادی کہ کنایاتِ طلاق کو خواہ کتنی مرتبہ مکرر کہا جائے اور خواہ سب کے ساتھ طلاق کی نیت کی جائے' تو صرف ایک طلاق بائن واقع ہوگی' اور وجہ یہ بیان فرمائی کہ بائن بائن کو لاحق نہیں ہوتی اور ہمارا موضوع بحث بھی یہی ہے کہ شوہر نے کلمات: "میں نے تمہیں آزاد کیا" کو مکرر کہا اور دوسری بار دوسری طلاق کی نیت کی' تو یہاں بھی صرف ایک طلاق واقع ہوگی۔

(۴) وجہ استدلال یہ ہے کہ طلاق ثانی کو اول کی خبر صرف اُس وقت نہیں بنایا جاسکتا جب وہ کہے: "میں نے دوسری طلاق دی" یا یہ کہے میں نے "بینونت کبریٰ" (یعنی طلاق مغلظہ کی نیت کی) اعلیٰ حضرت نے پہلی طلاق کی خبر بنانے سے صرف ان دو صورتوں کا استثناء فرمایا ہے جب ایک "طلاق بائن" کو شوہر دوبار نیت محض سے نہیں بلکہ لفظاً کہے: "میں نے دوسری طلاق دی" یا میں نے "بینونتِ کبریٰ" کی نیت کی' تو چونکہ ان دو صورتوں میں طلاق (بائن) ثانی کو اول کی خبر بنانا ممکن نہیں' اس لئے دونوں سے "انشاءِ طلاق" کا حکم دیا جائے گا اور یہی دو استثنائی صورتیں ہیں۔ اگر ان کے علاوہ کوئی تیسری استثنائی صورت (Exceptional Case) بھی ہوتی (جیسا کہ حضرت مفتی عبدالعزیز حنفی صاحب نے دعویٰ کیا ہے کہ اگر ایک طلاق بائن دی' اس کے بعد دوسری طلاق بائن دی اور دوسری بائن سے دوسری طلاق کی نیت کی تو یہ مؤثر ہو کر

پہلی بائن سے لاحق ہو جائے گی) کہ دوسری طلاق کی نیت سے "تو بائن ہے" کہے تو یہ پہلی کے ساتھ لاحق ہو جائے گی' تو اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی قدس سرہ العزیز اس کا بھی ذکر فرما دیتے، کیونکہ یہ مقامِ بیان ہے اور مقامِ بیان میں کسی چیز کا ذکر نہ کرنا' اس بات کا بیان ہے کہ وہ مراد نہیں ہے' کما لا یخفیٰ۔

نوٹ : اعلیٰ حضرت کے فتاویٰ میں (استفتاء اور فتویٰ دونوں) ہم نے ایسے متعلقہ پیراگراف خط کشیدہ کر دیئے ہیں، قارئین اور خاص طور پر اہل علم اور اہل فتویٰ سے گذارش ہے وہ دو تین بار ان کا مطالعہ کریں' مسئلہ انشاء اللہ العزیز نکھر کر سامنے آجائے گا۔ دار العلوم امجدیہ ہماری مادرِ علمی ہے' ماضی میں ہمارے عظیم اکابر شیخ الحدیث علامہ عبد المصطفیٰ الازہری' حضرت علامہ مفتی محمد وقار الدین' حضرت علامہ مفتی سید شجاعت علی قادری رحمہم اللہ اجمعین اس سے وابستہ رہے ہیں۔ جن میں سے ہر ایک اپنی ذات میں ایک ادارہ' ایک انجمن اور ایک جامعہ تھے، وہ ہمارے مسلک کی پہچان تھے۔ علامہ مفتی عبد العزیز حنفی صاحب سے بھی ہمارا کوئی ذاتی اختلاف و عناد نہیں ہے' ہم ان سمیت ہر صاحب علم کا احترام کرتے ہیں۔ اہل علم کا حوادث و نوازل میں اختلاف بھی ہو سکتا ہے' لیکن یہ مسئلہ فقہاء احناف کا متفقہ مسلمہ اور معروف مسئلہ ہے۔ ہم نے حق کی طرف رجوع کیلئے پہلے مفتی صاحب محترم سے خود رجوع کیا تھا' پھر حضرت قبلہ مفتی ظفر علی نعمانی صاحب اور علامہ شاہ تراب الحق قادری صاحب کے پاس سارا مواد مع تصدیقات اہل علم و فتویٰ ارسال کیا، اور ان دونوں حضرات سے میں نے بذاتِ خود فون پر بھی گذارش کی کہ مفتی عبد العزیز حنفی صاحب سے اپنے فتویٰ پر نظر ثانی کے لئے کہیں' حضرت قبلہ مفتی ظفر علی نعمانی صاحب نے فرمایا کہ اب یہ لوگ میری بات سنتے اور مانتے نہیں ہیں' اس لئے میں نے احقاقِ حق کیلئے اسے ریکارڈ کا حصہ بنایا ہے اور تفہیم المسائل میں شامل کیا ہے۔

الحمد للہ! ہمارے فتویٰ پر اجلہ علماء کرام کی تصدیقات ثبت ہیں' وللہ الحمد۔

تصدیقات وتائیدات علماء کرام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دارالعلوم امجدیہ کے مفتی صاحب غلطی پر غلطی کرتے چلے جارہے ہیں، علامہ بحر نے ماتن کی عبارت "لاالبائن" کی تشریح میں مسلمہ قیود پر بحث کرتے ہوئے ایک اعتراض کرکے پھر خود ہی اس کا جواب بھی "الا ان یقال" سے دے دیا۔ اسی اعتراض کے مزید دو جواب علامہ شامی نے "منحة الخالق" میں بھی دیئے۔ اعلیٰ حضرت نے بحر کے اعتراض کی تقریر کو اپنے زوردار الفاظ میں بیان کرکے علامہ بحر کے اعتراض کے مبنی کو واضح کیا تاکہ علامہ بحر پر سطحیت کا الزام نہ آئے کہ نیت کے عدم اعتبار پر تصریحات کے باوجود علامہ کا اعتراض چشم پوشی ہے۔

اسی نکتہ کی طرف فلیتامل سے اشارہ فرمایا کہ یہ علامہ بحر کے اعتراض کی تقریر ہے یہ کسی کا قول یا مذہب نہیں، ردالمحتار کے حوالہ کو بہارِ شریعت میں بھی مسلمہ اور واضح قرار دے کر مسئلہ کو بیان کیا اور نیت سے مراد ایسی نیت جس سے خبر ہونا ناممکن ہوجائے اور یہ جب ہی ہوگا جبکہ وہ نیت جدید طلاق پر دال سے موید ہو۔ لہذا مولانا عبدالعزیز حنفی صاحب فارغ البالی سے کتب فقہ کی اس بحث کو دیکھیں۔ امکن یمکن، لایمکن، الفاظ کو نظر انداز نہ کریں۔ انہی الفاظ پر بحث کا مدار ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم

[signature]

مفتی محمد عبدالقیوم ہزاروی

جامعہ نظامیہ رضویہ لاہور

تصویب

صورۃ مسئولہ میں جناب مفتی منیب الرحمٰن صاحب کا جواب حق اور صواب ہے اور دارالعلوم امجدیہ کے مفتی صاحب کا فتویٰ غلط ہے لہذا مفتی منیب الرحمٰن کے فتویٰ پر عمل کیا جائے۔

فقہ کی چھوٹی بڑی سب کتابوں میں تصریح ہے کہ بائن، بائن کو لاحق نہیں ہوتی اور اس کی وجہ صرف ثانی کا اول کے لئے خبر بننے اور حکایت ہونے کا امکان ہے۔ نیت کچھ بھی ہو امجدیہ کے مفتی صاحب کو یہ بات سمجھ نہیں آئی اور نیت کی وجہ سے غلطی ہو گئی اور انہوں نے ان کنایات کے متعلق علامہ شامی کی نامکمل عبارت نقل کردی جن سے طلاق رجعی واقع ہوتی ہے، اور ان کی دیانت پر تعجب ہے کہ پورے جملہ سے خبر میں جملہ شرطیہ کی صرف ایک جز نقل کردی، مبتداء اور خبر کے متعلقات کو ترک کردیا اور ترجمہ بھی ذکر نہیں کیا تاکہ بات کھل نہ جائے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ بائن ثانی سے دوسری طلاق کی نیت سے طلاق ثانی واقع نہیں ہوتی، اس کی پوری بحث میں درمختار کے قول "اذاامکن جعله اخبارا" کے ماتحت علامہ ابن عابدین نے لکھا اور شامی نے البحرالرائق سے نقل کردہ عبارت کارد فرمادیا اگر مناسب ہو تو دیکھ لیں۔ مفتی صاحب کی نقل کردہ عبارت میں تعلق کے ضمیر کا مرجع صرف اعتدی، استبرئی رحمك، انت واحدة اور ان کے ساتھ ملحقات ہیں، جملہ کنایات نہیں، یہاں سے مفتی صاحب کو عدم فہم سے غلطی لگی اور فقہاء کے مسلمہ اجماعی ضابطہ کلیہ البائن لایلحق البائن کو اڑادیا اور یہ نہ سمجھ سکے کہ اگر اس قاعدہ میں نیت کی وجہ سے کوئی استثناء ہوتا تو فقہاء اس پر تحریر فرماتے اور متون میں لکھتے جیسے دوسری استثنائی صورتیں انہوں نے تحریر فرمادیں ہیں۔

الخلاصه۔ الحق مع المنیب المجیب جزاه الله خیرالجزاء۔ واللہ اعلم

محمد رفیق غفرلہ

دارالافتاء جامعہ مدینۃ العلوم گلستان جوہر بلاک ۱۵، کراچی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دار العلوم نعیمیہ کراچی کے مفتی جناب پروفیسر منیب الرحمٰن صاحب کی طرف سے لکھے گئے "رد متابعۃ الجواب" کے بعد مزید لکھنے کی ضرورت نہیں تھی فنی اور فقہی اعتبار سے دار العلوم امجدیہ کے مفتی صاحب کا اصل فتویٰ صحیح نہیں تھا۔ حقیقت حال واضح ہونے کے بعد ہمارا خیال تھا کہ دار العلوم امجدیہ کے مفتی صاحب، دار العلوم نعیمیہ کے مفتی صاحب کا شکریہ ادا کریں گے لیکن اس کے برعکس انہوں نے اس کو اپنی "انا" کا مسئلہ بنالیا اور پہلے فتویٰ کو صحیح ثابت کرنے کیلئے متابعۃ الجواب کے عنوان سے سعی لاحاصل شروع کردی۔ معلوم نہیں امجدیہ کے مفتی صاحب نے دار العلوم نعیمیہ کے مفتی صاحب کے دیگر مؤیدین کو چھوڑ کر صرف میری تائید پر تنقید کیوں فرمائی۔

الحمد للہ نفس الامر میں ہمارا موقف صحیح اور ثابت ہے اس لئے مفتی صاحب کو اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ اور دیگر فقہاء کرام کی کتب سے کوئی ایک فتویٰ بھی ایسا نہیں ملا جس میں تصریح ہو کہ دوسری بائن سے صرف دوسری طلاق کی نیت کرلینے سے دوسری طلاق شمار کی جائے گی البتہ امجدیہ کے مفتی صاحب کو جد الممتار سے اس موضوع پر ایک بحث مل گئی۔ جس کا نعیمیہ کے مفتی صاحب نے جواب تحریر فرمادیا ہے۔ فتاویٰ روایات پر دیئے جاتے ہیں صرف بحث من حیث البحث پر نہیں دیئے جاتے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فقہاء نے یسر اور عدم تضیق کی وجہ سے دوسری بائن سے استیناف کی نیت کو کافی نہیں سمجھا بلکہ استیناف کی نیت کیلئے ایسے لفظ کا ہونا ضروری سمجھا جو لفظ استیناف کی نیت کیلئے معین ہو کما فی البحر جیسے ابنتک باخریٰ میں لفظ اخریٰ ہے کہ استیناف اور انشاء کی نیت کیلئے معین اور ممد ہے لہذا ابنتک سے دوسری طلاق واقع ہوجائے گی معلوم ہوا یہاں متعدد صورتیں ہیں۔

۱- اول: بائن کے دوسرے لفظ سے تاکید کی نیت ہو تو ایک طلاق بائن ہو گی۔

۲- دوم: بائن کے دوسرے لفظ سے صرف طلاق کی نیت ہو۔ استیناف اور انشاء کی نیت نہ ہو تو بھی دونوں لفظوں سے ایک بائن ہو گی۔

۳- سوم: دوسرے لفظ سے استیناف کی نیت ہو لیکن نیت پر کوئی لفظ دلالت کرنے والا

مذکور نہ ہو جیسے زیر بحث مسئلہ میں ہے۔ اس صورت میں فقہاء کرام کے نزدیک ایک طلاق بائن ہو گی۔

۴- چہارم : دوسرے لفظ سے استیناف کی نیت ہو اور اس نیت پر کوئی امر دلالت کرنے والا مذکور ہو۔ دو طلاقیں واقع ہوں گی۔ ابھی تک میری معلومات یہی ہیں لعل اللّٰہ یحدث بعد ذالك امرا۔ میں جناب مفتی منیب الرحمٰن صاحب کے "ردالمتابعۃ الجواب" کی تصدیق کرتا ہوں۔ واللہ تعالیٰ اعلم

محمد رفیق گل عفی عنہ
دار الافتاء جامعہ مدینۃ العلم گلستان جوہر بلاک ۱۵ کراچی
98-11-10

تائید

مولانا مفتی منیب الرحمٰن صاحب کا جواب صحیح ہے اس لئے کہ عالمگیری اور شامی کا حوالہ دیا ہے کہ لایلحق البائن البائن کہ طلاق بائن، بائن کو لاحق (شامل) نہیں ہوتی۔ پہلی ایک طلاق سے ایک طلاق واقع ہوئی جو طلاق بائن ہے اور دوسری تاکید ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ تجدید نکاح نئے مہر کے ساتھ کم از کم دو گواہوں کی موجودگی میں ہو۔ حلالہ کی ضرورت نہیں اور تعداد میں عمر بھر شوہر ایک طلاق کا مالک رہے گا یہ کام عدت میں ہو یا عدت کے بعد ہو۔

مفتیٔ دار العلوم امجدیہ مفتی عبد العزیز حنفی صاحب کو غلط فہمی ہو گئی ہے۔

هذا ماسنح لی واللّٰه تعالیٰ اعلم واحکم واتم برهانهٗ



مفتی اہلسنت مفتی ابو النظر [illegible]
مہتمم شیخ الحدیث دار [illegible]
ملکپور مسعود آباد

11/11/98

الجواب باسمہٖ سبحانہ وتعالیٰ

صورۃ مسئولہ میں دار العلوم نعیمیہ کے مفتی صاحب کا فتویٰ حق اور درست ہے اور دار العلوم امجدیہ کے مفتی صاحب کا فتویٰ (کہ مرد کا یہ کہنا میں نے تمہیں آزاد کیا میں نے تمہیں آزاد کیا ان الفاظ سے دو بائن طلاق واقع ہوئیں) یہ کہنا درست نہیں۔

لان البائن الکنائی لا یلحق البائن۔ اھ

وایضا قال فی البحر...... لیس المبانۃ محلاً للبائن۔ اھ

کیونکہ لفظ آزاد کیا یہ بائن کنائی میں سے ہے جو بائن کو لاحق نہیں ہو سکتا اگرچہ مرد بہ نیت طلاق کیوں نہ کہے۔ کیونکہ یہاں ثانی کا اول کیلئے خبر بننے اور حکایت ہونے کا امکان ہے۔

قال فی الرد...... فعلم ان قولھم اذا امکن الخ احترا زعما اذا لم یمکن جعلہ خبرا کما فی أ بنتك بأخری لاعما اذا نوی بہ طلاقا آخر فتدبر۔ وایضافیہ۔ فقولھم البائن لایلحق البائن لاشك ان المراد بہ البائن المنوی اذ غیرالمنوی لایقع بہ شئی اصلاً۔ اھ (ردالمحتار ۴/۵۴۵)

اور البحر الرائق میں ہے:

الا ان یقال ان الوقوع انما ھو بلفظ صالح لہ بخلاف مجرد النیۃ الخ (البحر الرائق ۳/۵۴۵)

مذکورہ بالا دلائل کی روشنی میں صورت مسئولہ میں دار العلوم نعیمیہ کے مفتی صاحب کا جواب (کہ دو طلاقیں ہوں گی یعنی ایک طلاق بائن واقع ہو گی اور ایک پہلی طلاق رجعی کے ساتھ مل کر مجموعی دو طلاقیں شمار ہوں گی اور اب فریقین عدت کے دوران یا عدت گزرنے کے بعد باہمی رضامندی سے دوبارہ نکاح کر سکتے ہیں) حق اور صحیح ہے اور دار العلوم امجدیہ کے مفتی صاحب کا جواب (کہ صورت مسئولہ میں تین طلاقیں ہو گئیں) یہ درست نہیں۔

واللہ تعالیٰ اعلم ورسولہ بالصواب
کتبہ احقر محمد [illegible] نعیمی غفر لہ
۹۸/۱۱/۱۶ دار الافتاء جامعہ مجددیہ نعیمیہ ملیر کراچی۔



دو طلاق کے بعد رجوع

سوال: اگر کسی شخص نے اپنی بیوی کو دو مرتبہ کہہ دیا کہ 'تجھے طلاق ہے تجھے طلاق ہے، تو کیا اس کے بعد رجوع کی گنجائش باقی رہتی ہے؟ (منور احمد، ملیر۔ کراچی)

جواب: اگر کسی شخص نے اپنی بیوی سے دو مرتبہ کہا کہ تجھے طلاق ہے یا میں تجھے طلاق دیتا ہوں یا میں نے تجھے طلاق دی تو دو طلاق رجعی واقع ہو جائیں گی۔ وہ چاہے تو عدت کے اندر یک طرفہ طور پر عقد ثانی کے بغیر رجوع کر سکتا ہے، خواہ محض زبانی کہہ دے کہ میں نے رجوع کیا یا ازدواجی تعلق قائم کر لے تو رجوع صحیح ہو گا لیکن اب اس کے پاس صرف ایک طلاق کا حق باقی رہے گا اور اگر شوہر نے رجوع نہ کیا اور عدت گزر گئی تو وہ عورت اب آزاد ہے اپنی آزادانہ مرضی سے پہلے شوہر کے ساتھ عقد ثانی بھی کر سکتی ہے اور کسی اور شخص کے ساتھ بھی نکاح کر سکتی ہے۔ اگر پہلے شوہر کے ساتھ عقد ثانی کیا تو آئندہ اس کے پاس صرف ایک طلاق کا حق باقی رہے گا اور ایک طلاق خدانخواستہ دے دی تو وہ عورت اس پر حرام ہو جائے گی۔

بہن سے قطع تعلق کی قسم کھانا

سوال: "الف" اور "ب" دونوں حقیقی بہن بھائی ہیں۔ "الف" کسی بات پر اپنی بہن "ب" سے ناراض ہو جاتا ہے اور قسم کھا کر غصہ میں اپنی بہن "ب" سے کہتا ہے کہ آج کے بعد میں تمہارے گھر کبھی نہیں جاؤں گا۔ (چاہے تم فوت ہو یا اور کوئی) اگر میری بیوی بھی تمہارے گھر گئی تو وہ مجھ پر طلاق ہو گی۔ اب "الف" اور "ب" (اس کی بہن) کے درمیان راضی نامہ ہو چکا ہے۔ "الف" کی بہن اب "الف" اور اس کی بیوی کی دعوت کرنا چاہتی ہے۔ اگر "ا" اپنی خوشی سے اپنی بیوی کو اپنی بہن کے گھر

جواب: آپ نے جو صورت مسئلہ بیان کی ہے، از روئے شریعت اس کا جواب درج ذیل ہے:

"الف" کا یہ قسم کھانا کہ "وہ اپنی بہن "ب" کے گھر کبھی نہیں جائے گا"، شرعاً ناپسندیدہ امر ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ "کسی مومن کیلئے (خواہ مرد ہو یا عورت) یہ جائز نہیں کہ اپنے بھائی یا بہن کے ساتھ تین دن سے زیادہ قطع تعلق کرے۔" یہ مقاطعہ اگر کسی قریبی عزیز یا عزیزہ کے ساتھ کیا جائے تو یہ بڑا گناہ ہے کیونکہ اس سے قطع رحمی (رشتہ قرابت کو توڑنا) بھی لازم آتی ہے، تو جتنا عرصہ وہ اپنی اس قسم پر قائم رہ کر بہن سے قطع تعلق کئے رہے، اس کیلئے صدق دل سے اللہ تعالیٰ سے توبہ کرے، اللہ تعالیٰ غفور و رحیم ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ "تم میں سے جو شخص کسی بات (کے کرنے یا نہ کرنے) کی قسم کھالے اور پھر اسے معلوم ہو کہ شرعاً ایسی قسم پر قائم رہنے کے بجائے اس کو توڑ دینا بہتر ہے تو اسے چاہئے کہ ایسی قسم کو توڑ دے اور اس کا کفارہ ادا کرے۔" تاہم خلاف شرع ہونے کے باوجود شرعاً ایسی قسم منعقد ہو جاتی ہے، لیکن اس پر قائم رہنا اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہے کیونکہ یہ قسم اصولی طور پر خلاف شرع ہے۔ لہٰذا "الف" کو چاہئے کہ فوراً اپنی بہن "ب" سے میل جول کا سلسلہ قائم کریں، اپنی قسم کو توڑ دیں اور اس کا کفارہ ادا کریں، کفارہ قسم قرآن مجید میں یہ بتایا گیا ہے "دس مساکین کو دو وقت کا کھانا کھلانا یا انہیں لباس فراہم کرنا، اور اگر اس کی استطاعت نہ ہو تو تین دن کے روزے رکھنا۔"

"الف" نے اپنی بیوی کے بارے میں جو یہ کہا کہ "اگر میری بیوی تمہارے گھر گئی تو وہ مجھ پر طلاق ہوگی" بیوی بھی "قطع رحمی" کا سلسلہ ختم کر کے ان کے گھر چلی جائے اور اس طرح ایک طلاقِ رجعی واقع ہو جائے گی اور "الف" عدت کے اندر یک طرفہ طور پر رجوع کر سکتا ہے، قولاً (یعنی یہ کہے کہ میں نے طلاق سے رجوع کیا) یا فعلاً (کہ ازدواجی تعلقات قائم کرے) لیکن آئندہ اسے لفظ طلاق استعمال کرتے ہوئے یا طلاق کی دھمکی دیتے ہوئے بہت محتاط رہنا ہوگا، کیونکہ ایک طلاق کا حق وہ استعمال کر چکا ہے اور اب اس کے پاس صرف دو طلاق کا اختیار باقی ہے اور اگر خدانخواستہ آئندہ جب کبھی بھی وہ طلاق دے گا، یہ پہلی والی دی ہوئی طلاق اس کے ساتھ جمع ہو کر موثر ہو جائے گی۔ لہٰذا حد درجہ احتیاط لازم ہے۔

مشروط طلاق دینا

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نے اپنی بیوی سے کہا کہ "اگر تم نے پان کھایا تو میری طرف سے طلاق سمجھو، اس نے یہ جملہ کچھ دنوں کے وقفہ سے تین سے زائد بار کہا، لیکن جس کام کے ساتھ مشروط کیا تھا وہ ایک ہی تھا، کچھ دنوں کے بعد اس کی بیوی نے پان کھالیا؟ اس سے بیوی پر طلاق واقع ہو گی یا نہیں، ازروئے شرع جواب دیجئے۔ نوازش ہوگی۔

(عبداللہ، اورنگی ٹاؤن۔ کراچی)

نوٹ:۔ دار العلوم کراچی کو مندرجہ بالا استفتاء ارسال کیا گیا، وہاں سے مندرجہ ذیل جواب موصول ہوا، مستفتی وہ فتویٰ لے کر ہمارے پاس آئے ہم نے اس کا بغور مطالعہ کیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ مفتی صاحب کو تسامح ہو گیا ہے اور عدم توجہ یا قلت غور و فکر کی وجہ سے وہ غلط نتیجے پر پہنچے، اس لئے ہم نے مناسب سمجھا کہ مفتی محمد یعقوب صاحب مفتیٔ دار العلوم کراچی سے وضاحت طلب کی جائے۔ سطور ذیل میں مفتیٔ دار العلوم کراچی کا جواب اور اس کے مفتی صاحب مذکور کے نام ہمارا مکتوب ملاحظہ فرمایئے: (منیب الرحمٰن)

الجواب حامداً و مصلیاً

صورت مسئولہ میں پان کھانے کی وجہ سے شخص مذکور کی بیوی پر تینوں طلاق واقع ہو گئیں اور نکاح ختم ہو کر حرمت مغلظہ ثابت ہو گئی ہے اب رجوع نہیں ہو سکتا اور حلالہ شرعیہ کے بغیر آپس میں دوبارہ نکاح بھی نہیں ہو سکتا۔ (ماخذہ امداد الفتاویٰ: ۲/۴۴۰)

فی الدر (ص ۷۶۳ جلد ۳)

فی ایمان الفتح مالفظه: وقد عرف فی الطلاق انه لوقال: ان دخلت الدار فانت طالق ان دخلت الدار فانت طالق ان دخلت الدار فانت طالق وقع الثلاث (قوله وقع الثلاث) یعنی بدخول واحد کما تدل علیه عبارة ایمان الفتح اه وکذا ایضا فی الهندیة (۱/۴۲۹) واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

محمد یعقوب عفا اللہ عنہ

دار الافتاء دار العلوم کراچی ۱۴

محترم مولانا مفتی عبدالرؤف سکھروی صاحب
رئیس شعبہ افتاء، جامعہ دارالعلوم، کراچی
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

آپ کے دارالافتاء سے ۷ ذیقعدہ ۱۴۲۰ھ کو (حوالہ نمبر ۴۰۰/۷/۸) ایک فتویٰ جاری ہوا ہے جس پر آپ کے دستخط برائے تائید و توثیق ثبت ہیں، اس فتوے کی نقل منسلک ہے۔ مستفتی نے دریافت یہ کیا تھا کہ ایک شخص نے تین سے زائد بار اپنی بیوی سے کہا کہ "اگر تم نے پان کھایا تو میری طرف سے طلاق سمجھو۔" آپ کی طرف سے جواب دیا گیا کہ "تین طلاقیں واقع ہو گئیں۔" آپ حضرات نے "میری طرف سے طلاق سمجھو" کو "انت طالق" کے معنی میں لیا ہے، جبکہ کتب فتاویٰ میں اس کے برعکس فقہی آراء موجود ہیں، ہم ان میں سے چند کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتے ہیں:

(۱) امام احمد رضا بریلوی قدس سرہ العزیز سے یک طویل استفتاء میں دریافت کیا گیا کہ شوہر نے لکھا "اس خط کو بطور طلاق نامہ کے تصور فرمائیں" انہوں نے جواب دیا:

"صالح ایقاع طلاق نہیں کہ بطور طلاق نامہ تصور فرمائیں" کے صاف یہ معنی کہ حقیقت میں "طلاق نامہ" نہیں، فتاویٰ امام قاضی خان میں ہے:

اِمْرَأَۃٌ قَالَتْ لِزَوْجِهَا: مَرا طلاق دِه، فَقَالَ الزَّوْجُ "داده انگار" او "کرده انگار"، لَایَقَعُ وَاِنْ نَوٰی کَاَنَّہٗ قَالَ لَهَا بِالْعَرَبِیَّةِ اِحْسِبِیْ اَنَّكِ طَالِقٌ، وَاِنْ قَالَ ذٰلِكَ وَاِنْ نَوٰی (فتاویٰ قاضی خان، کتاب الطلاق، جلد ۱ ص ۳۱۰ مطبوعہ نولکشور لکھنؤ) فتاویٰ رضویہ جلد ۱۲ ص ۶۳۱ مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن لاہور۔ اسی مقام پر ہے:

لَوْقِیْلَ لِرَجُلٍ اَطَلَّقْتَ اِمْرَأَتَكَ فَقَالَ: "عُدِّهَا مُطَلَّقَةً" اَوْ "اِحْسِبْهَا مُطَلَّقَةً" لَاتُطَلَّقُ اِمْرَأَتُہٗ

(فتاویٰ قاضی خان، کتاب الطلاق ج ۱ ص ۲۱۳، مطبوعہ نولکشور، لکھنؤ)

(۲) فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

"داده انگار" او "کرده انگار" لَایَقَعُ وَاِنْ نَوٰی وَلَوْ قَالَ لَهَا بَعْدَ

مَاطَلَبَتِ الطَّلَاقَ (ج ۱، ص ۳۸۰ مطبوعہ دار الاشاعت العربیہ قندھار)

(۳) امداد الفتاویٰ، جلد ۲ ص ۴۴۹:

سوال کی متعلقہ عبارت میں ہے: "آخر لوگوں نے کہا: تم اس قدر مارتے ہو، اگر وہ موافق نہیں ہے تو اس کو طلاق دے، تو اس نے کہا: "تم لوگ ایسا ہی سمجھو" جواب میں درج ہے: فی العالمگیریۃ: اِمْرَأَۃٌ قَالَتْ لِزَوْجِھَا: مَرا طلاق دہ، فَقَالَ الزَّوْجُ: "دادہ گیر و کردہ گیر" اَوْ قَالَ: "دادہ باد" و "کردہ باد"، اِنْ نَوٰی یَقَعُ وَیَکُوْنُ رَجْعِیاً وَاِنْ لَّمْ یَنْوِلاَ یَقَعُ، وَفِیْھَا: "دادہ انگار" او "کردہ انگار"، لاَیَقَعُ وَ اِنْ نَوٰی، صفحہ ۲۷ جلد ۲۔ اور یہ لفظ کہ "تم لوگ ایسے ہی سمجھو" ترجمہ "دادہ انگار" کا معلوم ہوتا ہے، اس لئے اس سے طلاق واقع نہیں ہوئی۔

آپ حضرات نے امداد الفتاویٰ جلد ۲ ص ۴۴۰ کے جس حوالے سے اپنے فتویٰ کو مؤیّد کیا ہے، وہاں تعلیق و تکرار کی حد تک تو بات درست ہو سکتی ہے، باقی صورت مسئولہ میں کوئی مماثلت نہیں ہے، لہٰذا بادی النظر میں یہ قیاس مع الفارق ہے۔ اسی طرح آپ نے الدُّرالمختار اور عالمگیری کے جو حوالہ جات درج فرمائے ہیں، وہ صورت مسئولہ پر منطبق نہیں ہوتے، کیونکہ صورت مسئولہ میں "میری طرف سے طلاق۔ سمجھو" کے الفاظ ہیں، بالصراحت "اَنْتِ طَالِقٌ" "یا" "تمہیں طلاق" کے الفاظ نہیں ہیں۔

لہٰذا گزارش ہے کہ آپ صورت مسئولہ پر دوبارہ غور فرمائیں کہ آپ کو فتاویٰ قاضی خان، فتاویٰ عالمگیری، فتاویٰ رضویہ اور امداد الفتاویٰ کی محولہ بالا عبارات کی روشنی میں کچھ گنجائش نظر آتی ہے یا نہیں، اگر جواب اثبات میں ہے تو رجوع فرمائیں اور اگر جواب نفی میں ہے تو وضاحت فرمائیں کہ ان عبارات و فتاویٰ کا اطلاق صورت مسئولہ پر کیوں نہیں ہوتا؟

مفتی منیب الرحمٰن

مہتمم دار العلوم نعیمیہ

بلاک ۱۵، فیڈرل بی ایریا۔ کراچی

نوٹ :۔ چند ماہ کے وقفے اور غور وفکر کے بعد دار العلوم کراچی کے مفتی محمد یعقوب صاحب نے ہمیں مندرجہ ذیل جواب ارسال فرمایا اور سابقہ فتوے سے رجوع فرمالیا، بلاشبہ یہ ایک معتدل، متوازن، معقول اور قابل تقلید روش ہے۔ (منیب الرحمٰن)

محترم جناب مفتی منیب الرحمٰن صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

آپ نے احقر کے فتویٰ ۴۴۰ / ۷ / ۸ پر جو تبصرہ فرمایا ہے اس پر غور کیا گیا۔ احقر نے "طلاق سمجھو" کے جملہ کو "طلاق ہی ہے" یا "طلاق دی" کے ہم معنی سمجھ کر اپنے فتویٰ میں طلاق واقع ہونے کا حکم لکھا تھا، اس وقت خانیہ کا جزئیہ اور آپ کے ذکر کردہ جزئیات کی طرف ذہن نہیں گیا آپ کے توجہ دلانے سے مذکورہ جزئیات پر غور کیا اور دوسری کتب فقہ کی طرف مزید مراجعت کی، وہاں بھی خانیہ کے حوالہ سے یہی جزئیات ملے۔ غور وفکر کے بعد آپ کا تبصرہ درست معلوم ہوا، اور ان جزئیات کی روشنی میں "طلاق سمجھو" سے طلاق واقع ہونے کا حکم لگانا واقعۃً درست نہیں، لہذا احقر اپنے سابقہ فتویٰ ۴۴۰ / ۷ / ۸ سے رجوع کرتا ہے، اور اب ہمارا فتویٰ یہ ہے کہ صورت مسئولہ میں پان کھانے کی وجہ سے شخص مذکور کی بیوی پر کوئی طلاق واقع نہیں ہوئی۔ آپ کے توجہ دلانے کا بہت بہت شکریہ۔

جَزَاكُمُ اللّٰهُ تَعَالیٰ اَحْسَنَ الْجَزَاءِ۔ والسلام

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

محمد یعقوب عفا اللہ عنہ

دار الافتاء دار العلوم۔ کراچی

دو طلاق کے بعد نکاح اور پھر تیسری طلاق

سوال: ایک شخص نے اپنی بیوی کو دو طلاقیں دیں، پھر نکاح ثانی کر لیا اور اس کے بعد پھر ایک طلاق دی، کیا اب رجوع کر سکتا ہے؟ (بنت عبد اللہ۔ کراچی)

جواب: اگر کوئی شخص بد قسمتی سے اپنی بیوی کو دو طلاقیں دے دے تو وہ عدت کے اندر

عقد ثانی کے بغیر بھی یک طرفہ طور پر رجوع کر سکتا ہے، خواہ عملاً رجوع کرے یعنی بیوی سے ازدواجی قربت قائم کرے یا محض زبانی کہہ دے کہ میں نے رجوع کیا، تو یہ رجوع صحیح ہوگا اور وہ دوبارہ حسب سابق میاں بیوی ہوں گے، اور اب شوہر کے پاس صرف ایک طلاق کا حق باقی رہ جاتا ہے، اگر اس نے خدانخواستہ کسی بھی وقت ایک طلاق اور دے دی تو یہ طلاق مغلظہ ہو جائے گی اور عورت اس پر حرام ہو جائے گی، لیکن اگر شوہر نے دو طلاقیں دیں اور شوہر نے عدت کے اندر رجوع نہ کیا تو عدت گزرتے ہی وہ دو طلاقیں بائن ہو جائیں گی، اب عورت نکاح کیلئے آزاد ہے، اپنی آزادانہ مرضی سے جس شخص کے ساتھ چاہے نکاح کر سکتی ہے سابقہ شوہر کے ساتھ بھی باہمی رضامندی کے ساتھ نکاح کر سکتی ہے، اگر خدانخواستہ اس نے ایک طلاق دے دی تو پہلی دو طلاقوں کے ساتھ مل کر تین طلاقیں ہو جائیں گی اور بیوی اس پر مکمل طور پر حرام ہو جائے گی یعنی طلاق مغلظہ ہو جائے گی۔

دورانِ عدت گھر سے باہر نکلنا

سوال: کیا عدت گزارنے والی عورت کو ایّام عدت میں گھر سے باہر نکلنے کی اجازت ہے؟
(کھتری عصمت علی پٹیل، کراچی)

جواب: عدت کی دو قسمیں ہیں:

۱- عدتِ طلاق۔ یعنی یہ کہ شوہر نے کسی ناگزیر سبب کی بناء پر طلاق دے دی ہو تو ازروئے شریعت عورت پر عدت گزارنا لازم ہے۔

۲- عدتِ وفات۔ یعنی یہ کہ شوہر کا انتقال ہو جائے تو بھی ازروئے شریعت عورت پر عدت گزارنا لازم ہے۔

ایّام عدت میں عورت کو گھر سے باہر نہیں نکلنا چاہئے۔ سورۃ الطلاق آیت نمبر ۱ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

لَاتُخرِجُوهُنَّ مِنْ بُيُوتِهِنَّ وَلَا يَخرُجْنَ "ایّام عدت میں اپنی مطلقہ عورتوں کو ان کے گھروں سے نہ نکالو اور نہ ہی وہ خود نکلیں۔"

اس آیت میں "بیوت" (گھروں) کی نسبت ان طلاق یافتہ عورتوں کی طرف کی گئی ہے، جو عدت گزار رہی ہیں۔ یہ اس امر کی جانب نفیس اشارہ ہے کہ ایّام عدت میں ان کا نان نفقہ اور سُکنیٰ (رہائش، جائے سکونت) شوہر کے ذمے ہے اور یہ ان مطلقہ عورتوں کا شرعی حق ہے۔

تاہم اگر کسی ضرورت کے تحت انہیں دن کے وقت گھر سے نکلنا پڑے تو شام سے پہلے لازماً واپس آجانا چاہئے۔ "عدتِ طلاق" کی صورت میں تو شریعت نے مطلقہ عورت کی جملہ ضروریات کا کفیل اس کے طلاق دینے والے شوہر کو قرار دیا ہے۔ اس لئے اسے کسی ناگزیر ضرورت کے سوا گھر سے نکلنے کی حاجت ہی نہیں رہتی۔ البتہ شوہر کی وفات کی صورت میں اگر کسی معاشی مجبوری کے تحت دن کو گھر سے نکلنے پر مجبور ہو یعنی وہ خود بھی مالدار اور خود کفیل نہ ہو اور اس کے متعلقین یا بالغ اولاد بھی اس کی کفالت کا بوجھ اٹھانے کیلئے نہ ہوں یا اس کے اہل نہ ہوں یا اس پر آمادہ نہ ہوں تو مجبوراً دن کے وقت گھر سے جائے اور شام سے پہلے گھر واپس آجائے۔

بد زبان بیوی

سوال: میرے دوست آٹھ بچوں کے باپ ہیں۔ دو سال کا عرصہ ہو گیا ہے وہ جب بھی اپنی بیوی سے رجوع کرتے ہیں، ان کی بیوی بد زبانی کرتی ہیں۔ میرے دوست کا اپنی بیوی کے ساتھ رہنا سنت کی رو سے جائز ہے یا نہیں؟ کیا انہیں طلاق دے دینی چاہئے؟ (مرتضٰی خان۔ کراچی)

جواب: ایسی بیوی جو بد خلق، تند مزاج اور بد خُو ہو، اسے قرآن کی اصطلاح میں ناشزہ کہا جاتا ہے، ایسی عورت کیلئے قرآن مجید میں سورۃ النساء آیت نمبر ۳۴ میں تین مراحل کا اصلاحی نسخہ تجویز کیا گیا ہے۔ پہلے مرحلے میں اسے نرمی سے سمجھانے کی کوشش کی جائے۔ یہ اصلاحی تدبیر کارگر نہ ہو تو اس کی خواب گاہ الگ کر دی

جائے اور اس کا بھی اس پر کوئی اثر مرتب نہ ہو تو اسے معمولی تادیبی سزادی جائے۔ اگر وہ ان میں سے کسی بھی مرحلے میں اصلاح قبول کر لے اور اپنی ضد، ہٹ دھرمی اور گستاخانہ رویے سے باز آجائے تو بغیر کسی انتقامی کارروائی کے کھلے دل سے اسے اپنالو، اور قرآن فرماتا ہے کہ اس سے کوئی زیادتی نہ کرو لیکن اگر آپ کے بیان کردہ حقائق درست ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ کے دوست کی اہلیہ ہر گز مائل بہ اصلاح نہیں، ایسی صورت میں وہ دونوں احسن طریقے سے اپنی راہیں جدا کر سکتے ہیں۔ اسلام نے طلاق یا خلع کا انتہائی ناخوشگوار، تلخ اور تکلیف دہ راستہ انہی ناگواریوں سے بچ نکلنے کیلئے رکھا ہے۔

نکمے، مفت خور شوہر سے نجات

سوال: ایک عورت نکمے، ہڈ حرام اور مفت خورے شوہر سے نجات حاصل کرنا چاہتی ہے، جو کچھ نہیں کرتا اور سسرال میں بیٹھ کر بیوی کی تنخواہ پر گزارہ کرتا ہے، عورت حق مہر سے بھی دستبردار ہونے کیلئے تیار ہے، فسخ نکاح کا دعویٰ دائر کیا ہے، مگر شوہر عدالت میں حاضر ہی نہیں ہوتا، عورت کی گلو خلاصی کیسے ممکن ہے؟

(چشتی دلبر چوہان، گلشن حدید۔ کراچی)

جواب: عورت کو چاہیے کہ عدالت میں فسخ نکاح کیلئے دعویٰ دائر کرے اور اس کی وجوہ تحریر کرے کہ شوہر رہائش اور مصارف زندگی (نان نفقہ) نہیں دے رہا، عدالت پر لازم ہے کہ پولیس کے ذریعے (یعنی ناقابل ضمانت وارنٹ گرفتاری جاری کر کے) شوہر کو اصالتاً یا وکالتاً عدالت میں طلب کرے اور اسے جواب دعویٰ داخل کرنے کا موقع دے، اگر عدالت حقائق، واقعات اور شواہد کو دیکھ کر مطمئن ہو جائے کہ شوہر بیوی کے حقوق پورے نہیں کر رہا اور نہ ہی اس پر آمادہ ہے تو فسخ نکاح کا حکم جاری کر سکتی ہے۔

ماں کے نام سے نسبت

سوال: کیا یہ بات درست ہے کہ قیامت کے روز لوگوں کو ماں کے نام سے پکارا جائے گا؟
(عبدالماجد، گارڈن ویسٹ۔ کراچی)

جواب: عوام میں یہ بات مشہور ہے کہ "قیامت کے روز لوگوں کو ماں کے نام سے پکارا جائے گا۔" یہ بات شرعاً درست نہیں ہے، کیونکہ حدیث پاک ہے: حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "قیامت کے دن تمہیں، تمہارے باپوں کے نام سے پکارا جائے گا، تو اپنے نام اچھے رکھا کرو۔" (مشکوٰۃ بحوالہ مسند احمد، ابوداؤد)

صحیح بخاری میں بھی اس عنوان سے ایک باب قائم کیا ہے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے "اشعۃ اللمعات" شرح مشکوٰۃ میں ماں کے نام سے پکارے جانے کی بعض روایات کا ذکر کر کے ان کی حکمت اور تاویل بیان کی ہے، لیکن لکھا ہے "اگر روایت ثابت ہو تو" اس طرح کی ضعیف روایت طبرانی میں ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ قیامت کے دن ماں کے نام سے پکارا جانا روایت صحیحہ سے ثابت نہیں ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ماں کے نام سے پکارا جانا، ایک استثنائی صورت (Exceptional Case) ہے، اور یہ ان کی شانِ اعجاز ہے۔

لے پالک بچہ

سوال: متبنیٰ (Adopted Child) یا لے پالک کا شریعت میں کیا حکم ہے؟ کیا گود لئے ہوئے بچے کی ولدیت میں حقیقی باپ کے بجائے مربی باپ کا نام لکھنا اور بولنا درست ہے؟ کیا نکاح کے وقت ایسے لڑکے یا لڑکی کے حقیقی باپ کا نام لیا جائے یا اس کا جس نے اسے گود لیا اور پالا ہے؟ (عبدالجواد، لسبیلہ۔ کراچی)

جواب: سورۃ الاحزاب آیت نمبر ۴ میں ہے: "اور اس (اللہ تعالیٰ) نے تمہارے منہ بولے بیٹوں کو تمہارے (حقیقی) بیٹے نہیں قرار دیا، یہ تمہاری خود ساختہ باتیں ہیں، اللہ تعالیٰ حق (بات) ارشاد فرماتا ہے اور وہ راہ راست کی جانب رہنمائی فرماتا ہے۔"
اسی سورۃ مبارکہ کی آیت نمبر ۵ میں ہے: "انہیں ان کے (حقیقی) باپوں کی نسبت

سے پکارو، اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہی بات مبنی بر انصاف ہے۔" حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ ہم نے حضرت محمد ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے اپنے کانوں سے سنا اور ذہن میں محفوظ رکھا کہ "جس شخص نے جان بوجھ کر اپنی نسبت "ابنیت" و "ولدیت" اپنے حقیقی باپ کے علاوہ کسی اور کی طرف کی تو اس پر جنت حرام ہے۔"

ان آیات واحادیث کی روشنی میں اپنی تسکینِ نفس یا انسانی ہمدردی کے جذبے کے تحت کسی بچے کی پرورش و نگہداشت اور تعلیم و تربیت بلاشبہ نہایت مستحسن اور اجر کی بات ہے، لیکن بچے کے نسب کو بدلنے کی شریعت میں کوئی گنجائش نہیں ہے بلکہ اس پر سخت وعید آئی ہے۔ اسی طرح یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ مُتبنّٰی (منہ بولا بیٹا یا بیٹی) اپنے مُربّی اور گود لینے والے شخص کے شرعاً اور قانوناً وارث نہیں بن سکتے۔ البتہ اپنی زندگی میں کوئی شخص انہیں کچھ ہبہ (Gift) کرنا چاہے تو کر سکتا ہے۔

لے پالک کا نسب

سوال: اگر کوئی شخص کسی اور شخص کے بچے کو گود لے اور اس کی نسب اپنی طرف منسوب کرے اور بعد میں اسکول، شناختی کارڈ کے ب فارم، پاسپورٹ وغیرہ میں اس کی حقیقی ولدیت کی جگہ اپنا نام لکھوائے تو کیا یہ درست ہے اور کیا بعد میں وہ بچہ اس کی وراثت کا حقدار ہو سکتا ہے؟ (سید محبوب عالم، نارتھ ناظم آباد۔ کراچی)

جواب: کسی یتیم یا نادار ماں باپ کی اولاد یا کسی قریبی عزیز کے بچے یا بچی کو حصول اجر و ثواب کیلئے یا صلہ رحمی کے طور پر گود لینا، پالنا، پرورش، تعلیم و تربیت کا اہتمام کرنا ایک عمل خیر ہے اور ایسا کرنے والا اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اجر و ثواب کا حقدار ہوگا، اپنی کفالت میں پرورش پانے والے بچے یا بچی کو محض پیار اور شفقت و محبت کے اظہار کیلئے بیٹا یا بیٹی کہہ کر پکارنے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔ لیکن کسی لے پالک بچے، متبنیٰ یا منہ بولے بیٹے یا بیٹی کو حقیقی بیٹا یا بیٹی سمجھنا اس کا درجہ دینا اس کی ولدیت کو تبدیل کرنا۔ اپنے آپ کو اس کا والد قرار دینا یہ سب امور شرعاً ناجائز اور

حرام ہیں۔ سورۃ الاحزاب آیت نمبر ۴ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے :

وَمَا جَعَلَ اَدْعِيَآءَكُمْ اَبْنَآءَكُمْ ۚ ذٰلِكُمْ قَوْلُكُمْ بِاَفْوَاهِكُمْ ۚ وَاللّٰهُ يَقُوْلُ الْحَقَّ وَهُوَ يَهْدِي السَّبِيْلَ ○

"اور اس (اللہ تعالیٰ) نے تمہارے منہ بولے بیٹوں کو تمہارا حقیقی بیٹا نہیں بنایا۔ یہ سب تمہاری اپنی خود ساختہ باتیں ہیں اور اللہ تعالیٰ حق (بات) ارشاد فرماتا ہے اور وہ راہ راست کی جانب رہنمائی فرماتا ہے۔"

اسی سورہ مبارکہ آیت نمبر ۵ میں ہے :

اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآئِهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ

"انہیں (لے پالکوں کو) ان کے (حقیقی) باپوں کے نام سے پکارو۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہی بات مبنی بر انصاف ہے۔"

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ بیان کرتے ہیں۔ میرے دونوں کانوں نے سنا اور میرے دل نے اس بات کو محفوظ کر لیا کہ حضرت محمد ﷺ ارشاد فرما رہے تھے "جو اپنی نسبت ابوت اپنے (حقیقی) باپ کے علاوہ کسی اور کی طرف منسوب کرے۔ حالانکہ وہ جانتا ہے کہ وہ شخص اس کا (حقیقی) باپ نہیں ہے تو اس پر جنت حرام ہے۔" (صحیح البخاری رقم الحدیث : ۶۷۶۶ صحیح مسلم رقم الحدیث : ۶۳ سنن ابی داؤد : ۵۳) حضرت ابوذر سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا۔ "جس شخص نے جان بوجھ کر اپنا نسب اپنے (حقیقی) باپ کے علاوہ کسی اور شخص کی طرف منسوب کیا تو اس نے کفر کیا۔" (تفسیر قرطبی جلد ۱۶ صفحہ ۱۲۱) ان آیات و احادیث مبارکہ کی روشنی میں، کسی لے پالک بچے یا بچی کا نسب اپنی طرف منسوب کرنا، تعلیمی اسناد اور شناختی کارڈ کے فارم میں باپ کی حیثیت سے اپنا نام درج کرانا شرعاً ناجائز امر ہے۔ اور اس پر حدیث مبارکہ میں بڑی سخت وعید آئی ہے۔ اگر کسی نے یہ کام نادانستہ اور شرعی مسئلے سے لاعلمی کی

بناء پر کیا ہے تو اللہ تعالیٰ سے معافی مانگیں اور اس کا ازالہ کریں تاکہ تمام متعلقہ لوگوں کو اس کا صحیح نسب معلوم ہو جائے جیسا کہ سطور بالا میں واضح ہو چکا ہے کہ منہ بولی اولاد حقیقی اولاد کے حکم میں نہیں ہوتی۔ اس لئے ان کے وارث بننے یا وراثت کا مطالبہ کرنے کا سوال شرعاً خارج از امکان ہے بلکہ ایسا مطالبہ ہی شرعاً گناہ ہے۔ شرعاً صرف حقیقی اولاد ہی وارث قرار پاتی ہے، اگر کوئی شخص کسی گمنام بچے کو بھی گود لے جس کے والدین کا نہ کوئی اتا پتا ہے اور نہ کوئی کسی کے علم میں ہے۔ تب بھی اسے اپنی حقیقی اولاد قرار نہ دے بلکہ اسے اپنا دینی بھائی یا بہن قرار دے یا عبد اللہ (اللہ کا بندہ) کہہ دے۔

ترکے کی تقسیم

سوال: ایک شخص کا انتقال ہوا ہے اس کے پسماندگان میں اس کی والدہ دو بیٹے اور چار بیٹیاں ہیں ترکہ کس طرح تقسیم ہوگا؟ (نسیم اختر، دستگیر کالونی۔ کراچی)

جواب: جو شخص فوت ہو جائے اس کے ترکے میں سے سب سے پہلے اس کی تجہیز و تکفین کے مصارف وضع کیے جائیں گے، اس کے بعد اگر اس کے ذمے کسی کا قرض ہے تو وہ ادا کیا جائے گا اس کے بعد اگر اس نے کسی کار خیر، صدقہ جاریہ یا کسی غیر وارث کے حق میں وصیت کی ہے تو بقیہ ترکے کی ایک تہائی مقدار تک وہ نافذ ہوگی۔ ان امور کے بعد بقیہ ترکہ، میت کی وفات کے وقت جو ورثاء موجود تھے ان میں تقسیم ہوگا، صورت مسئولہ میں تقسیم حسب ذیل شرح سے ہوگی۔ ترکہ کے کل ۴۸ حصے ہوں گے ان میں سے والدہ کو ۸ حصے دو بیٹے ۲۰ حصے (فی کس دس حصے) چار بیٹیاں ۲۰ حصے (فی کس پانچ حصے)۔

سوال: ایک خاتون کا انتقال ہوا ہے، اس کے ماں باپ پہلے ہی وفات پا چکے ہیں، شوہر بھی نہیں ہے، اولاد بھی کوئی نہیں ہے، کوئی بھائی بھی نہیں ہے، صرف مندرجہ ذیل ورثاء ہیں (۱) ایک حقیقی بہن (۲) ایک صرف ماں شریک بہن (۳) تین بھتیجے ایک بھتیجی (۴) دو بھانجے ایک بھانجی، دریافت طلب امر یہ ہے کہ ازروئے شرع

ترکہ کس طرح سے تقسیم ہوگا اور یہ کہ آیا صرف باپ شریک بہن کا ترکے میں حصہ ہوگا۔ (انیس بتول، گلشن اقبال۔ کراچی)

جواب: کسی میت کے ترکے سے پہلے (۱) اس کی تجہیز و تکفین کے مصارف وضع کیے جائیں گے (۲) اس کے بعد اگر اس کے ذمے کسی کا قرض ہے تو ادا کیا جائے گا، (۳) اس کے بعد اگر اس نے کوئی وصیت کی ہوگی تو بقیہ ترکے کی ایک تہائی حد تک وہ نافذ ہوگی، (۴) اس کے بعد اس میں وراثت جاری ہوگی۔ صورت مسئولہ میں ترکہ حسب ذیل شرح سے تقسیم ہوگا۔ ترکے کے کل اٹھارہ حصے کیے جائیں اور اس میں سے ورثاء کے حصے مندرجہ ذیل ہوں گے :

(۱) حقیقی بہن = ۹ حصے، (۲) ماں شریک (اخیافی) بہن = ۳ حصے، (۳) تین بھتیجے، کل چھ حصے، ان میں سے ہر ایک کو دو دو حصے ملیں گے، بھتیجی اور بھانجے و بھانجی محروم رہیں گے اور انہیں کچھ نہیں ملے گا، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ "میت کے ذوی الفروض (یعنی وہ وارث جن کے حصے شریعت نے مقرر کر دیے ہیں) وارثوں کو ان کے مقررہ حصے دینے کے بعد اگر ترکہ بچ جائے اور کوئی عصبہ وارث نہ ہو تو سارا ترکہ قریب ترین مرد وارث کو ملے گا۔

عاق کی شرعی حیثیت

سوال: بعض اوقات اخبارات میں اشتہار شائع ہوتے ہیں کہ میں نے اپنے فلاں بیٹے کو عاق کر دیا ہے، میرا اس سے کوئی واسطہ نہیں ہے، میں نے اسے وراثت سے محروم کر دیا ہے وغیرہ، ایسے اعلانات کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

(عبدالمتین، گلبرگ، فیڈرل بی ایریا۔ کراچی)

جواب: "عاق" کے معنی نافرمان کے ہیں۔ "عقوق" کے معنی ہیں "نافرمانی"۔ حدیث پاک میں "عقوق الوالدین" (یعنی والدین کی نافرمانی) کو کبیرہ گناہوں میں شمار کیا گیا ہے، لہٰذا والدین کی نافرمانی دنیا و آخرت میں رسوائی کا باعث ہے۔ کوئی بھی عاقل و

بالغ شخص اپنے تصرفات اور افعال کا خود ذمہ دار ہوتا ہے۔ لیکن کسی نافرمان صلبی و نسبی اولاد کو وراثت سے محروم کرنے کا کسی کو حق نہیں۔ وراثت، ورثہ اور ترکہ اس مال کو کہتے ہیں جو مرنے والا پیچھے چھوڑ جاتا ہے، اس کی ورثاء میں تقسیم کے اصول، تناسب اور ترجیحات شریعت نے متعین کردی ہیں۔ اس میں ترمیم و تنسیخ کا کسی کو اختیار نہیں ہے۔ حتیٰ کہ مرنے والے اور ترکہ چھوڑنے والے کو بھی نہیں، لہٰذا نہ کوئی مورث و متوفی کسی وارث کو محروم کرسکتا ہے اور نہ غیر وارث کو وارث بنا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "وارث کے حق میں وصیت کا کوئی اعتبار نہیں ہے" جس کسی نے اپنی اولاد کو وراثت سے محروم قرار دیا ہو، شرعاً غیر موثر ہے۔

لاوارث بچی کی ولدیت کا مسئلہ

سوال: کم و بیش ایک سال پہلے ایک نوزائدہ بچی ملی جس کے بارے میں جوہر آباد تھانے میں ایف آئی آر کٹوائی گئی اور ایدھی سینٹر وغیرہ کو اطلاع دی گئی تھی، ہم خود بھی صاحب اولاد ہیں اس لئے انسانی ہمدردی کے تحت وہ بچی ہمارے یہاں پرورش پارہی ہے۔ معلوم یہ کرنا ہے کہ شناختی کارڈ کے 'ب' فارم اور دیگر سرکاری کاغذات میں ولدیت کے خانے میں کس کا نام لکھا جائے۔ برائے مہربانی بچی کے بہتر مستقبل کو مدنظر رکھتے ہوئے جواب عنایت فرمائیں۔

(منظور احمد، دستگیر کالونی، کراچی)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب ھو الموفق للصواب

شریعت کی رو سے کسی شخص کے نسب (یعنی نسبت ابنیت) کو اس کے حقیقی باپ کے علاوہ کسی دوسرے شخص کی طرف منسوب کرنا منع ہے۔ اگر کسی شخص نے کسی بچے کو (یا بچی کو) گود لیا ہو، لے پالک بنایا ہو یا متبنّیٰ بنایا ہو تو وہ اس کے سلسلہ نسب میں ولدیت کی جگہ اس کے حقیقی باپ کا نام لے اور لکھے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "اور (اللہ نے) تمہارے منہ بولے بیٹوں کو تمہارا (حقیقی) بیٹا نہیں بنایا، یہ تمہاری خود ساختہ بات ہے، اور اللہ تعالیٰ حق بات فرماتا ہے اور وہی (سیدھی) راہ دکھاتا ہے، ان (منہ بولے بیٹوں) کو ان کے (حقیقی) باپ کی طرف سے منسوب کرکے پکارا کرو، یہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک نہایت انصاف کی بات ہے، پھر اگر تمہیں ان کے باپ معلوم نہ ہوں تو وہ تمہارے دینی بھائی اور دوست ہیں (یا بشری رشتے کے لحاظ سے تمہارے چچازاد ہیں)" (الاحزاب: ۴، ۵)۔

ان آیات مبارکہ کی تفسیر میں علامہ ابو عبداللہ محمد بن احمد الانصاری القرطبی مالکی نے اپنی تفسیر "الجامع لاحکام القرآن" میں حدیث صحیح نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جس شخص نے اپنا نسب دانستہ اپنے باپ کے علاوہ کسی اور کی طرف منسوب کیا، حالانکہ وہ جانتا ہے کہ وہ شخص اس کا باپ نہیں ہے تو اس پر جنت حرام ہے"۔

قرآن نے بتایا کہ جس شخص کی حقیقی ولدیت معلوم نہ ہو، اسے اپنا دینی بھائی کہو، کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: "اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ" "یعنی مومن آپس میں بھائی بھائی ہیں" یا اپنا "مولیٰ" کہو، مولیٰ عربی زبان میں آقا کو بھی کہتے ہیں، غلام کو بھی کہتے ہیں، آزاد کرنے والے اور آزاد کردہ غلام کو بھی کہتے ہیں، چچازاد اور دوست کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے، علامہ محمود آلوسی بغدادی نے تفسیر روح المعانی میں اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کے متبنیٰ سالم تھے، جب قرآن میں متبنیٰ (لے

پالک) کو بیٹا کہنے کی ممانعت کا حکم نازل ہوا تو پھر لوگ انہیں سالم بن حذیفہ کہنے کے بجائے سالم مولیٰ حذیفہ کہنے لگے۔ اب چونکہ ہمارے ہاں لوگ "مولیٰ" کی اصطلاح، اس کے سیاق وسباق اور متعدد معانی پر اس کے اطلاق سے عام طور پر واقف نہیں ہیں، نہ ہی یہ اصطلاح بہ آسانی رواج پا سکتی ہے اور تعلیمی اداروں میں داخلے کے وقت، تعلیمی اسناد اور دیگر تمام دستاویزات میں ولدیت کا خانہ لازمی طور پر ہوتا ہے، اس لئے آپ اپنی لے پالک بچی کی ولدیت میں اپنا نام تو ہرگز نہ لکھیں، یا تو بنتِ عبداللہ (کیونکہ جو بھی اس کا حقیقی باپ ہے، وہ اللہ کا بندہ ہی ہوگا) یا بنت آدم لکھ دیں، کیونکہ اصلاً تو سب اولاد آدم ہیں۔





كتاب البيوع



سونے کے کاروبار میں شراکت

سوال: 'الف، کا سرمایہ ہے 'ب، اس کا کارندہ ہے 'ج، سونے کے زیورات بناتا اور دکانداروں کو بیچتا ہے۔ 'الف، کا سرمایہ ہوگا، وہ براہ راست نہیں بلکہ اپنے کارندے 'ب، کے ذریعے مشترکہ کاروبار میں عملاً شریک رہے گا۔ 'ج، کی محنت، تجربہ اور مہارت ہوگی۔ طے شدہ منافع پر نہیں بلکہ نفع و نقصان میں شراکت کی بنیاد پر، کیا یہ کاروباری شراکت جائز ہے۔ (محمد انیس، لیاقت آباد)

جواب: مذکورہ بالا صورت میں کاروباری شراکت جائز ہے۔ بشرطیکہ (۱) خدانخواستہ نقصان کی صورت میں نقصان کا سارا بار سرمایہ لگانے والے فریق 'الف، پر ہو۔ (۲) منافع کی صورت میں 'الف، اور 'ج، کے درمیان تقسیم منافع کا تناسب پہلے سے طے ہو۔ (۳) 'ب، جو 'الف، کے وکیل یا ایجنٹ کے طور پر شراکتی کاروبار 'ج، کے درمیان مصروف عمل ہے۔ 'الف، اور 'ب، کا باہمی معاملہ ہے کہ وہ مقرر تنخواہ پر کام کرے گا یا 'الف، کے حصہ منافع میں سے ایک مقررہ حصہ لے گا۔

اسلام میں نیلام عام

سوال: بعض احادیث مبارکہ میں رسول اللہ ﷺ نے "بیع علی البیع" یعنی "دوسرے کے سودے پر سودا کرنے" اور "سوم علی السوم" دوسرے کے نرخ پر نرخ بڑھانے سے منع فرمایا ہے اور "نجش" سے منع فرمایا ہے "نجش" سے کیا مراد ہے۔ ان احادیث کی روشنی میں اسلام میں "نیلام عام" کی کہاں تک گنجائش ہے؟

(محبوب الٰہی، ناظم آباد۔ کراچی)

جواب: "بیع علی البیع" سے مراد یہ ہے کہ فریقین میں ایک چیز کا سودا طے پا گیا اور باہمی رضامندی سے قیمت بھی طے پا گئی اور انہوں نے مزید غور و فکر کیلئے تین دن یا اس سے کم کی مہلت مقرر کر دی، جس کی شریعت میں اجازت اور گنجائش ہے، اسے "خیار شرط" کہتے ہیں۔ اب اس "مدت خیار" کے دوران کوئی شخص بائع (فروخت

کنندہ) سے کہے کہ آپ یہ سودا منسوخ کر دیں، میں آپ کو اس سے زیادہ قیمت دلادوں گا یا دے دوں گا یا کوئی شخص خریدار سے کہے کہ آپ یہ سودا فسخ کر دیں، میں اس سے کم رقم میں یہ چیز آپ کو دلادوں گا، یہ دونوں صورتیں شرعاً ناجائز اور حرام ہیں۔

"نرخ پر نرخ بڑھانے" کی صورت یہ ہے کہ خریدار اور فروخت کنندہ ایک چیز کے لین دین پر باہم رضامند اور آمادہ ہو چکے ہوں، لیکن ابھی "عقدِ بیع" یعنی سودا مکمل نہ ہوا ہو کہ ایک تیسرا شخص درمیان میں آ کر بائع کو لالچ دے کہ میں تمہیں اس سے زیادہ قیمت دے دوں گا، یہ صورت بھی شرعاً حرام ہے۔

"نجش" کے لغوی معنی ہیں "جوش دلانا" اصطلاحِ شریعت میں اس سے مراد یہ ہے کہ ایک آدمی چیز کو خریدنے کا ارادہ تو نہیں رکھتا، لیکن دوسرے خریدار کو جوش دلانے اور برانگیختہ کرنے کیلئے زیادہ قیمت لگائے، یہ دوسرے کو ارادتاً نقصان پہنچانا ہے اور شرعاً حرام ہے۔

نیلام کا جواز

بعض فقہاء کرام نے نجش کی ممانعت پر قیاس کرتے ہوئے نیلام کی بیع کو بھی مکروہ قرار دیا ہے، کیونکہ نیلام میں بڑھ چڑھ کر بولی لگائی جاتی ہے لیکن جمہور فقہاء کرام اور ائمہ نے نیلام کی بیع کو "جامع ترمذی" میں مروی حدیث کی رو سے جائز قرار دیا ہے۔

حضرت انس بن مالک روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک چادر اور ایک پیالہ بیچا اور فرمایا "اس چادر اور پیالے کو کون خریدے گا؟" ایک شخص نے عرض کیا کہ میں ان کو ایک درہم کے بدلے میں خرید لوں گا۔ آپ نے دوبارہ فرمایا ایک درہم سے زیادہ میں کون خریدے گا تو ایک شخص نے دو درہم دے دیئے، آپ نے وہ پیالہ اور چادر اس شخص کو دے دیئے" امام ترمذی کہتے ہیں کہ یہ حدیث حسن ہے۔

البتہ جو لوگ نیلام کی بیع کی ممانعت پر نجش سے استدلال کرتے ہیں، ان کا جواب یہ ہے کہ زیادہ قیمت لگانا اس وقت منع ہے جب کسی شخص کا ارادہ خریدنے کا نہ ہو بلکہ دھوکہ

دے کر اور جوش دلا کر قیمت بڑھانا مقصود ہو، یہ امر بلاشبہ حرام ہے لیکن اگر بولی لگانے والے کا ارادہ فی الواقع خریدنے کا ہو تو یہ منع نہیں ہے۔ اسی لئے ائمہ اربعہ نے نیلام کی بیع کو جائز قرار دیا ہے۔

ہنڈی کی بیع

(Bill of Exchange)

سوال: کیا "ہنڈی" کی بیع شرعاً جائز ہے؟ (شمشاد احمد خان۔ کراچی)

جواب: ہنڈی سے مراد یہ ہے کہ ایک شخص "الف" نے "ب" کو کچھ مال فروخت کیا اور "ب" نے رقم بعد میں ادا کرنے کا وعدہ کیا اور "الف" کو اس سلسلے میں ایک دستاویز لکھ کر دے دی کہ وہ اسے (مثلاً) چھ ماہ بعد ایک لاکھ روپے ادا کرے گا تو اس دستاویز کو "ہنڈی" کہتے ہیں۔ اب "الف" اس دستاویز کو لے کر ایک شخص یا بینک کے پاس جاتا ہے کہ آپ اس ہنڈی کو مجھ سے مثلاً دس فیصد کمیشن پر خرید لیں اور اس طرح بینک اسے ایک لاکھ کی بجائے نوے ہزار روپے دے دے گا اور چھ ماہ بعد مقررہ تاریخ پر بینک "ب" سے ایک لاکھ روپے وصول کر لے گا۔ کمیشن کی مقدار کا انحصار اس مدت کی کمی بیشی پر ہوتا ہے جس کے بعد ہنڈی کی ادائیگی لازم ہوتی ہے۔ "ہنڈی کی بیع" دراصل قرض کی بیع ہے اور اس میں ایک شخص اپنا واجب الادا قرض اس شخص یا ادارے کو بیچ رہا ہے، جس پر اس کا قرض واجب نہیں ہے اور یہ ناجائز ہے۔

اس بیع کے عدم جواز کا سبب یہ ہے کہ اس میں "غرر" (دھوکا) ہے کیونکہ ہو سکتا ہے کہ مقروض دیوالیہ ہو جائے یا اس کی جملہ املاک کسی حادثے کے نتیجے میں تلف ہو جائیں تو وہ دستاویز جس کی بیع ہوئی ہے اپنی قدر و قیمت کھو بیٹھے گی۔

بعض علماء نے ہنڈی کی بیع کو اس بناء پر ناجائز قرار دیا ہے کہ یہ زیادتی اور تاخیر کے ساتھ نقود کا نقود سے تبادلہ ہے اور "ربوٰ الفضل" کی حرمت کا اس پر اطلاق ہوتا ہے۔

گنے کا پیشگی سودا

سوال: میں گنے کا کاروبار کرتا ہوں۔ ہمارے ہاں اس وقت گنے کے کارخانے بند ہیں جب کھلیں گے تو تب ہمارا گنا ۳۶ روپے من کے حساب سے مل میں جائے گا، جس میں چار روپے فی من کرایہ نکال کر ۳۲ روپے من کسان کو پڑے گا۔ اس وقت چونکہ مل بند ہے اس لئے کاشتکار اپنی ضروریات پوری کرنے کیلئے ۲۰ سے ۲۶ روپے کے حساب سے گنا بیوپاری کو بیچ دیتا ہے اور اپنی ضروریات پوری کرتا ہے، جبکہ وہ گنا اسی کاشتکار کی زمین پر اگا ہوتا ہے۔ چار پانچ ماہ بعد وہ بیوپاری گنا کاٹ کے مل میں لے جاتا ہے جہاں اسے ۳۶ روپے مل جاتے ہیں۔ آپ سے یہ پوچھنا ہے کہ کیا یہ بیوپاری کا منافع ہے یا سود؟

جواب: مبیع (فروخت کی جانے والی چیز) یا ثمن (فریقین کے درمیان کسی چیز کی طے شدہ قیمت) میں سے ایک چیز پیشگی دے دی جائے اور دوسری بعد میں تاخیر کے ساتھ، تو اسے فقہی اصطلاح میں "بیع سَلَم" کہتے ہیں، اس کے جواز کیلئے ضروری ہے کہ تمام امور پہلے سے طے ہوں تاکہ بعد میں آپس میں جھگڑا نہ ہو، مثلاً فی من قیمت، گنے کی مقدار، مقام تفویض یعنی یہ کہ بائع خریدار کو وہ گنا کہاں سپرد کرے گا؟، وغیرہ۔ اب آگے خریدار کی قسمت کہ اسے کتنا نفع یا نقصان ہوتا ہے۔ یہ بات تو بالکل ظاہر ہے کہ کاروبار نفع حاصل کرنے کیلئے ہی کیا جاتا ہے، نفع اور سود میں فرق ہے، نفع جائز اور حلال ہے اور سود حرام۔ گنے کے کاروبار کی جو صورت سوال میں درج ہے وہ سود نہیں ہے۔

ٹھیکے کے حصول اور بل کی وصولی کیلئے رشوت کا لین دین

سوال: میں گورنمنٹ ٹھیکیدار ہوں، ہمیں ٹھیکہ حاصل کرنے کیلئے رشوت دینی پڑتی ہے، پھر ورک آرڈر لینے سے کام کی تکمیل تک مختلف مراحل میں متعلقہ افسران اور سرکاری اہلکاروں کو رشوت دینی پڑتی ہے، بل کی وصولی بھی رشوت کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ ان حالات میں حکم شرعی کیا ہے، ہمارے لئے دوسرا کام بھی دشوار ہے؟ (ج-م- کراچی)

جواب : اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق نہ کھاؤ اور نہ ہی (رشوت کے طور پر) وہ مال حاکموں تک پہنچاؤ، تاکہ تم لوگوں کے مال کا کچھ حصہ گناہ کے ساتھ کھاؤ، حالانکہ تم جانتے ہو (کہ یہ فعل ناجائز ہے)" (البقرہ: ۱۸۸) جامع ترمذی میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنھما سے روایت ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے رشوت دینے اور لینے والے (دونوں) پر لعنت فرمائی ہے۔ اسلام میں فقہی اعتبار سے ایمان و عمل کے درجات ہیں۔ اعلیٰ درجے کو عزیمت کہتے ہیں، یعنی ایمان و عمل کا کامل ترین درجہ، جو اہل عزیمت اور اولوالعزم اہل ایمان کا شعار ہے۔ یعنی خواہ حالات کتنے ہی ناسازگار کیوں نہ ہوں، لیکن بندۂ مومن ایمان و عمل کے جادۂ مستقیم سے سرِمو انحراف نہ کرے۔ اس مرتبۂ ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ انسان کسی بھی صورت میں نہ رشوت لے اور نہ دے اور اس استقامتِ ایمانی کی راہ میں حائل ہر مشکل کو خندہ پیشانی سے برداشت کرے لیکن ظاہر ہے کہ بعض بندے ضعیف الایمان اور کم ہمت بھی ہوتے ہیں۔ اسے فقہی طور پر رخصت یا حالت اضطرار واکراہ کا نام دیا گیا ہے لہٰذا ان تمام احوال کو پیش نظر رکھ کر فقہاء کرام نے رشوت کے جو تفصیلی احکام بیان فرمائے ہیں، وہ یہ ہیں۔

(۱) منصبِ قضاء حاصل کرنے کیلئے رشوت لینا اور دینا دونوں حرام ہیں بلکہ ایسا شخص منصب قضاء کا اہل ہی نہیں ہے۔

(۲) کسی شخص کا حاکم سے اپنے حق میں فیصلہ کرانے کیلئے رشوت دینا، ایسے امور میں رشوت لینا اور دینا دونوں حرام ہیں، اگر وہ رشوت دے کر اپنے حق میں ناجائز فیصلہ کرانا چاہتا ہے تو اس کا باطل اور حرام ہونا بالکل واضح ہے، لیکن اگر وہ فیصلہ انصاف پر مبنی ہو تب بھی اس کیلئے رشوت کا لین دین ناجائز ہے۔

(۳) کسی بھی صاحب اقتدار و اختیار کیلئے رشوت لینا کسی بھی صورت میں جائز نہیں ہے کیونکہ اس کیلئے کوئی تعذّر، دشواری اور اضطرار نہیں ہے جو رشوت کے جواز کا سبب

قرار پائے، البتہ کسی شخص پر ظلم ہو رہا ہے، ظلماً اس کی جان یا مال تلف کیا جا رہا ہے، رشوت دیئے بغیر اس کا حق روکا جا رہا ہے۔ جلد یا بدیر اس کے ملنے کی کوئی توقع نہیں ہے، تو ایسی ناگزیر صورتحال میں فقہاء کرام نے اس کیلئے اپنی جان و مال اور آبرو کو ظلم سے بچانے کیلئے یا اپنے غصب شدہ حق کو حاصل کرنے کیلئے، اضطراری صورتحال میں صرف رشوت دینا جائز قرار دیا ہے، لینا بہر حال حرام ہے۔ اس مخصوص صورتِ حال میں بھی رشوت دینے کی اجازت رخصت شرعی کی بنا پر ہے، کم ہمت صاحبانِ ایمان کیلئے، ورنہ عزیمت یہی ہے کہ حرام سے ہر صورتِ حال میں بچا جائے۔ الآیہ کہ جان کو خطرہ درپیش ہو۔ رشوت کے بارے میں یہ مسائل ممتاز فقہاء اسلام علامہ قاضی خان، علامہ ابن ہمام، علامہ ابن نجیم، علامہ شامی رحمہم اللہ اجمعین کی کتب سے ماخوذ ہیں۔ (بحوالہ شرح صحیح مسلم)۔ اب جو صورت مسئلہ دریافت کی گئی ہے اس اصولی گفتگو کے بعد اس کا جواب یہ ہے:

(ا) ٹھیکہ لینے کیلئے رشوت دینا ناجائز اور حرام ہے کیونکہ ٹھیکہ لینا آپ کا حق نہیں ہے۔

(ب) اگر کام ٹھیکے کے معاہدے میں طے شدہ شرائط کے مطابق انجام نہیں دیا، میٹریل ناقص ہے، کوالٹی مطلوبہ معیار کے مطابق نہیں ہے تو اسے رشوت دے کر پاس کرانا اور کلیرنس سرٹیفکیٹ یا کمپلیشن سرٹیفکیٹ لینا ناجائز اور حرام ہے۔

(ج) اگر کام طے شدہ شرائط اور مطلوبہ معیار کے مطابق انجام دے دیا ہے لیکن افسر مجاز بل کو روکے ہوئے ہے، ادائیگی سے انکار کر رہا ہے، مگر افسرانِ بالا سے یا عدالت سے اپیل کرنے پر اس کا حق مل سکتا ہے تو رشوت نہ دے اور حق طلبی کیلئے یہ طریقۂ کار اختیار کرے۔ لیکن اگر رشوت کا چینل اوپر تک ہے اور افسرانِ بالا سے یا عدالت سے رجوع کرنے اور اپیل کرنے سے حق ملنے کے امکانات مزید معدوم ہو جاتے ہیں تو پھر بصورتِ مجبوری و اضطرار رشوت دے کر اپنا حق وصول کر لے اور اپنے اس فعل پر اللہ تعالیٰ سے معافی مانگے اور رزق حلال کے حصول کی جستجو کرتا رہے۔ بعض اوقات لوگ رشوت اس لئے دیتے ہیں کہ انہیں ان کے استحقاق سے زیادہ مل جائے، وقت مقررہ سے پہلے مل جائے، تو ان مقاصد کیلئے رشوت دینا ناجائز ہے۔

لائسنسوں کی فروخت

سوال: بعض لوگ اپنے سیاسی اثر و رسوخ کی بناء پر حکومت سے امپورٹ لائسنس یا ٹرانسپورٹ کا "روٹ پرمٹ" اپنے نام لے لیتے ہیں اور آج کل حکومتیں سیاسی رشوت کے طور پر ایسی نوازشات کرتی رہتی ہیں اور پھر یہ لوگ ان "لائسنسوں" یا "پرمٹوں" کو بالترتیب پیشہ ور تاجروں یا ٹرانسپورٹروں کو بیچ دیتے ہیں ایسی بیع شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

(جمیل احمد خان، کھارادر۔ کراچی)

جواب: اگر یہ لائسنس یا پرمٹ کسی خاص آدمی کے نام پر جاری کئے گئے ہیں اور قابل منتقلی نہیں ہیں، تو ان کا دوسرے شخص کو فروخت کرنا شرعاً ناجائز ہے، کیونکہ یہ جھوٹ اور دھوکا دہی پر مبنی ہے، لیکن اگر یہ لائسنس یا پرمٹ کسی خاص شخص کے نام پر نہیں ہے بلکہ ان کی حیثیت ایک ایسی دستاویز کی ہے کہ جو اس کا حامل ہو، اس کے ذریعے مال بیرون ملک سے درآمد کر سکتا ہے یا ٹرانسپورٹ متعلقہ روٹوں پر چلا سکتا ہے تو پھر ان کی حیثیت ڈاک کے ٹکٹوں کی سی ہوگی اور ان کی بیع جائز ہے۔

فلیٹ، دکان کی پگڑی

سوال: ہمارے ملک کے بڑے شہروں اور تجارتی مراکز میں یہ طریقۂ کار عام ہے کہ فلیٹ اور دکانیں کرائے پر دی جاتی ہیں، کرایہ اگرچہ معمولی ہوتا ہے لیکن بھاری رقم بطور پگڑی وصول کی جاتی ہے اور ایک کرایہ دار جب فلیٹ یا دکان دوسرے کرایہ دار کو منتقل کرتا ہے اور قبضہ دیتا ہے تو پگڑی وصول کرتا ہے۔ موقع و محل کے اعتبار سے پگڑی کی شرح مقرر ہوتی ہے۔ کیا یہ پگڑی کا لین دین شرعاً جائز ہے؟

(سید آفاق علی، کراچی)

جواب: چونکہ قبضہ کوئی حسی یا عین چیز نہیں ہے، اس لئے یہ بیع باطل ہے۔ بعض لوگوں نے اس کے جواز کا یہ حیلہ تجویز کیا ہے کہ دکان اور فلیٹ میں کچھ چیزیں از قسم

فرنیچر وسامان وغیرہ رکھ دی جائیں اور پگڑی کی مالیت کے برابر ان کی قیمت مقرر کر کے لی جائے۔ گویا یہ "اونٹ کے گلے میں بلی" والی بات ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ فقہی یا قانونی حیلہ اور بات ہے اور خداوند علیم وخبیر کے سامنے سرخرو ہونا اور بات ہے، وہ ظاہر وباطن اور نیتوں کا حال جانتا ہے۔

منافع کی شرح

سوال : شرعاً منافع کی زیادہ سے زیادہ مقدار کیا ہے؟

جواب : (۱) بنیادی طور پر بیع وشراء اور کاروبار کا مقصد نفع کا حصول ہے۔ شرح منافع کی کمی بیشی کا مدار محض کسی کی خواہش پر نہیں بلکہ حالات اور طلب ورسد (Demand & Supply) کے معاشی اصولوں پر ہے۔ شریعت نے کم از کم یا زیادہ سے زیادہ منافع کی کوئی حد مقرر نہیں فرمائی۔ بس اتنا ضرور ملحوظ رہے کہ زیادہ سے زیادہ حصول نفع اور کثرت مال کی خواہش انسان کو سنگدل اور شقی القلب نہ بنادے، کسی کی مجبوری کا ناجائز فائدہ نہ اٹھائے۔ اسی لئے بیع وشراء کی وہ صورتیں جو استحصال کا سبب بنتی ہیں، شرعاً ممنوع ہیں۔ مثلاً احتکار (Hoarding) یعنی مال کی طلب کے باوجود اسے جمع کئے رکھنا اور مارکیٹ میں سپلائی نہ کرنا، محض اس لئے ذخیرہ اندوزی کرنا کہ مال کی طلب بڑھے اور لوگ بامجبوری تجارت فطری اصولوں کے برعکس زیادہ سے زیادہ نفع دینے پر مجبور ہو جائیں۔ اسی طرح حدیث پاک میں "تلقی الجلب" کو بھی منع فرمایا، یعنی یہ کہ کوئی شخص مارکیٹ تک پہنچنے سے پہلے کھیت، کھلیان، باغات میں یا گلے باتوں سے وہیں پر جا کر اس لئے مال خریدے کہ لاعلمی اور ناتجربہ کاری کے سبب ایک جانب انہیں نقصان پہنچائے اور دوسری جانب شہری آبادی پر نہایت مہنگے داموں بیچے، اور اگر کوئی نیک دل خداترس تاجر زیادہ منافع ملنے کے واضح امکان کے باوجود قناعت اور انسان دوستی کا مظاہرہ کرتے ہوئے رضاکارانہ طور پر اپنے لئے

ایک کم سے کم مقدار نفع مقرر کر دیتا ہے، خواہ مارکیٹ کا رجحان زیادہ ہی کیوں نہ ہو تو ایسے تاجروں کے بارے میں ارشاد رسول ﷺ ہے "قیامت کے دن دیانتدار، صداقت شعار تاجر کا حشر انبیاء وصالحین کے ساتھ ہوگا۔"

انعامی بانڈز پر انعام

سوال: کیا انعامی بانڈز کا لین دین اور اس پر انعام کی رقم کا لینا جائز ہے؟

(ایم خان آفریدی، بلدیہ ٹاؤن۔ کراچی)

جواب: انعامی بانڈز حکومت پاکستان جاری کرتی ہے، شیڈولڈ کمرشل بینکوں یا قومی بچت کے مراکز کے ذریعے درج قیمت پر انہیں فروخت کرتی ہے اور اسی قیمت پر خریدتی ہے، اس آزادانہ خرید و فروخت میں کسی مدت کی کوئی پابندی نہیں ہے۔ خریدار کی نہ اس میں کوئی رقم ڈوبتی ہے نہ ایسا کوئی خطرہ اس میں ہے اور نہ ہی اسے اس پر کوئی طے شدہ زائد رقم ملتی ہے۔ ان بانڈز کا اس طرح لین دین بغیر کسی شرعی قباحت کے جائز ہے اور اب سپریم کورٹ آف پاکستان کی شریعت اپیلٹ بنچ بھی اسے جائز قرار دے چکی ہے۔ جن علماء نے اس کے عدم جواز کا فتویٰ دیا تھا ہمیں معلوم نہیں کہ وہ اب بھی اپنے فتوے پر قائم ہیں یا رجوع کر چکے ہیں۔ تاہم انہوں نے جو عدم جواز کی بنیاد قائم کی، وہ ان مفروضوں پر تھی کہ یہ قرض ہے جو بینک عوام سے لیتے ہیں اور اس کا سود سب پر مساوی تقسیم کرنے کے بجائے چند افراد کو انعام کی شکل میں دے دیتے ہیں اور ان کے نزدیک چونکہ سود کی مجموعی رقم چند افراد کو مل جاتی ہے اور باقی محروم رہتے ہیں لہذا یہ قمار بھی ہے، لیکن یہ سب مفروضے غلط ہیں، کیونکہ یہ قرض نہیں ہے بلکہ خرید و فروخت ہے، قرض کی واپسی کیلئے مدت متعین ہوتی ہے، انعامی بانڈ میں کسی مدت کا تعین نہیں ہے بلکہ بانڈ کا حامل جب چاہے اسے حکومت کو فروخت کر کے اپنی پوری رقم لے سکتا ہے۔ ان بانڈز کا اجراء حکومت پاکستان کرتی ہے، بینک نہیں کرتے، وہ صرف ان کی خرید و فروخت کیلئے ایجنٹ کا، کام کرتے ہیں۔ اس میں کوئی سودی معاہدہ بھی نہیں ہے۔

کروڑ پتی اسکیم، مالا مال اور پرائز بانڈ

سوال: بینکوں کی کروڑ پتی اسکیم، مالا مال اسکیم اور پرائز بانڈ پر انعام کا کیا حکم ہے؟

(محمد اشرف، منظور کالونی۔ کراچی)

جواب: بینکوں کا سارا کاروبار سود پر قائم ہے، کروڑ پتی اسکیم، مالا مال اسکیم یا اس طرح کی اور ترغیبی اسکیمیں اور ان سے ملنے والی رقوم ناجائز ہیں، کیونکہ یہ حرام میں معاونت کرتی ہیں البتہ "پرائز بانڈ" کی مساوی قیمت پر، یعنی بانڈ پر درج قیمت پر خرید و فروخت جائز ہے اور ان پر ملنے والا انعام بھی جائز ہے، علمائے اہلسنت اسے پہلے بھی جائز قرار دیتے تھے اب "سپریم کورٹ شریعت اپیلٹ بنچ" نے بھی اس کے جواز کا فیصلہ صادر کردیا ہے البتہ "پرائز بانڈز" کی پرچیوں کا، کاروبار ناجائز اور حرام ہے۔

انعامی بانڈز کی پرچیوں کا کاربار

سوال: (۱) مجھے ایک آدمی نے کچھ رقم دی ہے اور کہا کہ میرے پاس خرچہ ہو جائے گا تم اپنے پاس رکھو۔ میں نے رکھ لی میں نے وہ رقم اپنے کاروبار میں لگالی اور اس بندہ کو میں ماہانہ کچھ نہ کچھ خرچ اخراجات کیلئے دیتا ہوں، اس پر کچھ لوگ بولتے ہیں یہ سود ہے، آپ فرمائیں۔ یہ کیسا ہے؟

(۲) جناب عالی! میں پرائز بانڈ کی پرچیوں کا کام کرتا ہوں اس کاروبار میں نفع و نقصان دونوں ہوتے ہیں یہ کاروبار کیسا ہے جائز ہے یا ناجائز؟

(۳) پرائز بانڈز رکھنا اور اس پر جو انعام ملتا ہے، اس کا کیا حکم ہے؟ اس کا کاروبار کرسکتے ہیں یا نہیں؟ (صالح محمد داؤد، حسین آباد۔ کراچی)

جواب: (۱) (الف) کسی بھی رقم پر، جسے کاروبار میں لگایا گیا ہو یا بطور قرض لیا گیا ہو، طے شدہ شرح کے مطابق ماہانہ مقررہ رقم دینا اور لینا سودی لین دین ہے اور شرعاً حرام ہے، البتہ اگر رقم شرعی مضاربت کے اصول پر کاروبار کیلئے دی گئی ہے۔ نفع میں شرح تناسب طے کرلیا گیا ہو اور خدانخواستہ بصورت نقصان، اس کی ذمہ داری

قبول کی جائے تو جائز ہے۔

(ب) اگر رقم بطور امانت و حفاظت رکھنے کیلئے دی ہے تو امین کا اس میں تصرف کرنا اور استعمال میں لانا جائز نہیں ہے ورنہ بصورت اتلاف اس پر ضمان ہوگا۔

(۲) انعامی بانڈ کی پرچیوں کا کاروبار کرنا ناجائز اور حرام ہے۔ کیونکہ ایسے "انعامی بانڈز" کا حامل، بانڈز اپنی ملکیت اور قبضے میں رکھتا ہے اور ایک شخص ایک مخصوص رقم کے عوض "انعامی بانڈز" کے کچھ نمبرز یا سیریز لکھ دیتا ہے اور طے یہ ہوتا ہے کہ اگر اس پرچی پر درج سیریز میں سے کسی خاص نمبر پر انعام نکل آیا تو بانڈز کا حامل اس پرچی کے خریدار کو انعام کی پوری رقم دے گا، یہ اس لئے حرام ہے کہ اس میں پرچی کے عوض خریدار کو بانڈز نہیں ملتے اور ان نمبرات پر انعام نہ نکلنے کی صورت میں خریدار کی رقم ڈوب جاتی ہے، لہٰذا یہ قمار کی ایک شکل ہے۔

(۳) پرائز بانڈز رکھنا اور ان پر ملنے والا انعام جائز ہے۔

انعامی بانڈ پر انعام کے جواز کا مسئلہ

وضاحتی نوٹ: پرائز بانڈ کے انعام کے بارے میں آپ میرا موقف ۸ اکتوبر کے تفہیم المسائل میں پڑھ چکے ہیں۔ عدم جواز کے بارے میں ایک صاحب نے ایک فتویٰ کی فوٹو اسٹیٹ ارسال کی ہے، یہ سب فتاویٰ ہمارے علم میں ہیں۔ اخبار میں مزید تفصیل کی گنجائش نہیں، جگہ محدود ہے۔ سپریم کورٹ شریعت اپیلٹ کا فیصلہ "آل پاکستان لیگل ڈائجسٹ جلد نمبر XLIV مطبوعہ ۱۹۹۲ء میں مل جائے گا، اس میں (ر) جسٹس شفیع الرحمٰن اور (ر) جسٹس پیر کرم شاہ الازہری مرحوم کی آراء پرائز بانڈ پر ملنے والے انعام کے جواز کے بارے میں قمار اور لاٹری وغیرہ کی شرعی حیثیت پر فیصلے کے ضمن میں درج ہیں۔ جو حضرات علمی ذوق رکھتے ہیں، جنہیں مطالعے کا شغف ہے اور فقہی مسائل کی تحقیق میں دلچسپی ہے اور تفصیلی بحث اور دلائل جاننا چاہتے ہیں تو شرح صحیح مسلم جلد (۴) صفحہ ۱۱۱ تا ۱۲۶ مصنف علامہ غلام رسول سعیدی کا مطالعہ فرمائیں اور اس کے بعد بھی تشنگی محسوس کریں تو ہم سے رجوع فرمائیں۔

کاروباری اداروں کی انعامی اسکیمیں

سوال: آج کل عموماً بہت سے صنعتی اور کاروباری ادارے اپنی مصنوعات کی فروخت میں اضافے کیلئے انعامی اسکیموں کا اعلان کرتے ہیں۔ کیا شرعاً جائز ہیں؟

(کامران قریشی، خداداد کالونی۔ کراچی)

جواب: مصنوعات کی فروخت میں ترغیب اور اضافے کیلئے انعامی اسکیمیں جائز ہیں، بشرطیکہ متعلقہ کمپنی دیانت داری سے انعام کی رقم ادا کرے، ورنہ اس کے مالکان جھوٹ اور دھوکہ دہی کے مرتکب اور گناہ گار ہوں گے اور اس حیلے سے حاصل کردہ مال میں ان کیلئے خیر اور برکت نہیں ہوگی۔

وہ انعام اپنی جانب سے یا اپنے منافع میں سے ادا کریں، انعامی رقم کی کمی پورا کرنے کیلئے مال کی کوالٹی یا مقررہ مقدار میں کمی نہ کریں، ورنہ وہ خیانت کے مرتکب ہوں گے۔

ایسا بھی نہ ہو کہ جس نمبر پر انعام نکالنا مقصود ہو، اسے کمپیوٹر میں پہلے سے فیڈ کردیا جائے اور اسے مارکیٹ میں سپلائی کرنے کے بجائے اپنے پاس رکھ لیا جائے یا اپنے کسی من پسند آدمی کو دے دیا جائے، یہ بھی خیانت اور فراڈ ہے۔ یا یہ کہ انعام کیلئے کسی مخصوص نمبر کو کمپیوٹر میں فیڈ کرنے کے بعد اسے تلف کردیا جائے تاکہ اس کا کوئی دعویدار ہی سامنے نہ آئے۔ یہ بھی جھوٹ، فریب اور خیانت کے زمرے میں آئے گا اور ایسے لوگ دنیا میں روحانی خیر و برکت سے محروم رہیں گے اور اخروی عذاب کے مستحق ہوں گے۔

ہاں، اگر کوئی ترغیبی انعامی اسکیم ان معائب یا ان جیسے دیگر مفاسد سے پاک ہے، اس میں ملاوٹ، مقدار میں کمی، جھوٹ، خیانت اور فریب کا شائبہ نہیں ہے تو شرعاً جائز ہے۔

قومی بچت اسکیمیں سود یا منافع

سوال: قومی بچت اسکیموں کے ذریعے ملنے والی رقم کی شرعی حیثیت کیا ہے۔ کیا چیف ایگزیکٹو جنرل پرویز مشرف سود کا خاتمہ کردیں گے؟

(ڈینیل، سردار بھٹی، منظور کالونی۔ کراچی)

جواب: قومی بچت اسکیموں پر منافع کے نام سے ملنے والی رقم سود ہے۔ باقی رہا یہ سوال کہ چیف ایگزیکٹیو سود کا خاتمہ کرنا چاہتے ہیں یا نہیں یا اس میں کامیاب ہو سکیں گے یا نہیں، تو ان کے عزائم اور پروگرام کا مجھے علم نہیں ہے، نہ میں اس پوزیشن میں ہوں کہ ان سے رابطہ کر کے آپ کو آگاہ کر سکوں۔ ہو سکے تو آپ اس موضوع پر ان سے براہِ راست خط و کتابت کریں یا کسی ذمے دار سرکاری شخصیت سے رابطہ کریں۔ سود کے مفاسد پر تفصیلی گفتگو اس کالم میں نہیں ہو سکتی، گنجائش نہیں ہے۔

بینک کی ملازمت

سوال: (ا) کیا ازروئے شریعت بینک کی ملازمت حرام ہے؟ (ب) کیا بیوٹی پارلر کا، کاروبار اور اس کی آمدنی شرعاً جائز ہے؟ (سید محمد یامین، نارتھ کراچی)

جواب: (ا) ہمارے ہاں بینکوں میں چونکہ سارا کاروبار سودی ہے، اس لئے اس کی ملازمت شرعاً ناجائز ہے، کیونکہ یہ حرام میں معاونت ہے۔ البتہ جس شخص کے پاس گزر بسر اور اپنی اور اپنے زیرِ کفالت افراد کی بنیادی ضروریات کیلئے کوئی حلال ذریعہ روزی نہ ہو تو دلی کراہت اور ناگواری کے ساتھ ملازمت کرے اور رزق حلال کیلئے جدوجہد کرتا رہے، جب روزی کا حلال ذریعہ مل جائے تو اسے فوراً چھوڑ دے اور اللہ تعالیٰ پر توکل کرے۔

(ب) "بیوٹی پارلر" میں اگر عورتیں ہی عورتوں کی تزئین اور سنگھار کا کام کرتی ہیں اور غیر مردوں کا کوئی عمل دخل نہ ہو تو یہ جائز ہے، بشرطیکہ عورتوں سے عورتوں کے ستر کے معاملے میں حدودِ شرع کی پاسداری ہو، البتہ عورتوں کا بالوں کی تراش اس طرح کرنا کہ مردوں سے مشابہت ہو تو یہ ناجائز ہے اور ایسی عورتوں پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت فرمائی ہے۔

☆...☆...☆

کتاب الیمین

قسم کی قسمیں

سوال: بعض لوگ قسم کھاتے وقت اس طرح کے کلمات استعمال کرتے ہیں، مثلاً تیرے سر کی قسم، میری جان کی قسم، ماں باپ کی قسم، اولاد کی قسم، عرشِ الٰہی کی قسم، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قسم وغیرہ، کیا ان کلمات سے قسم ہو جاتی ہے؟

(محمد احتشام خاں، الفلاح سوسائٹی۔ کراچی)

جواب: شریعت میں قسم صرف اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کی ہوتی ہے یا کلام اللہ کی قسم ہوتی ہے۔ غیر اللہ کی قسم کا شریعت میں کوئی اعتبار نہیں ہے۔ نہ ایسی قسم منعقد ہوتی ہے اور نہ اس کا کوئی کفارہ ہے۔ حدیث شریف میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ تمہیں اپنے آباء و اجداد (یعنی غیر اللہ) کی قسم کھانے سے منع فرماتا ہے، سو جو قسم کھانا چاہے وہ اللہ تعالیٰ کی قسم کھائے یا خاموش رہے۔"

کافر ملت پر معلّق کر کے قسم کھانا

سوال: بعض لوگ قسم کھاتے وقت جوش میں آکر اس طرح کے کلمات استعمال کرتے ہیں کہ: اگر میں نے یہ کام کیا ہو یا ایسا کام کروں تو یہودی ہو جاؤں یا عیسائی ہو جاؤں یا کافر ہو کر مروں یا ایمان سے محروم ہو جاؤں، اور وہ قسم میں جھوٹا ہے یا قسم توڑ دی، تو کیا حکم ہے؟

(کھتری عصمت علی پٹیل، کراچی)

جواب: **(نوٹ)**: اس سوال کا جواب میں نے طبع اول میں مختصر طور پر لکھا تھا، جس میں صرف ایک شق کا ذکر تھا اور حدیث بھی درج کی تھی، مقصود یہ تھا کہ لوگ اس کی سنگینی اور حدیث میں بیان کی گئی وعید کو پڑھ کر اس طرح کے کلمات استعمال کرنے سے اجتناب کریں، کیونکہ جو "مُبتلیٰ بہٖ" (یعنی جس نے ایسی قسم کھالی) ہے، اس کے لئے تو رخصت و رعایت شرعی کا پہلو مفید ہوتا ہے، لیکن جو اب تک ایسے فعل سے بچے ہوئے ہیں، ان کے لئے وعید کا پہلو مفید ہوتا ہے تاکہ آئندہ بھی احتیاط پر عمل کریں۔ لیکن ہمارے محترم دوست علامہ مفتی محمد رفیق حسنی صاحب

مہتمم جامعہ مدینۃ العلوم ونائب رئیس مجلس الفقہ الاسلامی پاکستان نے فقہی باریک بینی اور احتیاط کی جانب متوجہ کیا تو میں نے مناسب سمجھا کہ اس کا تفصیلی جواب تحریر کر دیا جائے تاکہ کوئی پہلو تشنہ نہ رہے، میں محترم مفتی صاحب کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اس مسئلے کو فقہی اعتبار سے جامع بنانے کی طرف متوجہ فرمایا۔

تفصیلی جواب درج ذیل ہے :

جس شخص نے کسی کام کے کرنے کو "ملتِ غیر اسلام" پر مُعلّق کیا' مثلاً کہا اگر میں نے فلاں کام کیا تو میں یہودی ہوں، تو اس کے تین محامل ہیں :

(۱) اگر اس کا مقصد یہ تھا کہ یہ کام اسی طرح "واجب الامتناع" ہے (یعنی اس کا نہ کرنا ضروری ہے)، جیسے یہودی نہ ہونا ضروری ہے، اس صورت میں وہ کافر نہیں ہوگا، لیکن چونکہ حدیث میں ایسی قسم کھانے سے منع فرمایا ہے، اس لئے وہ گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوگا، اور حدیث میں جو اس کو کافر فرمایا گیا ہے، وہ زجر و توبیخ پر مشتمل ہے (البحر الرائق ج ۴ ص ۲۸۴ مطبوعہ مکتبہ ماجدیہ، کوئٹہ)۔

(۲) اور اگر اس کا مقصد یہ تھا کہ وہ یہ کام بالکل نہیں کرے گا، اور اس نے یہ کام کیا تو اس کا یہودی ہونا صحیح، برحق اور حلال ہے، اس صورت میں وہ کافر ہو جائے گا، کیونکہ کفر پر راضی ہونا بھی کفر ہے۔ اس کی دوسری صورت یہ ہے کہ اس نے ماضی کے حوالے سے کسی کام کے نہ کرنے کی جھوٹی قسم کھائی اور کہا کہ اگر اس نے یہ کام کیا ہو تو وہ یہودی ہے، اور اس کا یہودی ہونا صحیح اور برحق ہے، تو اس صورت میں وہ فی الفور کافر ہو جائے گا، کیونکہ کفر پر راضی ہونا بھی کفر ہے (البحر الرائق ج ۴ ص ۲۸۶۔۲۸۵ مطبوعہ کوئٹہ اور الدر المختار ورد المحتار ج ۵ ص ۳۹۴۔۳۹۲ مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت ۱۴۱۹ھ)۔

(۳) اور اگر اس نے یہودیت کی تعظیم کی نیت سے قسم کھائی کہ اگر میں نے فلاں کام کیا تو میں یہودی ہوں، اس صورت میں بھی وہ کافر ہو جائے گا، کیونکہ اسلام کے علاوہ کسی اور دین کی تعظیم کرنا کفر ہے، اور اگر اس نے یہودیت کی تعظیم کی نیت نہیں کی تھی، تو

وہ کافر نہیں ہوگا، اور حدیث پاک میں جو ارشاد ہے، "وہ کافر ہو جائے گا"، وہ کفرانِ نعمت پر محمول ہے (صحیح مسلم مع شرح النووی، رقم الحدیث : ۱۱۰، مطبوعہ مکتبہ نزار، مصطفیٰ الباز، مکہ مکرمہ ۱۴۱۷ھ)۔

حدیث مبارک، جس کا حوالہ اوپر دیا گیا ہے، یہ ہے :

"ثابت بن قیس ضحاک بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے درخت کے نیچے (یعنی بیعت رضوان، جو صلح حدیبیہ کے موقع پر ہوئی تھی) رسول اللہ ﷺ کے دست اقدس پر بیعت کی، اس موقع پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جس شخص نے "ملت غیر اسلام" پر قسم جھوٹی کھائی (یعنی یمین غموس) تو وہ ایسا ہی ہے، جیسا اس نے کہا۔"

قسم کی شدت

سوال : بعض لوگ طیش میں آکر اس طرح کہہ دیتے ہیں کہ اگر میں یہ کام کروں تو مجھ پر اللہ تعالیٰ کا غضب ہو، اس کی لعنت ہو، مجھ پر آسمان پھٹ پڑے، مجھ پر خدا کی مار ہو، مجھ پر خدا کی پھٹکار ہو، رسول اللہ ﷺ کی شفاعت سے محروم ہو جاؤں، مرتے وقت کلمہ نصیب نہ ہو وغیرہ، آیا ان کلمات سے قسم ہوتی ہے یا نہیں؟

(محمد عرفان احمد، بفر زون۔ کراچی)

جواب : ان کلمات سے قسم تو نہیں ہوتی، لیکن ایسے کلمات استعمال کرنے سے یا اپنے خلاف بد دعا سے اجتناب کرنا چاہئے۔ اگر ایسے الفاظ استعمال کئے، پھر جھوٹا ثابت ہوا تو گناہگار ہوگا اور اللہ تعالیٰ سے توبہ کرنا چاہئے۔

مشروط قسم

سوال : بعض لوگ قسم کھانے کے ارادہ سے یوں کہہ دیتے ہیں کہ اگر میں یہ کام کروں تو فلاں چیز مجھ پر حرام ہے، یعنی حلال چیز کو اپنے اوپر حرام قرار دے دیا، یا یہ کہ تجھ سے بات کرنا مجھ پر حرام ہے۔

(شمیم وحید، گلشن اقبال۔ کراچی)

جواب : کسی کے کہنے سے حلال چیز حرام تو نہیں ہوتی کہ اشیاء کو حلال و حرام قرار دینے کا حق و اختیار اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے پاس ہے، بندے کے اختیار

میں نہیں ہے تاہم اس سے قسم منعقد ہو جائے گی اور اگر وہ اسے توڑے گا تو کفارہ لازم ہو گا۔

اللہ تعالیٰ سے وعدہ

سوال: میں نے اللہ تعالیٰ سے وعدہ کیا تھا کہ "اے اللہ! اگر میرا فلاں کام ہو گیا، تو میں یہ...... کام کروں گا۔" جب میرا وہ کام ہو گیا تو میں نے اللہ تعالیٰ سے کیے ہوئے کچھ وعدے پورے کیے اور کچھ نہ کر سکا۔ کیا کفارہ ادا کرنا ہو گا؟

(کامران سعید احمد خاں، بفر زون۔ کراچی)

جواب: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْـُٔوْلًا ۝ "اور عہد کو پورا کرو بیشک (قیامت کے دن) عہد کے بارے میں باز پرس ہو گی۔"

(بنی اسرائیل: ۳۴)

اور سورۃ المومنون کی ابتدائی گیارہ آیات میں اہل ایمان کی صفات عالیہ کو بیان کرتے ہوئے آیت نمبر ۸ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۝ "اور جو اپنی امانتوں اور عہد و پیمان کی پاسداری کرتے ہیں۔"

حدیث پاک میں وعدہ شکنی کو منافق کی نشانی بتایا گیا ہے لہٰذا وعدہ بندوں سے کیا گیا ہے یا رب ذوالجلال سے، دونوں صورتوں میں اسے وفا کرنا چاہیے اور جن معاملات میں عہد شکنی ہوئی ہے ان پر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں خلوص دل سے استغفار کریں۔ اس کا کفارہ کوئی نہیں تاہم کسی وعدے کا ایفاء اب بھی ممکن ہو، تو اسے ضرور پورا کریں یہی اس کی تلافی کی صحیح صورت ہے۔

قسم توڑ دے اور کفارہ ادا کرے

سوال: بعض اوقات انسان غصے کے عالم میں اس طرح کی قسم کھالیتا ہے کہ:

۱۔ قسم کھا کر اپنے والدین سے کہتا ہے کہ میں آئندہ آپ کی بات نہیں مانوں گا۔

ب- اپنے کسی بھائی، عزیز یا دوست سے قسم کھا کر کہتا ہے کہ میں آئندہ تم سے ہر گز کلام نہیں کروں گا۔

ج- قسم کھا کر کہتا ہے کہ میں حج نہیں کروں گا یا رمضان کا روزہ نہیں رکھوں گا۔ وغیرہ تو ان تمام صورتوں میں اسے کیا کرنا چاہئے، قسم کو پورا کرے یا توڑ دے۔

(جلیل صدیقی، ناظم آباد)

جواب: اگر کسی شخص نے کسی ایسے کام کے کرنے یا نہ کرنے کی قسم کھائی کہ قسم پر قائم رہنے میں شریعت کی خلاف ورزی لازم آتی ہے، تو اس پر لازم ہے کہ قسم کو فی الفور توڑ دے، شریعت کے مطابق کام کرے اور قسم کا کفارہ ادا کرے۔ حدیث مبارک میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے "ایک شخص کسی بات کی قسم کھا لیتا ہے، پھر اسے احساس ہوتا ہے کہ دینی خیر اور بھلائی اس قسم کے پورا کرنے میں نہیں بلکہ اس کے بر عکس کام کرنے میں ہے، تو اسے چاہئے کہ ایسی قسم کو توڑ دے اور اس کا کفارہ ادا کرے اور وہ کام کرے جس میں دینی اور اخروی خیر اور فلاح ہے۔"

سوال میں مذکور قسم کی تمام صورتیں ایسی ہیں، جن پر قائم رہنا شرعاً ممنوع ہے۔ مثلاً:

۱- والدین کی اطاعت سے انکار حرام ہے اور قطعِ رحمی ہے۔

۲- تین دن سے زیادہ کسی دینی بھائی سے ترکِ تکلم اور ترکِ تعلق ناجائز ہے اور کسی قرابت دار سے ترکِ تعلق قطعِ رحمی کا بھی سبب ہے۔

۳- بلا عذرِ شرعی ان امور کا تارک فاسق اور گناہ کبیرہ کا مرتکب ہے۔

لہٰذا ان تمام صورتوں میں شرعاً ضروری ہے کہ قسم فوراً توڑ دے اور والدین کی اطاعت پر کمر بستہ ہو جائے۔

اپنے بھائی، عزیز یا دوست سے تجدید تعلق کرے، حج اور روزے کی ادائیگی کا التزام کرے اور قسم کا کفارہ ادا کرے۔

قسم توڑنا

سوال: ایک شخص نے آئندہ کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کے بارے میں قسم کھائی اور

پھر اس کے خلاف کیا، یعنی قسم کو توڑ دیا، ایسی قسم کا کیا کفارہ ہے؟
(خلیل احمد عباسی، لانڈھی)

جواب: ایسی قسم کو اصطلاحِ شریعت میں ''یمینِ منعقدہ'' کہتے ہیں۔ اگر اس قسم کے پورا کرنے اور اس پر قائم رہنے میں کوئی شرعی قباحت لازم نہ آتی ہو، تو حتی الامکان اسے پورا کرنا چاہیے، تاہم اگر کسی کمزوری یا مجبوری کے تحت اس سے عہدہ بر آنہ ہو سکے اور اسے توڑ دے تو فقہی اصطلاح میں اسے ''حانث'' ہونا کہتے ہیں۔ اس کی تلافی کیلئے کفارہ ادا کرنا چاہئے اور ایسی قسم کا کفارہ قرآن مجید میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے اور وہ یہ ہے:

دس مسکینوں کو اپنے اوسط معیار کے مطابق دو وقت کا کھانا کھلانا یا دس مسکینوں کو لباس فراہم کرنا اور اگر اس کی استطاعت نہ رکھتا ہو تو تین دن کے روزے رکھنا۔

جھوٹی قسم

سوال: ایک شخص کسی گزشتہ واقعہ کے بارے میں جان بوجھ کر جھوٹی قسم کھاتا ہے۔ اس قسم کا کفارہ کیا ہے؟
(شاہد خاں۔ کراچی)

جواب: قصداً جھوٹی قسم کھانا گناہ کبیرہ ہے۔ اصطلاحِ شریعت میں ایسی قسم کو ''یمینِ غموس'' کہتے ہیں۔ اس جھوٹی قسم کا کوئی کفارہ نہیں ہے۔ اس گناہ کی تلافی اور اس کے اخروی عذاب سے بچنے کی ایک ہی امکانی صورت ہے کہ انسان صدقِ دل سے اپنے گناہ پر نادم ہو اور اللہ تعالیٰ سے توبہ واستغفار کرتا ہے۔

وعدہ کے وقت ان شاء اللہ کہنا

سوال: جب وعدہ کے وقت ان شاء اللہ کہا جاتا ہے تو لوگ کہتے ہیں کہ یہ وعدہ پورا نہیں ہو گا کیا ایسا کہنا درست ہے؟
(گوہر رحمان، بفر زون۔ کراچی)

جواب: قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَا تَقُولَنَّ لِشَایْءٍ اِنِّی فَاعِلٌ ذٰلِکَ غَدًا ۝ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰہُ

''اور کسی کام کی بابت یہ ہرگز نہ کہنا کہ میں کل یہ کام کرنے والا ہوں مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ چاہے'' (الکہف: ۲۴،۲۳)

اس ارشادِ ربانی کا مقصد یہ ہے کہ انسان آئندہ کسی کام کے کرنے نہ کرنے کا ارادہ ظاہر کرے یا عزم کرے تو ساتھ ان شاء اللہ بھی کہہ دیا کرے، یعنی اپنے ارادے کو اللہ تعالیٰ کی مشیت سے وابستہ کرے کیونکہ ہر بات اور ہر کام مشیت الٰہی کے تابع ہے۔ الغرض ان شاء اللہ کہنا اپنے ارادے کو روبہ عمل لانے کیلئے اخلاصِ نیت کا اظہار ہے اور اس بات پر ایمان وایقان کا ثبوت ہے کہ ہر چیز اللہ تعالیٰ کی قدرت اور مشیت کے تابع ہے۔ گویا ان شاء اللہ کہنے والا یہ بتانا چاہتا ہے کہ میرا یہ کام کرنے کا پختہ ارادہ ہے۔ لیکن اگر اللہ تعالیٰ کی مشیت اس کے برعکس ہوئی تو پھر میں بے بس ہوں۔ ان شاء اللہ کہنے والے کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی توفیق بھی شاملِ حال ہو جاتی ہے۔ جو لوگ کسی بات کا وعدہ بھی کریں ساتھ ہی ان شاء اللہ بھی کہیں لیکن کہنے والے یا سننے والے کی نیت یہ ہو کہ چونکہ ان شاء اللہ کہہ دیا ہے اس لئے یہ کام نہیں ہوگا یا کہنے والا اس وعدے کو پورا نہیں کرے گا تو یہ ان شاء اللہ کی غلط تعبیر ہے۔ یہ سوچ گمراہانہ ہے ایسی سوچ سے توبہ کرنی چاہئے البتہ اگر کوئی شخص کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کی قسم کھائے لیکن متصلاً ان شاء اللہ بھی کہہ دے (مثلاً یہ کہ اللہ تعالیٰ کی قسم میں کل ان شاء اللہ آؤں گا) تو یہ قسم شرعاً معتبر نہیں ہوگی اور اس کے ٹوٹنے سے کفارہ لازم نہیں آئے گا۔

وعدہ معاف گواہ کا حکم

سوال: کسی جرم میں شریک ہو کر بعد میں وعدہ معاف گواہ بن جانا، اسلام کی رو سے اس کی کیا حیثیت ہے؟

جواب: جرم کا ارتکاب، جرم کی نوعیت کے اعتبار سے معیوب اور مذموم فعل ہے البتہ اعترافِ جرم کرنا اور اپنے آپ کو شرعی سزا اور اپنے کئے ہوئے فعل کی تلافی کیلئے پیش کرنا اچھی بات ہے اس کو حقیقی معنی میں "توبہ" کہتے ہیں۔ آج کل ایک اصطلاح "وعدہ معاف گواہ" یا "سلطانی گواہ" کی ہمارے ہاں رائج ہے، ہمارے ملک میں مروجہ ضابطہ قانون اس کی اجازت بھی دیتا ہے اور اسے تسلیم بھی کرتا ہے۔ اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ کوئی شخص کسی جرم میں شریک ہے اس شرط کے ساتھ قانون نافذ کرنے والے اداروں کے سامنے بطور گواہ پیش ہو کر جرم کے ثبوت پیش کرتا ہے اور خود بھی اعترافِ جرم کرتا ہے کہ اسے سزا سے بری کر دیا

جائے گا، چونکہ مروجہ قانون حاکمِ مجاز کو اس گواہی کے قبول کرنے اور شریکِ جرم گواہ کو معاف کرنے کی اجازت دیتا ہے، لہٰذا جرم کے ثبوت کیلئے اس کی گواہی قبول کر لی جاتی ہے اسے سزا سے بری کر دیا جاتا ہے، اس کو "وعدہ معاف گواہ" یا "سلطانی گواہ" کہتے ہیں۔

اب رہا یہ سوال کہ اسلام میں اس گواہی کی حیثیت کیا ہے؟ اور آیا حاکم مجاز کو اس کا شرعاً اختیار حاصل ہے؟۔ اگر ایسا شخص کسی کے قتل کے جرم میں شریک ہے یا ایسے جرم کے ارتکاب میں شریک ہے، جس کے نتیجے میں اس پر اسلامی قانونِ قصاص یا اسلامی حدود کا اطلاق ہوتا ہے اور جرم شرعاً ثابت ہو جاتا ہے، تو حاکم و قاضی کو ثبوتِ جرم کے بعد حدودِ الٰہیہ میں معافی کا اختیار نہیں ہے اور قصاص میں مطلقاً معافی یا دیت لے کر مصالحت کا اختیار مقتول کے ورثاء کو ہے یا خود مجروح کو، حاکم و قاضی کو یہ اختیار حاصل نہیں ہے۔ ایسے جرائم جن کی سزا شریعت نے مقرر نہیں کی اور اسے حاکمِ وقت کے صوابدید پر چھوڑ دیا ہے، تعزیری جرائم کہلاتے ہیں۔ ان میں عام حالات میں بھی حاکم و قاضی کو سزا میں کمی بیشی کا اختیار ہوتا ہے، لہٰذا اگر حاکم یا قاضی ایسے امور، جن میں ثبوتِ جرم کے بعد حاکم کسی شریکِ جرم شخص کو "بصورتِ اعترافِ جرم" سزا میں تخفیف اور رعایت دے دے تو وہ اس کا مجاز ہے۔ اس میں کم از کم ہر دور کے اہلِ اقتدار کیلئے عبرت کا ایک سامان تو ہے کہ وہ اپنے جن ماتحتوں پر اعتماد کر کے انہیں جرم کے ارتکاب پر آمادہ کرتے ہیں اور خلافِ قانون احکام کی بجا آوری کا انہیں حکم دیتے ہیں، تو کل ایسا وقت بھی آسکتا ہے کہ یہ لوگ اس کے خلاف گواہ بن کر آجائیں اور اسے اپنے کئے کی سزا بھگتنی پڑے۔ لیکن ایسے شریکِ جرم وعدہ معاف گواہوں کی سزا میں تخفیف تو حکمت کی بناء پر کر لینا بر سبیل تنزلی قابل قبول ہو سکتا ہے لیکن بالکل سزا سے بری کر دینا حکمت کے منافی ہے، کیونکہ اس طرح تحفظ کا یقین انہیں بآسانی قانون شکنی اور ارتکاب جرم پر آمادہ کر سکتا ہے۔ اس کی ضرورت بعض فنی نوعیت کے محکمانہ کاموں یا اہلِ اقتدار کے پر اسرار نوعیت کے ظالمانہ جرائم کی تحقیق کیلئے پیش آسکتی ہے، کیونکہ ان معاملات تک سرکاری عمالِ حکومت کے علاوہ عام لوگوں کی رسائی نہیں ہوتی۔

☆...☆...☆



نام رکھنے کا طریقہ

سوال: قرآن مجید سے نام رکھنے کا طریقہ کیا ہے؟ شریعت میں اس کی کیا حیثیت ہے؟
(عبداللطیف قادری، مظفر آباد، آزاد کشمیر)

جواب: قرآن مجید سے نام رکھنے کی شریعت میں کوئی اصل نہیں ہے، یہ ایک جاہلانہ تصور ہے۔ احادیثِ مبارکہ میں بچوں کے نام رکھنے کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کے جو ارشادات منقول ہیں۔ ان میں سے چند یہ ہیں:

۱- تم قیامت کے روز اپنے اور اپنے باپ کے نام سے پکارے جاؤ گے، تو (تمہیں چاہئے کہ) اچھے نام رکھو۔

۲- انبیائے کرام کے ناموں پر اپنے نام رکھو اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے محبوب نام "عبداللہ" اور "عبدالرحمٰن" ہیں اور سب سے سچے نام "حارث" اور "ہمام" ہیں اور برے "حرب" اور "مُرہ" ہیں۔

۳- میرے نام (یعنی محمد اور احمد) پر اپنے نام رکھو اور میری کنیت (یعنی ابو القاسم) پر اپنی کنیت نہ رکھو۔ اس حدیث کی تشریح میں علماء کے دو اقوال ہیں، ایک یہ کہ رسول اللہ ﷺ کے نام اور کنیت کو یکجا کر کے کسی کا نام نہ رکھو، جیسے "ابو القاسم محمد"، یا یہ کہ حضور ﷺ کا نام رکھنا، آپ کی "حیات ظاہری" میں منع تھا تا کہ بلانے میں اشتباہ نہ ہو، آپ کے وصال کے بعد منع نہیں ہے۔

۴- حضرت عمر کی ایک بیٹی کا نام "عاصیہ" تھا تو رسول اللہ ﷺ نے اسے بدل کر "جمیلہ" رکھ دیا۔

مطلب یہ کہ نام بامعنی ہونے چاہئیں اور ان سے اچھے معانی نکلتے ہوں۔

"عبداللہ"، "عبدالرحمٰن" اور اس طرح کے نام، جن سے اللہ تعالیٰ کی ذات سے "بندگی" کی نسبت ظاہر ہوتی ہو، اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ ہیں۔ لیکن ایسے شخص کو پھر نام توڑ کر

نہیں پکارنا چاہئے، مثلاً کسی کا نام عبدالرحمٰن، عبدالغفار، عبدالستار، عبدالجبار وغیرہ ہے تو لوگ بعض اوقات انہیں "رحمٰن صاحب"، "غفار صاحب"، "ستار صاحب" اور جبار صاحب کہہ کر پکارتے ہیں۔ رحمٰن، غفار، ستار اور جبار تو اللہ تعالیٰ کے صفاتی نام ہیں اور ہر وہ نام جس میں اللہ تعالیٰ کے اسم ذات یا اسماء صفات کے ساتھ عبد کی اضافت لگائی گئی ہو، ہمیشہ پورا لینا چاہئے۔ حضور ﷺ کے اسم مبارک پر نام رکھنا مستحسن ہے۔

نام تبدیل کرنا

سوال: بعض اوقات بچہ بڑا ہو جاتا ہے، اکثر بیمار رہتا ہے یا لڑکی کے رشتے نہیں آتے یا رشتے کی بات بنتے بنتے بگڑ جاتی ہے تو بعض عامل قسم کے لوگ مشورہ دیتے ہیں کہ نام کا اثر ہے، نام تبدیل کر دو، تو سوال یہ ہے کہ کیا شخصیت پر نام کا اثر ہوتا ہے، اس کے نیک یا بد اثرات مرتب ہوتے ہیں اور اگر بڑی عمر میں نام تبدیل کیا جائے تو شریعت میں اس کی گنجائش ہے؟

(کامران قریشی، گلستان جوہر۔ کراچی)

جواب: نام کے شخصیت پر اثر انداز ہونے یا نیک و بد اثرات مرتب ہونے کی شریعت میں کوئی اصل نہیں ہے۔ تاہم احادیث میں نبی کریم ﷺ سے بچوں کے نام رکھنے کے بارے میں چند اصول ثابت ہوتے ہیں اور وہ یہ ہیں۔

۱۔ اچھا نام رکھنا نیک فال ہے اور اس کا حضور ﷺ نے استحباباً حکم بھی فرمایا۔ حضرت ابوالدرداء بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "تمہیں قیامت کے دن تمہارے اپنے اور تمہارے باپوں کے ناموں سے (یعنی ابن فلاں کہہ کر) پکارا جائے گا لہٰذا (اپنے بچوں کے) اچھے پیارے نام رکھو" (مسند احمد و سنن ابی داؤد بحوالہ مشکوٰۃ)۔ حضرت عبداللہ بن عمر بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "تمہارے

ناموں میں سے جو نام اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ محبوب ہیں، وہ عبداللہ اور عبدالرحمٰن ہیں۔" (مشکوٰۃ بحوالہ صحیح مسلم)۔ سنن ابی داؤد کی ایک روایت ہے کہ "سب سے سچے نام حارث اور ہمام ہیں۔"

۲۔ جس نام کے معنی بُرے ہوں، اس پر مطلع ہونے پر اسے بدل دینا چاہئے۔ حضرت عبداللہ بن عمر بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر کی ایک بیٹی کا نام "عاصیہ" (نافرمان) تھا تو رسول اللہ ﷺ نے اسے بدل کر "جمیلہ" رکھ دیا (مشکوٰۃ بحوالہ صحیح مسلم)۔ لہٰذا معنی کے اعتبار سے بُرے نام کو تبدیل کرنا مستحب ہے۔

۳۔ جن ناموں سے تکبر، تعلّی یا پارسائی اور پندارِ نفس کا تاثر ابھرتا ہو یا جو الوہی صفات پر مشتمل ہوں، ان کو رسول اللہ ﷺ نے پسند نہیں فرمایا چنانچہ آپ نے "ملک الاملاک"، "شہنشاہ"، "ابوالحکم" ایسے ناموں کو ناپسند فرمایا۔ ایک شخص اپنے قبیلے کے لوگوں کے معاملات کا فیصلہ کیا کرتا تھا اور قبیلے کے لوگ اس کے فیصلوں کو برضا و رغبت تسلیم کرلیا کرتے تھے۔ حضور انور ﷺ نے ان کے اس عمل کی تحسین فرمائی لیکن اس بناء پر جوان کا نام "ابوالحکم" پڑ گیا تھا، اسے آپ ﷺ نے ناپسند کرتے ہوئے فرمایا: (حقیقی) حکم اور حاکم اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے اور ان کے بڑے بیٹے کی نسبت سے ان کا نام "ابوشریح" رکھ دیا۔

۴۔ بعض ناموں میں اپنے معنی کے اعتبار سے نیک شگون ہوتا ہے، جیسے اَفلَح (بہت زیادہ کامیاب)، یعلیٰ (بلند)، نافع، نجیح (کامیاب)، برکت، اسلام وغیرہ۔ ان ناموں کو رسول اللہ ﷺ نے اس لئے ناپسند فرمایا کہ کوئی شخص آکر پوچھے گا۔ برکت ہے؟ یا اسلام ہے؟ یا اَفلَح، نجیح، نافع ہے تو آگے سے جواب ملے گا: برکت چلا گیا، اسلام چلا گیا، نافع نہیں ہے وغیرہ۔ اور اس سے ذہن پر اچھا اثر مرتب نہیں ہوتا۔ لیکن یہ ممانعت مکروہ تنزیہی کے درجے میں ہے۔

۵۔ اسلام میں بدشگونی، بدفالی وغیرہ کا کوئی تصور نہیں ہے۔ بیماری، پریشانی اور مشکل میں بس اللہ تعالیٰ سے دعا کرنی چاہئے۔

عبدالنبی نام

سوال: میرا نام عبدالنبی ہے، لوگ کہتے ہیں کہ اپنا نام بدلو، کیا یہ نام ناجائز ہے؟

(عبدالنبی، کورنگی۔ کراچی)

جواب: قرآن مجید میں لفظ "عبد" کا اطلاق پانچ قسم کے لوگوں پر کیا گیا ہے۔ ان میں سے ایک غلام اور مملوک پر عبد کا اطلاق کیا گیا ہے۔ جیسے سورۃ البقرہ آیت ۱۷۸ میں فرمایا:

وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ۔ (ترجمہ) "عبد (غلام) کے بدلے میں (بطور قصاص) عبد (غلام کو قتل کیا جائے)"

سورۃ النحل آیت نمبر ۷۵ میں فرمایا:

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلاً عَبْدًا مَّمْلُوْکًا لَّا یَقْدِرُ عَلٰی شَیْءٍ۔ (ترجمہ) "اللہ تعالیٰ عبد مملوک (غلام) کی مثال بیان فرماتا ہے، جس کو کسی چیز پر قدرت واختیار نہیں ہے۔"

اسی طرح سورۃ النور آیت نمبر ۳۲ میں عبد کی نسبت اس کے مالک کی طرف کرتے ہوئے فرمایا:

وَاَنْکِحُوا الْاَیَامٰی مِنْکُمْ وَالصّٰلِحِیْنَ مِنْ عِبَادِکُمْ وَاِمَآئِکُمْ۔ (ترجمہ) "تم اپنے (بے نکاح) آزاد مردوں اور عورتوں کا نکاح اپنے نیک عباد (غلاموں) اور باندیوں کے ساتھ کرو۔"

ان آیات مبارکہ میں عبد کی نسبت مخلوق (یعنی اس کے مالک) سے کی گئی ہے۔

حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "تم میں سے کوئی شخص یہ نہ کہے کہ میرا بندہ (عبدی) اور میری باندی (اَمَتِی)، (حقیقت یہ ہے کہ) تم سب اللہ تعالیٰ کے بندے ہو اور تمہاری سب عورتیں اللہ تعالیٰ کی باندیاں ہیں، بلکہ (بہتر یہ ہے کہ)

یوں کہو کہ میرا غلام، میری خادمہ، میرا خادم، اور غلام (عبد) بھی اپنے آقا کو میرا رب نہ کہے بلکہ میرا سردار (سیدی) کہے۔"

ان آیات واحادیث سے "عبدالنبی" اور "عبدالرسول" کا صریح جواز ثابت ہوتا ہے۔ علامہ بدرالدین عینی حنفی نے لکھا ہے کہ کسی شخص کیلئے اپنے غلام کو میرا عبد کہنا جائز ہے اور حدیث میں جو ممانعت ہے یہ مکروہ تنزیہی کے درجے میں ہے، حرام نہیں ہے۔ علامہ ابن عابدین شامی نے علامہ دمیری شافعی کا قول نقل کیا ہے کہ نسبت کا شرف حاصل کرنے کیلئے کوئی شخص "عبدالنبی" نام رکھے تو جائز ہے، لہٰذا اسے زیادہ سے زیادہ خلافِ اولیٰ کہا جاسکتا ہے۔ امام احمد رضا خان بریلوی نے لکھا ہے کہ بعض متاخرین نے جو "عبدالنبی" کو مکروہ کہا ہے، یہ بھی نام رکھنے کی حد تک ہے، نسبت کا شرف حاصل کرنے کیلئے کوئی کہے تو یہ بلاشبہ جائز ہے۔ جو لوگ عبدالنبی، عبدالرسول اور عبدالمصطفیٰ نام رکھنے کو کفر و شرک، بدعت یا گمراہی کہتے ہیں، یہ محض دین میں غلو ہے اور قرآن کے اطلاقات کو نظر انداز کرنے کے مترادف ہے۔

"پرویز" اور "قیصر" نام رکھنا

سوال: (ا) بعض مسلمان پرویز اور قیصر نام رکھتے ہیں، ان کے کیا معنی ہیں۔ کیا یہ نام رکھنا جائز ہے؟ "عزیر" کے کیا معنی ہیں؟

(ب) کیا بچوں کا نام رکھنے کیلئے تاریخ، ستارے اور برج کا حساب معلوم کرنا ضروری ہے؟ (عبدالحمید، فیڈرل بی ایریا۔ کراچی)

جواب: (ا) "پرویز" کے معنی ہیں "نہایت اعلیٰ" مہذب، فاتح، بلند اختر، عزیز، ارجمند وغیرہ اور "قیصر" لاطینی زبان میں اس بچے کو کہتے ہیں جو ابھی ماں کے پیٹ میں ہو اور ماں فوت ہو جائے اور اسے پیٹ چیر کر یعنی آپریشن کر کے نکالا جائے، روم کا اول بادشاہ "اغسطوس" بھی اسی طرح پیدا ہوا تھا، لیکن بعد میں وہ خوش نصیب ثابت ہوا۔ پرویز "خسرو ثانی" شاہ ایران کا لقب تھا اور اس طرح روم کے بادشاہوں کا لقب "قیصر" قرار پایا۔ لہٰذا پرویز اور قیصر کے معنی میں تو کوئی خرابی

نہیں ہے، لیکن چونکہ یہ غیر مسلم بادشاہوں کے امتیازی لقب تھے اس لئے بہتر یہ ہے کہ یہ نام نہ رکھے جائیں، کیونکہ نام میں نسبت کا بھی اعتبار ہوتا ہے۔
"عزیر" انبیائے بنی اسرائیل میں ایک مقدس نبی کا نام ہے، جنہیں یہودیوں نے اللہ تعالیٰ کا بیٹا قرار دیا تھا کسی نبی مقدس کے نام پر نام رکھنا ہو تو نسبت کا اعتبار ہوتا ہے۔

(ب) بچے کے نام کیلئے تاریخ پیدائش، ستاروں اور برجوں کا جاننا ضروری نہیں ہے، بس اسلام کی تعلیمات فقط اتنی ہیں کہ نام بامعنی اور انبیائے کرام علیہم السلام یا اللہ تعالیٰ کے محبوب بندوں کے نام پر ہو تو نسبت کی برکت بھی حاصل ہوگی۔

☆...☆...☆




سیرت

تاریخ ویوم ولادت سید المرسلین ﷺ

سوال : حضور نبی کریم ﷺ کی ولادت باسعادت کس دن اور کس تاریخ کو ہوئی ؟

(محمد سہیل، نارتھ کراچی)

جواب : جمہور علماء امت کے نزدیک ختم المرسلین محمد مصطفیٰ ﷺ کی ولادت باسعادت پیر بارہ ربیع الاول عام الفیل میں ہوئی اس پر قرون اولیٰ سے امت کا تعامل رہا ہے اور اس پر تقریباً اجماع ہے۔ جسٹس علامہ پیر محمد کرم شاہ الازہری نے اپنی سیرت کی مشہور عالم تصنیف "ضیاء النبی" صفحات ۳۳ تا ۴۱ میں اس موضوع پر مدلل اور مفصل بحث کی ہے اور تاریخ طبری اور تاریخ ابن خلدون، سیرت ابن ہشام، مدارج النبوۃ، اعلام النبوۃ، محمد رسول اللہ ﷺ، الوفا ابن جوزی، عیون الاثر اور مصنف ابن ابی شیبہ حوالہ سیرۃ ابن کثیر، الشمامۃ العنبریہ مولد خیر البریہ اور سیرۃ خاتم النبیین کے حوالہ جات سے اسے ثابت کیا ہے۔ اور علامہ شبلی نعمانی اور قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری نے جو ماہر فلکیات محمود پاشا یا اور دیگر ماہرین تقویم پر اعتماد کر کے ۹ ربیع الاول تاریخ ولادت مصطفیٰ ﷺ بتائی ہے، اس کا رد کیا ہے اور بتایا کہ حدیث مرفوع کے مقابلے میں ان اقوال کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ جہاں تک یوم ولادت کا تعلق ہے تو وہ صحیح مسلم اور دیگر احادیث کے مطابق قطعی طور پر پیر کا دن ہے۔

نبی کریم ﷺ کے نام کے ساتھ (ؐ) لکھنے پر اکتفا کرنا

سوال : ہماری مس نے بتایا کہ بعض لوگ جو رسول اللہ ﷺ کے اسم مبارک کے ساتھ جگہ بچانے یا وقت کی قلت کے سبب تخفیف کر کے ﷺ کے بجائے (ؐ) لکھ دیتے ہیں، یہ جائز نہیں ہے حالانکہ ہمارے ہاں یہ رواج عام ہے اکثر جگہ میں نے مذہبی کتابوں میں بھی لکھا ہوا دیکھا ہے، شرعی مسئلہ کیا ہے ؟ (ماہ نور، نارتھ کراچی)

جواب : رسول اللہ ﷺ پر صلوٰۃ و سلام بھیجنا اہل ایمان پر اللہ تعالیٰ کا حکم ہے اور آپ پر صلوٰۃ بھیجنا اللہ تبارک و تعالیٰ اور ملائکہ کی سنت جلیلہ ہے۔ جو مومن حضور انور ﷺ کا اسم مبارک سن کر آپ پر ہدیہ درود نہ بھیجے اس کیلئے حدیث مبارک

میں بڑی وعید آئی ہے۔ اکابرِ امت نے درود اور فضائل درود پر مستقل کتابیں تصنیف کی ہیں جب تحریر ار سول اللہ ﷺ کا ذکر مبارک آئے تو ہر بار "ﷺ" پورا لکھا جائے اس کو تخفیف کر کے (ص) لکھنا حرام اور ناجائز ہے۔ علامہ سید احمد طحطاوی حنفی نے "حاشیہ الطحطاوی علی الدر المختار صفحہ ۵ پر فتاویٰ تاتار خانیہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ جو شخص سید الانبیاء کی تخفیف کے ارادے سے ایسا کرے تو اس سے کفر لازم آتا ہے۔ بہر کیف احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ اس سے مکمل اجتناب کیا جائے، اس طرح "صلعم" لکھنا بھی منع ہے۔ اسی طرح رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے بجائے (رح) اور رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بجائے (رض) لکھنا بھی جائز نہیں ہے۔

حضرت خضر علیہ السلام کون ہیں؟

سوال: حضرت خضر علیہ السلام کون ہیں؟ نبی یا ولی، زندہ ہیں یا وفات پا چکے ہیں؟

(محمد ناصر خان چشتی، بفر زون، نارتھ کراچی)

جواب: اصل لفظ "خَضِر" (خ کی زبر اور ض کی زیر کے ساتھ) ہے، بعض اہل سیرت و تاریخ نے "خِضْر" (خ کی زیر اور ض کے سکون کے ساتھ) اور "خضرون" بھی نقل کیا ہے۔ مشہور یہ ہے کہ یہ ان کا وصف ہے، کیونکہ اس کے معنی ہیں: سبز، ہرا، سبز ترکاری، بہت سرسبز وشاداب جگہ۔ وجہ تسمیہ یعنی اس نام کے ساتھ معروف ہونے کے بارے میں بھی کئی اقوال ہیں: (۱) ان کے حسن وجمال کی وجہ سے یہ نام رکھا گیا، (۲) یہ کہ وہ جس زمین پر بیٹھتے، اس پر سبزہ اگ آتا، (۳) سفید گھاس یا بالوں کی چادر پر انہوں نے نماز پڑھی تو وہ ہری ہوگئی، (۴) یہ کہ حضرت موسیٰ اور یوشع علیہما السلام جب ان کی تلاش میں اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے آثار وعلامات کی روشنی میں پلٹ کر آئے تو انہوں نے اسے سطح سمندر پر سبز چادر پر نماز پڑھتے ہوئے دیکھا، وغیرہ۔ یہ سب اقوال حافظ عماد الدین ابن کثیر نے "البدایہ والنہایہ" میں نقل کئے ہیں اور زیادہ راجح بات یہ ہے کہ خضر ان کا اصل نام نہیں بلکہ لقب یا صفاتی نام تھا، یہ الگ بات ہے کہ بعض شخصیات کے القاب اصل نام سے زیادہ مشہور ہو جاتے ہیں۔ ابن کثیر نے وھب بن منبہ کی روایت سے ان کا نام ونسب یہ بتایا ہے:

ایلیا بن ملکان بن فالغ بن عابر بن شالخ بن ار فخشد بن سام بن نوح علیہ السلام۔ انہوں نے نام کے بارے میں اور بھی اقوال نقل کئے ہیں، مثلاً المعمر، امریا، ارمیاہ، الیسع وغیرہ۔ ان کے بارے میں محدثین اور اہل سیرت و تاریخ اور اہل تصوف کے کئی اقوال وروایات ہیں: مثلاً (۱) یہ کہ وہ نبی تھے (۲) وہ ولی تھے (۳) وہ وفات پا چکے ہیں (۴) وہ اب تک زندہ ہیں (۵) ان کا تعلق نوع انسانی سے نہیں، وہ فرشتہ تھے۔ سب کے اپنے اپنے دلائل ہیں اور سب نے فریق مخالف کے دلائل کا جواب بھی دیا ہے اور رد بھی کیا ہے۔ ہم بطور نمونہ صحیح مسلم کے شارح علامہ یحییٰ بن شرف الدین نووی کی رائے نقل کرتے ہیں: "جمہور علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ حضرت خضر زندہ ہیں اور ہمارے ہاں موجود ہیں، یہ امر صوفیاء اور عرفاء کے درمیان متفق علیہ ہے اور صوفیاء کی حضرت خضر کو دیکھنے، ان سے ملاقات کرنے، ان سے علم حاصل کرنے اور ان سے سوال وجواب کے متعلق حکایات مشہور ہیں۔ اور مقدس مقامات اور مواضع خیر میں ان کے موجود ہونے کے متعلق بے شمار واقعات ہیں۔" امام بخاری حضرت خضر اور حضرت الیاس کی حیات کے قائل نہیں ہیں، وہ اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جو لوگ اب روئے زمین پر زندہ ہیں ایک سو سال بعد ان میں سے کوئی زندہ نہیں رہے گا۔" صحیح مسلم میں بھی یہ روایت ہے اور اس میں روئے زمین کی قید نہیں ہے بلکہ مطلق ارشاد ہے۔ جو لوگ حیات خضر کے منکر ہیں، وہ قرآن مجید کی اس آیت سے بھی استدلال کرتے ہیں:

وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ ۖ أَفَإِنْ مِّتَّ فَهُمُ الْخٰلِدُوْنَ ○ كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ۗ

"اور ہم نے آپ سے پہلے کسی بشر کیلئے (اس دنیا میں) ہمیشہ رہنا مقدر نہ کیا، پس اگر آپ کی وفات ہو جائے تو کیا یہ لوگ یہاں ہمیشہ رہیں گے، ہر جان کو موت کا (مزہ) ضرور چکھنا ہے"

(الانبیاء: ۳۴، ۳۵)

جو لوگ حیات خضر کے قائل ہیں، وہ کہتے ہیں کہ انہوں نے آب حیات پی لیا تھا۔ قرآن مجید کی سورۃ الکہف میں نام کے بغیر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حوالے سے (ایک

خاص سیاق وسباق، (Context) حضرت خضر کا تفصیلی ذکر ہے۔ مفسرین کرام کا اس پر اجماع ہے کہ اس سے حضرت خضر ہی مراد ہیں، ہم اختصار کی بناء پر صرف چند آیات کا ترجمہ درج کرتے ہیں:

فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَآ اٰتَيْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا○ قَالَ لَهٗ مُوْسٰى هَلْ اَتَّبِعُكَ عَلٰٓى اَنْ تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا○ قَالَ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا○ وَكَيْفَ تَصْبِرُ عَلٰى مَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ خُبْرًا○

"تو انہوں نے ہمارے بندوں میں سے ایک بندے (خضر) کو پایا، جسے ہم نے اپنے پاس سے رحمت دی اور اسے اپنا "علم لدنی" سکھایا، موسیٰ نے ان سے فرمایا: کیا میں اس شرط پر آپ کے ساتھ رہوں کہ آپ مجھے سکھادیں گے اس سے جو بھلائی پانے کا علم آپ کو دیا گیا، انہوں نے فرمایا: بیشک آپ ہرگز میرے ساتھ صبر نہ کر سکیں گے اور آپ اس چیز پر کس طرح صبر کریں گے جس کا اپنے علم سے آپ نے احاطہ نہیں کیا"

(الکہف: ۶۵ تا ۶۷)۔

اس تمہید کے بعد قرآن وحدیث اور تاریخ وسیرت کے دستیاب علمی مواد کی روشنی میں ہمارے نزدیک ان اکابر مفسرین کی رائے ہی قابل ترجیح ہے، جنہوں نے حضرت خضر کی نبوت کا قول کیا ہے، کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

فَانْطَلَقَا حَتّٰٓى اِذَا لَقِيَا غُلٰمًا فَقَتَلَهٗ قَالَ اَقَتَلْتَ نَفْسًا زَكِيَّةًۢ بِغَيْرِ نَفْسٍ لَقَدْ جِئْتَ شَيْـًٔا نُّكْرًا○

"پھر وہ دونوں (حضرت موسیٰ وخضر) چل پڑے یہاں تک کہ جب وہ ایک لڑکے سے ملے تو اس (خضر) نے اسے قتل کردیا، موسیٰ نے فرمایا کہ کیا آپ نے ایک بے قصور شخص کی جان، کسی جان کے بدلے (یعنی قصاص) کے بغیر لے لی، بیشک آپ نے بہت برا کام کیا۔"

(الکہف: ۷۴)

تشریعی طور پر یعنی قانون شریعت کی رو سے جب تک کوئی شخص کسی ایسے جرم کا ارتکاب نہ کرے (جیسے مُرتد ہو جانا، یا ناحق کسی کو قصداً قتل کرنا) جس سے اس کے (بطور قصاص یا حد) قتل کا جواز پیدا ہوتا ہو، قتل کرنا جائز نہیں ہے، نہ ہی اسے اس امکان کے پیش نظر کہ وہ جرم کا ارتکاب کرلے گا، کسی کو پیشگی سزا دی جا سکتی ہے۔ اس کے باوجود حضرت خضر کا اسے قتل کرنا، جس کی حکمت یا سبب انہوں نے آیت نمبر ۸۰ میں آگے چل کر بتایا ہے، اس بات کی دلیل ہے کہ یہ کام انہوں نے اللہ تعالیٰ کے تکوینی امر کے تحت کیا، جس کا حکم انہیں بذریعہ وحی ربانی دیا گیا ہوگا، اسی لئے آگے چل کر آیت نمبر ۸۲ میں ان کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ "یہ کام میں نے اپنے اختیار سے نہیں کیا"، یعنی اللہ تعالیٰ کی وحی والہام کے تعمیل میں کیا ہے، یہ اللہ تعالیٰ کا تکوینی امر تھا، تکوین سے مراد کائنات میں تخلیق وایجاد کے وہ تمام امور جو محض اللہ تعالیٰ کے امر، ارادے اور مشیت سے نافذ ہوتے ہیں۔ اگر کوئی یہ کہے کہ ہو سکتا ہے، وہ ولی ہوں اور اللہ تعالیٰ نے بذریعہ الہام انہیں ان تکوینی امور کا حکم فرمادیا ہو اور انہوں نے تعمیل کی ہو۔ اس اعتراض یا اشکال کا جواب یہ ہے کہ ولی کا الہام ظنی ہوتا ہے، دوسروں کیلئے حجت نہیں ہوتا، جبکہ نبی کی وحی اللہ تعالیٰ کا امر لازمی اور قطعی حجت ہوتی ہے، مزید یہ کہ حضرت موسیٰ وخضر علیہما السلام کے واقعے میں "علم لَدُنّی" میں حضرت خضر کی فضیلت ظاہر ہوتی ہے اور اگر انہیں ولی مانا جائے تو ولی امتی ہوتا ہے اور امتی نبی سے علم میں افضل نہیں ہو سکتا ہے۔ اس مقام پر سید مودودی نے تفہیم القرآن میں لکھا ہے: معلوم ہوتا ہے کہ "حضرت خضر بشر نہیں تھے بلکہ فرشتوں میں سے تھے" اور انہوں نے قرآن میں جو حضرت خضر پر "عبد" یا "رجل" کا اطلاق کیا گیا ہے، اس کی تاویلات کی ہیں کہ غیر بشر پر بھی ان کا اطلاق ہو سکتا ہے اور دلیل یہ دی ہے کہ نبی بشر تشریع کا مکلّف ہوتا ہے اور اس سے بظاہر خلافِ شریعت تکوینی امر کا صدور نہیں ہو سکتا کہ ایک بے قصور لڑکے کو قتل کردیں۔ سید مودودی کا یہ اشکال اور اس کے نتیجے میں خضر کو فرشتہ قرار دینے کا استدلال اس لئے باطل ہے کہ حضرت ابراہیم یقینی طور پر نبی ورسول اور نوع انسانی سے تھے، اس کے باوجود

انہوں نے "ذبح اسماعیل" کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے تکوینی امر کی تعمیل میں کوئی تردد نہیں کیا بلکہ فوراً تعمیل کر دی۔ یہ الگ بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تکمیل ذبح سے پہلے اپنے امر سے انہیں روک دیا۔

رہا یہ سوال کہ آیا حضرت خضر علیہ السلام اب بھی زندہ ہیں یا نہیں؟ دونوں طرف دلائل کا انبار ہے، صوفیاء کرام کے ملاقات خضر کے حوالے سے متعدد مشاہدات، تجربات اور دعوے ہیں۔ لیکن یہ سب ظنی امور ہیں، ہمارے پاس ان کے رد و قبول کا کوئی قطعی پیمانہ نہیں ہے بلکہ ظن غالب قائم کرنا بھی دشوار ہے، کیونکہ قرآن و حدیث اس کے بارے میں ساکت ہیں۔ تاہم عارف باللہ علامہ قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اس مسئلے میں حرف آخر کے طور پر لکھا ہے کہ حضرت مجدد الف ثانی سے جب حیات و وفاتِ خضر علیہ السلام کی بابت دریافت کیا گیا تو انہوں نے مکاشفہ فرمایا، تو کیا دیکھتے ہیں کہ حضرت خضر ان کے سامنے موجود ہیں، آپ نے ان سے ان کی حقیقت حال دریافت کی تو انہوں نے فرمایا کہ میں اور الیاس علیہما السلام زندہ نہیں ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے ہماری روحوں کو یہ قوت عطا فرمائی ہے کہ ہم مجسم ہو جاتے ہیں اور زندوں کے سے کام کرتے ہیں، مثلاً جب اللہ تعالیٰ چاہے تو ہم گمراہ کی رہنمائی کرتے ہیں، مصیبت زدوں کی مدد کرتے ہیں۔ "علم لدنی" کی تعلیم دیتے ہیں، جس کے متعلق اللہ تعالیٰ چاہے روحانی نسبت عطا کرتے ہیں اور اولیاء اللہ میں سے قطب مدار کے معاون و مددگار ہوتے ہیں۔



﴿عورتوں کے متفرق مسائل﴾


Nafse Islam
WWW.NAFSEISLAM.COM

بیٹی کی پیدائش پر اظہار رنج و غم

سوال: بعض لوگ بیٹیوں کی پیدائش کو اپنے لئے باعثِ عار سمجھتے ہیں یا اسے اپنی ذات پر ایک بار سمجھتے ہیں جبکہ بیٹے کی پیدائش کی خبر سن کر وہ کھل اٹھتے ہیں، شریعت کے نزدیک یہ طرزِ فکر کیسا ہے؟ (سارہ مجید، گارڈن ویسٹ۔ کراچی)

جواب: مشرکینِ مکہ کے طرزِ عمل کے بارے میں اللہ تعالیٰ جل شانہ کا ارشاد ہے:

وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ ۝

"اور جب ان میں سے کسی کو بیٹی (کی پیدائش) کی خوشخبری دی جاتی ہے تو (غم کے مارے) اس کا چہرہ سیاہ پڑ جاتا ہے اور وہ غصے سے بھر جاتا ہے۔" (النحل:۵۸)

قرآن مجید کی اس آیت مبارکہ سے معلوم ہوا کہ سوال میں جس طرزِ فکر کا ذکر ہے، وہ مشرکینِ مکہ کا تھا۔ بیٹا ہو یا بیٹی، اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے، باقی رہا یہ سوال کہ مستقبل میں انسان کیلئے بیٹا زیادہ مفید ثابت ہوگا یا بیٹی، اس کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔ سورۃ النساء کی آیت میراث میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ لَا تَدْرُوْنَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا

"تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے تم (خود) نہیں جانتے کہ تم کو نفع پہنچانے کے کون زیادہ قریب ہے" (النساء:۱۱)

ارشادِ رسول ﷺ ہے:

(۱) "جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے بیٹیاں عطا کر کے آزمائش میں ڈالا اور اس نے اللہ تعالیٰ کی نعمت جان کر ان کے ساتھ نہایت اچھا برتاؤ کیا، تو وہ قیامت میں اس کیلئے عذابِ جہنم سے نجات کا وسیلہ بن جائیں گی۔"

(۲) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جس مومن نے دو بچیوں کو پال پوس کر جوان کیا، وہ قیامت کے روز میرے اتنے قریب ہوگا، جیسے ہاتھ کی انگلیاں۔"

...

(۳) آپ ﷺ نے فرمایا "جس کی ایک بیٹی ہو اور وہ اس کی بہترین تعلیم و تربیت کا اہتمام کرے اور اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتوں سے اپنی بیٹی کو خوب نوازے، تو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس بیٹی کو عذابِ جہنم سے نجات کا وسیلہ بنادے گا۔"

شادی شدہ عورت اور چوڑیاں

سوال: کیا شادی شدہ عورت کیلئے چوڑیاں پہننا ضروری ہے؟ بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ سہاگ کی نشانی ہے اور نہ پہننا بیوگی کی علامت ہے؟ (ریاض۔ کراچی)

جواب: چوڑیاں پہننے یا نہ پہننے کا شریعت سے کوئی تعلق نہیں ہے نہ یہ سہاگ کی علامت ہے اور نہ ہی نہ پہننا بیوگی کی علامت ہے، یہ محض رسم و رواج کا حصہ ہے تاہم زیب و زینت کیلئے عورتیں چوڑیاں پہنیں تو کوئی ممانعت نہیں ہے۔

عورتوں کی محفلِ میلاد

سوال: کیا عورتیں محفلِ میلاد میں شرکت کر سکتی ہیں؟ مائیکروفون پر تقریر کرنا اور نعت و سلام پڑھنے کا کیا حکم ہے؟

جواب: خواتین کا چار دیواری کے اندر یا مکمل باپردہ جلسہ گاہ میں دینی اجتماع منعقد کرنا، محفل میلاد میں شرکت کرنا، تقریر کرنا، نعت اور صلوٰۃ و سلام پڑھنا یا تلاوت کرنا، یہ سب امور جائز ہیں بشرطیکہ بے پردگی نہ ہو۔ عورت کی آواز بھی عورت ہے، حدیث پاک میں اسے فتنہ و آزمائش قرار دیا گیا ہے لہٰذا اگر مائیک کی آواز چار دیواری کے اندر تک یا جلسہ گاہ کے اندر تک محدود ہے تو حسبِ ضرورت اس کا استعمال جائز ہے اور اگر یہ آواز غیر محرم مردوں تک پہنچ رہی ہے تو اسے استعمال نہ کیا جائے یا اس کی آواز کی حد کو شرکاء تک محدود رکھا جائے۔

عورتوں کا قبرستان جانا

سوال: کیا عورت قبرستان جاسکتی ہے؟ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ عورت قبرستان میں نہ

جائے کیونکہ وہ مردے کو بے لباس دکھائی دیتی ہے؟

(ریاض الدین، صغیر سینٹر۔ کراچی)

جواب: ابتدائے اسلام میں رسول اللہ ﷺ نے مطلقاً قبرستان میں جانے سے منع فرمایا یعنی سب کو خواہ عورت ہو یا مرد، پھر آپ ﷺ نے فرمایا: ''میں نے (ابتداءً) تمہیں قبرستان میں جانے سے منع کیا تھا مگر اب (میں اجازت دیتا ہوں کہ) وہاں جایا کرو، کیونکہ زیارتِ قبور سے آخرت کی یاد تازہ ہوتی ہے اور دنیا سے بے رغبتی پیدا ہوتی ہے۔'' حدیث کے ظاہری الفاظ سے یہ اجازت عام ہے، مردوں کے ساتھ بظاہر تخصیص کا کوئی قرینہ نہیں ہے، مگر اس کے باوجود فقہائے کرام نے عورتوں کو قبرستان جانے سے اس لئے منع کیا ہے کہ کہیں وہ بے پردہ ہو کر نہ جائیں، غیر محرم مردوں کے سامنے نہ آئیں۔ وہاں جاکر رونا، چلانا شروع نہ کریں، الغرض شریعت کے کسی حکم کی خلاف ورزی نہ ہو اور دُعا و ایصال ثواب تو گھر میں بیٹھ کر بھی کیا جاسکتا ہے۔ علامہ ابن عابدین شامی نے لکھا ہے کہ جوان عورتوں کیلئے تو قبرستان جانا مکروہ ہے، البتہ بوڑھی عورتیں (باپردہ ہو کر شرعی احکام کی پابندی کے ساتھ) جاسکتی ہیں، اگر مقصد عبرت حاصل کرنا ہو، دُعائے مغفرت کرنا ہو یا بزرگانِ دین کے مزارات سے برکت حاصل کرنا مقصود ہو۔

عورتوں کا آپس میں مصافحہ و معانقہ

سوال: بعض عورتیں محافلِ مقدسہ (میلاد، قرآن خوانی، آیت کریمہ وغیرہ) کے بعد فرداً فرداً آپس میں مصافحہ و معانقہ کرتی ہیں، شاید مبارک باد کے طور پر کرتی ہوں، کیا یہ جائز ہے؟

(عطیہ بشیر، نارتھ ناظم آباد)

جواب: عورتوں کا آپس میں ملاقات کے موقع پر یا کسی مسرت و شادمانی کے موقع پر مصافحہ و معانقہ کرنا جائز ہے، اس میں کوئی ممانعت نہیں ہے۔ محافل مقدسہ پر اظہار مسرت بھی جائز ہے۔

عدت کے دوران ٹی وی دیکھنا

سوال : کیا عدت کے دوران ٹی وی دیکھنا جائز ہے ؟ (عبدالرحیم، چاکیواڑہ، کراچی)

جواب : ٹی وی کے جائز یا ناجائز ہونے کا عدت سے کوئی تعلق نہیں ہے، اس کی اچھی چیزیں دیکھنا، مثلاً تلاوت، ترجمہ، نعت، دینی پروگرام، علمی و معلوماتی پروگرام، خبریں وغیرہ دوسروں کے ساتھ "معتدہ" بھی دیکھ سکتی ہے، ناچ گانے، فحش پروگرام، فلمیں، بے ہودہ ڈرامے وغیرہ سب کیلئے منع ہیں۔

خواتین کی تزئین جائز، ناجائز

سوال : آپ نے ۷ ستمبر کے تفہیم المسائل میں بیوٹی پارلر کے کاروبار کو بعض شرائط پر جائز قرار دیا ہے، اس سلسلے میں وضاحتیں مطلوب ہیں، ان کا جواب تحریر کر کے میری الجھن دور کریں۔ (طویل خط کا خلاصہ درج کیا گیا ہے) (صائمہ عثمان روحیلہ)

جواب : (۱) دلہن کا میک اپ جائز ہے، جسے دلہن بنانا کہتے ہیں، بشرطیکہ اس کام میں استعمال ہونے والے کریم پاؤڈر وغیرہ میں کوئی حرام یا ناپاک اجزاء شامل نہ ہوں۔ (۲) چہرے کا مساج بھی جائز ہے۔ (۳) ابرو بنانا اور چہرے کے بال اتارنا (Threading) شرعاً اگرچہ مستحسن نہیں ہے لیکن شوہر کی دلداری کیلئے فقہاء نے اسے مباح قرار دیا ہے۔ (۴) بالوں کو رنگنا یا مہندی لگانا جائز ہے۔ (۵) لمبے بالوں کو برابر کرنے کیلئے ایک دو انچ کاٹنے میں کوئی حرج نہیں ہے کیونکہ اس پر مردوں کے ساتھ مشابہت کرنے یا مردانہ وضع اختیار کرنے کا اطلاق نہیں ہوتا۔ (۶) چھوٹے بچوں کے بال کاٹنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ یہ تمام امور جن کے جواز کا ذکر کیا ہے عورتوں کیلئے مردوں سے کرانا حرام ہے اور ایسی عورتوں سے کرانا بھی منع ہے جو عورتوں کے جسمانی معائب یا محاسن دوسرے مردوں کے سامنے بیان کریں۔ ایسا میک اپ بھی منع ہے جس پر گھنٹوں لگ جائیں اور بیچ میں فرض نمازیں بھی ترک ہو جائیں یا اس میک اپ کو برقرار رکھنے

کیلئے انسان وضو نہ کرے اور اس طرح نمازیں چھوٹ جائیں۔ عورت کا اصل حسن عفت، حیا، پاک دامنی اور حسن سیرت ہے، تقویٰ و طہارت ہے جو خالق کو پسند ہے باقی سب فریبِ نفس اور فریبِ نظر ہے۔

شوہر کو بتائے بغیر خرچ کرنا

سوال: میرا تعلق دعوت اسلامی سے ہے، مجھے شوہر سے ماہانہ ایک لگی بندھی رقم گھر کے خرچ کیلئے ملتی ہے، میں اس میں سے کچھ بچا لیتی ہوں۔ اس بچت میں سے شوہر کو بتائے بغیر اپنے اور بچی کے زیور کی زکوٰۃ دے دیتی ہوں، کبھی کسی کو پارے اور دینی کتابیں لے دیتی ہوں، دعوت اسلامی کے ہفتہ وار اجتماع کیلئے یا محفل میلاد کیلئے بس کے کرائے یا طعام کے اہتمام کیلئے بھی دیتی رہتی ہوں، کیا یہ جائز ہے؟

(نجمہ قادری رضوی۔ کراچی)

جواب: ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جب عورت اپنے گھر کے طعام میں سے (اللہ تعالیٰ کی راہ) میں خرچ کرے لیکن اسراف کئے بغیر، تو اسے بھی اجر ملے گا اور اس کے شوہر کو بھی۔" ایک اور حدیث میں حضرت ابو ہریرہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جب عورت اپنے شوہر کی کمائی سے اس کی اجازت کے بغیر خرچ کرتی ہے (یعنی صدقہ کرتی ہے) تو اسے بھی آدھا ثواب ملے گا۔ ان احادیث کی روشنی میں علماء نے مندرجہ ذیل مسائل بیان فرمائے ہیں:

(۱) عورت کو اجر اس لئے ملے گا کہ عملاً اسی نے صدقہ دیا اور شوہر کو اس لئے کہ وہ کمانے والا ہے اور صدقہ اس کی کمائی سے دیا گیا ہے بلکہ احادیث میں اس کی صراحت بھی ہے، عورت کو اجر ملنے سے شوہر کے اجر میں کمی واقع نہیں ہوگی، کیونکہ اللہ تعالیٰ غنی اور کریم ہے، وہ سب پر مہربان ہے اور اس کے خزانے میں کوئی کمی نہیں۔

(۲) عورت کے کارِ خیر میں خرچ کرنے کے جواز کو فقہاء نے اس پر محمول کیا ہے کہ اسے صراحتاً یا اشارات و کنایات سے معلوم ہو گیا ہو کہ شوہر اس کے اس عمل سے خوش

ہے یا کم از کم ناراض نہیں ہے۔

(۳) زیادہ بہتر یہ ہے کہ وہ اجازت لے یا کبھی کبھی تذکرے کے طور پر بتادیا کرے۔

(۴) اور اگر اسے شوہر نے صراحت سے یا قطعی طور پر ایسا کرنے سے منع کر دیا ہو تو پھر احتیاط سے کام لے البتہ زیورات کی زکوٰۃ فرض ہے، اس کیلئے شوہر سے باقاعدہ اجازت لے یا اسی زیور میں سے دے اگر اس کا کوئی ذریعہ آمدن نہیں ہے۔

(۵) عورت اپنی بنیادی ضروریات کیلئے (یعنی خوراک، لباس، رہائش وغیرہ) شوہر کی اجازت کے بغیر بھی خرچ کر سکتی ہے۔

شوہر کو ازراہِ مذاق پاگل بد تمیز کہنا

سوال: کیا بیوی کیلئے مذاقاً اپنے شوہر کو جاہل، پاگل، بد تمیز وغیرہ کہنا جائز ہے؟
(آغا عبد الوحید خان، گلشن حدید۔ کراچی)

جواب: بیوی کا شوہر کو مذاقاً ایسے کلمات کہنا جائز نہیں ہے، کیونکہ یہ توہین کے کلمات ہیں اور شوہر ہی نہیں کسی کو بھی ایسے کلمات سے مخاطب کرنے کو قرآن نے منع فرمایا ہے:

يَآ يُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ۔

"اے ایمان والو! ایک دوسرے کا مذاق نہ اڑاؤ، کوئی بعید نہیں کہ جس کا مذاق اڑایا جا رہا ہے وہ (اللہ تعالیٰ کے نزدیک) مذاق اڑانے والے سے بہتر ہو"

(الحجرات: ۱۱)

اور فرمایا:

وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِۨ ۝

"افسوس اور خرابی ہے اس کیلئے جو (دوسروں کے) عیب تلاش کرتا ہے اور (ان پر) طعن کرتا ہے" (الھمزہ: ۱)۔

البتہ اسلام میں مزاح لطیف کی اجازت ہے اور رسول اللہ ﷺ بھی بعض اوقات مزاح

فرمایا کرتے تھے، مثلاً ایک شخص نے آپ سے اونٹ مانگا، آپ نے فرمایا: "اسے اونٹ کا بچہ دے دو" اس نے عرض کیا کہ "اونٹ کا بچہ میرے کس کام کا" آپ نے فرمایا: "(اللہ تعالیٰ کے بندے) ہر اونٹ کسی نہ کسی اونٹ کا بچہ ہی ہے۔"

بہو کے ساتھ ناروا سلوک

سوال: سسرال والے بہو کے ساتھ ناروا سلوک کرتے ہیں (طویل خط میں تفصیلات درج ہیں)؟۔ (نزہت، نارتھ کراچی)

جواب: اس خط میں جو واقعات درج ہیں وہ یہ ہیں کہ نئی دلہن بیاہ کر لانے کے بعد سسرال والے خود تو Relex ہو جاتے ہیں اور اسے سارے کاموں میں جھونک دیتے ہیں، ذرا سی کام میں کوتاہی ہو جائے تو طعن و تشنیع کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ الغرض کہ زندگی اجیرن کر دی جاتی ہے۔ سسرال والوں کو یہ ذہن نشین کرنا چاہئے کہ وہ ایک خادمہ بیاہ کر نہیں لائے بلکہ ایک بیٹی اور بیوی بیاہ کر لائے ہیں۔ بعض اوقات اس کے اپنے آبائی گھر اور سسرال کے ماحول میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ اسے حالات کو سمجھنے اور ذہنی مطابقت پیدا کرنے کیلئے مناسب وقت ملنا چاہئے اور تنہا سارے کام کا بار اس پر ڈالنا درست نہیں ہے۔ ساس، سسر اسے بیٹی بنا کر لائے ہیں تو ماں باپ بن کر اسے سہارا دیں۔ ہمارے آقا ﷺ نے تو قرونِ وسطیٰ کے زر خرید غلاموں سے بھی ایسا کام لینے سے منع فرمایا تھا جو ان کے بس میں نہ ہو بلکہ آپ نے فرمایا "ان سے وہ کام نہ لو جو تم خود نہیں کر سکتے اور کام دشوار ہو تو اس میں ان کا ہاتھ بٹاؤ، ان کو وہی کھلاؤ جو خود کھاتے ہو اور وہی پہناؤ جو خود پہنتے ہو۔" خاندان کا اجتماعی نظام جو ہمارے اسلامی معاشرے کا سرمایۂ افتخار ہے، یہ باہمی تعاون، ایک دوسرے کی دلداری، غمگساری اور محبت و احترام پر قائم ہے، یہ نظام لگے بندھے کڑے ضابطوں پر نہیں بلکہ "فضل و احسان" پر قائم ہے یعنی ہر فرد کی کوشش ہو کہ بڑھ چڑھ کر دوسرے کا ہاتھ بٹائے، خود دکھ سے اور دوسرے کو راحت پہنچائے۔ ایسا مسئلہ کہیں نہیں ہے کہ بہو سارے خاندان کی خادمہ بن جائے گی اور باقی اس پر راج کریں گے، حکم چلائیں گے۔ اگر سعادت مند بہو مل

جائے جو اپنی بساط کے مطابق دوسرے کے کام آئے تو یہ کسی کا استحقاق نہیں بلکہ اسے اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم سمجھنا چاہئے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِىْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ”اور ان عورتوں کیلئے بھی ایسے ہی حقوق ہیں جیسے ان پر مردوں کے حقوق ہیں۔“

(البقرہ: ۲۲۸)

ضبطِ تولید کا مسئلہ

سوال: کیا ضبطِ تولید کیلئے احتیاطی اقدامات مثلاً گولیاں انجکشن، چھلے وغیرہ کا استعمال جائز ہے؟ (زاہد علی، کیماڑی۔ کراچی)

جواب: ضبطِ تولید (برتھ کنٹرول) کے مسئلے پر شریعت مطہرہ کے احکام درج ذیل ہیں:

(۱) حدیث مبارک کی رو سے استقرار حمل کے بعد ۱۲۰ دن میں جنین میں جان پڑ جاتی ہے لہٰذا اس کے بعد اسقاطِ حمل قتلِ نفس ہے اور اس کے بارے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَلَا تَقْتُلُوْا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا ”تنگی رزق کے ڈر سے اپنی اولاد کو قتل مت کرو، ان کو اور تم کو ہم ہی رزق دیتے ہیں، بلاشبہ ان کو قتل کرنا بہت بڑا گناہ ہے۔“ (الاسراء: ۳۱)

لہٰذا اگر محض تنگی رزق کے ڈر سے احتیاطی تدبیر کے طور پر مانع حمل طریقے اختیار کئے جائیں اور وہ بھی کسی شخصی مجبوری کے تحت نہیں بلکہ قومی اور ملکی پالیسی کے طور پر، تو یہ قرآن کے منشا کی صریح خلاف ورزی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِى الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا ”اور زمین پر جو بھی چلنے والا (جاندار) ہے، اس کا رزق اللہ تعالیٰ (کے ذمہ کرم) پر ہے۔“ (ھود: ۶)

(۲) یہ قانون قدرت ہے کہ آج تک جس تناسب سے آبادی میں اضافہ ہوتا چلا آیا ہے، اسی

تناسب سے وسائل رزق میں بھی اضافہ ہوتا رہا ہے۔ اس میں انسان کی محنت، جدوجہد، منصوبہ بندی اور تدبیر کے ساتھ ساتھ خالقِ کائنات کی قدرت کا بھی دخل ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ "مسبب الاسباب" کی مشیت کے بغیر اسباب موثر ہو ہی نہیں سکتے۔

(۳) آج کے دور میں معیشت کی ترقی کیلئے سائنس، ٹیکنالوجی اور کمپیوٹر کی تمام تر اعجاز آفرینی کے باوجود، افرادی قوت ایک بنیادی عنصر ہے، ہمارے ملک جیسے کئی ترقی پذیر یا پسماندہ ممالک کے زرمبادلہ کا ایک بڑا ذریعہ غیر ممالک میں مصروف عمل تارکینِ وطن کی جانب سے رقوم کی ترسیل ہے اور ترقی یافتہ ممالک ہمارے لوگوں کو ورک ویزا یا امیگریشن ویزا ہماری محبت میں یا کسی جذبہ غریب پروری کے تحت نہیں دیتے بلکہ اپنی قومی وملکی ضرورت کے تحت دیتے ہیں۔

(۴) بہت سے ترقی یافتہ ممالک، جہاں کے لوگ تعیش پسندی، خود غرضی اور آوارگی کی وجہ سے رشتۂ ازدواج کے بندھن اور بچوں کی پیدائش اور پرورش کو ایک بوجھ سمجھتے ہیں، افرادی قوت کی قلت سے دوچار ہیں۔

(۵) کوئی شادی شدہ جوڑا ذاتی وجوہ کی بناء پر مانع حمل طریقے استعمال کرے، مثلاً گولیاں، انجکشن، چھلا، کنڈوم وغیرہ تو اس کی جائز وجوہ درج ذیل ہیں:

(ا) بعض خواتین کے ہاں آپریشن سے بچے پیدا ہوتے ہیں اور دو یا تین آپریشن کے بعد ڈاکٹر مشورہ دیتے ہیں کہ مزید آپریشن سے زچہ کی جان کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے یا کوئی مہلک بیماری لاحق ہو سکتی ہے۔

(ب) عورت کی صحت اتنی کمزور ہے کہ وہ حمل کا بار اٹھانے کے قابل نہ ہو اور بصورتِ حمل اسے جسمانی خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔

(ج) ماں باپ کی طرف سے کسی موروثی نقص کی بناء پر بچے ناقص الاعضاء، معذور یا بعض لاعلاج امراض ورثے میں لے کر پیدا ہو رہے ہیں اور ڈاکٹر کا یہ کہنا ہے کہ یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

(د) ماں بچوں کو اپنا دودھ پلاتی ہے اور قلیل وقفے میں مزید بچہ پیدا ہونے سے، پہلے بچے کی

نشوونما اور نگہداشت متاثر ہوتی ہے۔

(ہ) کوئی شخص کسی ایسے ادارے یا شعبے میں کام کرتا ہے جہاں تحفظ کے انتظامات غیر تسلی بخش ہیں یا ایسے کارخانے جہاں شدید جسمانی محنت کرنی پڑتی ہے اور جہاں ڈاکٹروں کے بقول ایک مقررہ وقت سے زیادہ کام صحت کیلئے مہلک ثابت ہو سکتا ہے، لیکن کثیر الاولاد ہونے کی بناء پر بچوں کی پرورش و تعلیم و تربیت کے مصارف پورے کرنے کیلئے وقت مقررہ سے زائد (Over Time) بھی کرنا پڑتا ہے یا بعض لوگ اپنی ضرورت کی تکمیل کیلئے ناجائز ذرائع اختیار کرتے ہیں تو ایسی تمام صورتوں میں شخصی وجوہ کی بناء پر مانع حمل تدابیر اختیار کرنے کی گنجائش ہے بشرطیکہ ان کا استعمال عورت کیلئے مضر صحت یا مہلک ثابت نہ ہو البتہ مرد یا عورت کا اپنے آپ کو مصنوعی عمل سے مستقل طور پر بانجھ کرا دینا ناجائز ہے۔

☆...☆...☆

حلال و حرام

جائز و ناجائز


Nafse Islam
نفس اسلام
WWW.NAFSEISLAM.COM

وظیفے کی تعریف

سوال: وظیفہ کسے کہتے ہیں، کیا اس کیلئے کسی خاص عمر کی شرط ہے؟

(انیس الرحمٰن خان، سرجانی ٹاؤن۔ کراچی)

جواب: نوافل، تلاوت، اذکار، تسبیح، درود پاک، یا ادعیہ ماثورہ کو بطور نفل ایک خاص پابندی اور التزام کے ساتھ پڑھنے کو وظیفہ کہتے ہیں، اس کیلئے کسی خاص عمر کی قید نہیں ہے۔ احادیث مبارکہ میں بعض مخصوص اوقات اور مواقع کیلئے دعائیں اور تسبیحات مذکور ہیں، اللہ تعالیٰ توفیق دے تو ضرور پڑھیں۔

سوال: سالگرہ کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

(ڈینئل سردار بھٹی۔ کراچی)

جواب: "سالگرہ" کا مطلب ہے کسی کی ولادت کے دن خوشی منانا۔ اگر اس کا مطلب اسراف و تبذیر کا مظاہرہ، گانا بجانا، رقص و سرود، عورتوں اور مردوں کا بے حجاب اختلاط اور دیگر خلاف شرع حرکات ہیں تو یہ نہ تو سالگرہ کے نام پر جائز ہیں اور نہ اس کے علاوہ کسی اور عنوان سے جائز ہیں۔ اس طرح سالگرہ کے نام سے کوئی خاص عبادت بھی بطورِ خاص مشروع نہیں ہے لیکن اگر کوئی شخص اپنے یا اپنے بچوں کی ولادت پر اللہ تعالیٰ کا شکر بجالانا چاہے تو وہ نفلی نماز پڑھ کر نفلی روزہ رکھ کر حسبِ توفیق صدقہ و خیرات کر کے یا عملِ صالح کی کوئی بھی جائز اور مشروع صورت اختیار کرے تو اس میں کوئی شرعی قباحت نہیں ہے۔

بدشگونی کا شرعی حکم

سوال: کیا اسلام میں بدشگونی جائز ہے، کسی دن یا خاص ایام کو نحس قرار دینے کی گنجائش ہے۔ کیا قرآن مجید میں بعض دنوں کو نحس قرار دیا گیا ہے؟

(مولانا شبیر احمد، اسکاؤٹ کالونی، گلشن اقبال۔ کراچی)

جواب: شریعت اسلام میں بدشگونی کرنا منع ہے۔ قرآن مجید میں ہے کہ کفار بدشگونی کیا کرتے تھے چنانچہ کفار بنی اسرائیل کے بارے میں فرمایا:

فَاِذَا جَآءَتۡهُمُ الۡحَسَنَةُ قَالُوۡا لَنَا هٰذِهٖ ۚ وَاِنۡ تُصِبۡهُمۡ سَيِّئَةٌ يَّطَّيَّرُوۡا بِمُوۡسٰى وَمَنۡ مَّعَهٗ ؕ اَلَاۤ اِنَّمَا طٰٓئِرُهُمۡ عِنۡدَ اللّٰهِ وَلٰـكِنَّ اَكۡثَرَهُمۡ لَا يَعۡلَمُوۡنَ ○

"توجب انہیں بھلائی پہنچتی ہے تو کہتے ہیں یہ ہماری وجہ سے ہے اور اگر انہیں کوئی برائی پہنچتی ہے تو (اسے) موسیٰ اور ان کے اصحاب کی نحوست قرار دیتے ہیں۔ سنو! ان (کافروں) کی نحوست، اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقدر ہے لیکن ان میں سے اکثر نہیں جانتے۔"

(الاعراف: ۱۳۱)

رہا یہ سوال کہ قرآن میں ماضی کی اقوام کے حوالے سے بعض دنوں کی نحوست کا تذکرہ ہے۔ جیسے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

فَاَرۡسَلۡنَا عَلَيۡهِمۡ رِيۡحًا صَرۡصَرًا فِىۡۤ اَيَّامٍ نَّحِسَاتٍ

"تو ہم نے (قوم عاد کی) نحوست کے دنوں میں ان پر خوفناک آواز والی آندھی بھیجی۔" (حم السجدہ: ۱۶)

اور فرمایا:

اِنَّاۤ اَرۡسَلۡنَا عَلَيۡهِمۡ رِيۡحًا صَرۡصَرًا فِىۡ يَوۡمِ نَحۡسٍ مُّسۡتَمِرٍّ ○

"بے شک ہم نے ان پر نہایت سخت آواز والی تیز آندھی ان کی دائمی نحوست کے دن بھیجی۔" (القمر: ۱۹)

اس سلسلے میں گزارش ہے کہ کسی دن میں بالذات اور مطلقاً نیک شگونی یا بد شگونی نہیں ہوتی کہ جو اچھا ہے تو ہر ایک کیلئے اچھا ہو اور برا ہے تو ہر ایک کیلئے برا ہو، بلکہ دن تو سارے اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے ہیں۔ ہر ایک کیلئے اچھائی یا برائی ان کے اپنے عقائد و اعمال کے اعتبار سے ہوتی ہے۔ بعض روایات میں ہے کہ قوم عاد پر نزول عذاب کی ابتداء شوال کے آخری بدھ کے دن سے ہوئی تھی اور پھر کئی دن تک آندھی چلتی رہی۔ مفسر قرآن، صاحب تفسیر روح المعانی علامہ محمود آلوسی لکھتے ہیں: "میں کہتا ہوں کہ تمام ایام برابر ہیں اور بدھ کے دن کی نحوست میں

کوئی خصوصیت نہیں ہے اور ہر گزرنے والی ساعت کسی شخص کیلئے اچھی اور مبارک ہوتی ہے اور دوسرے شخص کیلئے بری اور منحوس ہوتی ہے اور ہر دن کسی شخص کیلئے خیر اور دوسرے شخص کیلئے شر ہوتا ہے ہر دن بلکہ ہر ساعت میں کسی نہ کسی شخص پر کوئی نہ کوئی مصیبت اور بلا نازل ہوتی ہے، تو اس قاعدے کے تحت تو تمام ایام اور ساعات منحوس قرار پائیں گی بلکہ قرآن میں فرمایا کہ قوم عاد پر یہ عذاب سات راتوں اور آٹھ دن تک مسلسل نازل ہوا چنانچہ فرمایا:

وَاَمَّا عَادٌ فَاُهۡلِكُوۡا بِرِيۡحٍ صَرۡصَرٍ عَاتِيَةٍ ۝ سَخَّرَهَا عَلَيۡهِمۡ سَبۡعَ لَيَالٍ وَّثَمٰنِيَةَ اَيَّامٍ

"اور رہے قوم عاد کے لوگ تو وہ ایک سخت گرجتی ہوئی نہایت تیز آندھی سے ہلاک کیے گئے۔ اللہ تعالیٰ نے اس آندھی کو سات راتوں اور آٹھ دن تک مسلسل ان پر مسلط کر دیا تھا۔"

تو کیا اس قاعدے کی رو سے ہفتے کے ساتوں دن ہر ایک کیلئے منحوس قرار دیئے جا سکتے ہیں۔ شیخ عبد الحق محدث دہلوی اشعۃ اللمعات جلد نمبر ۳ صفحہ ۶۲۰ پر لکھتے ہیں نبی علیہ السلام نے فرمایا: "لاطیرۃ" یعنی حصول نفع اور دفع ضرر میں بد شگونی کیلئے کوئی تاثیر اور دخل نہیں اور بد شگونی نہیں کرنا چاہئے اور نہ اس کا اعتبار کرنا چاہئے جو کچھ ہوتا ہے وہ ہو کر رہے گا، شریعت نے اس کو سبب نہیں بنایا۔" انہوں نے مزید لکھا "نبی علیہ السلام نے فرمایا: "لَا صَفَرَ" بعض علماء کے نزدیک اس سے مراد ماہ صفر ہے جو محرم کے بعد آتا ہے۔ عام لوگ اس ماہ کو مصیبتوں، بلاؤں، آفات اور حادثات کا مہینہ قرار دیتے تھے۔ یہ اعتقاد بھی باطل ہے اور اس کی کوئی اصل نہیں ہے۔

تیرہ تیزی کیا ہے؟

سوال: بعض لوگ ماہ صفر کو منحوس سمجھتے ہیں بعض اس ماہ کے ابتدائی تیرہ دن کو نحس خیال کرتے ہیں اور انہیں "تیرہ تیزی" کہتے ہیں۔ ان ایام میں نکاح یا شادی نہیں کرتے سفر پر جانا بھی منحوس سمجھتے ہیں۔ بعض پورے صفر کے مہینے کو ہی نحس سمجھتے ہیں اور اسے خالی کا چاند یا خالی کا مہینہ کہتے ہیں اور اسے خوشی کی تقریبات سے خالی رکھتے ہیں اس سلسلے میں شرعی مسئلہ کیا ہے؟

(سید ذاکر شاہ، بلدیہ ٹاؤن۔ کراچی)

جواب : صفر المظفر کے قمری مہینے میں کوئی نحوست نہیں ہے، نہ ابتدائی تیرہ ایام میں اور نہ ہی بقیہ ایام میں۔ عوام میں یہ باتیں غلط طور پر مشہور ہیں، بخاری شریف میں ہے : "لا هامة و لا صفر" ایسی ہی ایک روایت صحیح مسلم میں بھی ہے۔ نیز یہ بھی غلط ہے کہ اس مہینے میں آفات اور بلائیں نازل ہوتی ہیں۔ شریعت میں ایسا عقیدہ رکھنا باطل ہے۔ تمام مہینوں کی طرح اس مہینے کے تمام دنوں میں بھی شادی بیاہ، نکاح، سفر کاروبار الغرض تمام جائز کام جائز ہیں۔

آخری چہار شنبہ

سوال : بعض لوگوں میں یہ مشہور ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنی حیات مبارکہ کے آخری سال ماہ صفر کے آخری بدھ والے دن صحت یاب ہوئے تھے اور اس روز آپ نے غسل فرمایا تھا بعض لوگ اس خوشی میں ہر سال ماہ صفر کے آخری بدھ والے دن مٹھائی بانٹتے اور مسرت کا اظہار کرتے ہیں اس کی اصل حقیقت کیا ہے ؟

(ضیاء الاسلام دہلوی، فیڈرل بی ایریا)

جواب : لوگوں کا یہ خیال غلط ہے کہ رسول اللہ ﷺ ماہ صفر کے آخری بدھ کے دن صحت یاب ہوئے اور آپ نے غسل بھی فرمایا تھا بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ جس مرض میں رسول اللہ ﷺ کا وصال ہوا تھا اس کی ابتدا اسی دن ہوئی تھی لیکن اس بناء پر اس دن کو منحوس سمجھنا بھی درست نہیں ہے۔ اس روایت سے قطع نظر صدقہ و خیرات کرنا یا ایصال ثواب کیلئے فاتحہ پڑھنا درست ہے، اس کی کسی بھی وقت ممانعت نہیں ہے۔

یوم عاشور اور کاروبار

سوال : کیا ۱۰ محرم الحرام "یوم عاشور" کے دن یا جمعہ کے دن یا کسی اور موقع پر کاروبار کرنا حرام ہے ؟ کیا جمعہ کی نماز پڑھنے کے بعد ظہر کے فرض بھی پڑھنا ضروری ہے ؟ اور کیا کسی عذر کے سبب جمعہ یا ظہر کی سنتیں چھوڑی جا سکتی ہیں ؟

جواب : سال کے کسی بھی دن حلال کاروبار کی ممانعت نہیں۔ قرآن مجید میں سورۂ جمعہ میں آیت نمبر ۹ میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے :

يَآيُّهَاالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِاللّٰهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ ؕ

”اے ایمان والو! جب نماز جمعہ کیلئے ندا (یعنی اذان) دی جائے تو اللہ تعالیٰ کے ذکر (یعنی نماز) کی طرف دوڑے چلے آؤ اور کاروبار چھوڑ دو۔“

یعنی صرف نماز جمعہ کے وقت کاروبار منع ہے۔ اذان جمعہ سے پہلے اور نماز جمعہ کے بعد کاروبار کرنا جائز ہے اور قرآن نے ایسی تجارت اور کاروبار کو اللہ کے فضل سے تعبیر کیا ہے، جو بندے کو اللہ کی عبادت سے نہ روکے۔ اسی طرح ان اوقات میں بھی کاروبار منع ہوگا جو فرض نمازوں اور دینی فرائض کی ادائیگی میں حائل ہوں۔ جمعہ کے دن نماز جمعہ باجماعت پڑھ لی جائے تو ظہر کی نماز ساقط ہو جاتی ہے۔ باقی کسی شدید ہنگامی نوعیت کی مصروفیت، سفر، بیماری، مجبوری، تنگی وقت (یعنی کسی نماز کا وقت صرف اتنا رہ جائے کہ صرف فرض ادا کئے جاسکتے ہوں) یا کسی اور عذر شرعی کے بغیر سنن مؤکدہ، خواہ وہ جمعہ کے وقت کی ہوں یا دیگر اوقات کی چھوڑنی نہیں چاہئیں اور اگر کبھی چھوٹ جائیں تو اسے عادت اور وتیرہ نہیں بنانا چاہئے۔

نظر بد سے بچنے کیلئے مکان پر سینگ، کالا کپڑا لٹکانا یا کالا دھاگا باندھنا

سوال : بعض لوگ گھروں یا دوکانوں پر بیل کے سینگ، کالا کپڑا، صراحی وغیرہ لٹکاتے ہیں، (یعنی نظر بد کی تاثیر سے بچنے کیلئے) اور ہاتھ یا گلے میں کالا دھاگا باندھتے ہیں، کیا یہ صحیح ہے؟ (انور حسین۔ کراچی)

جواب : تاثیر نظر حق ہے۔ نظر بد سے بچنے، اللہ تعالیٰ کی آغوش رحمت میں پناہ لینے اور مخلوق کے ہر شر سے امان طلب کرنے کیلئے خالق عزوجل ہی سے عفو و سلامتی کا خواستگار ہونا چاہئے۔ اس کیلئے مختلف مواقع پر احادیث مبارکہ میں دعائیں تعلیم فرمائی

گئی ہیں، چنانچہ نظربد سے بچنے کیلئے رسول اللہ ﷺ سے جو دعا منقول ہے، وہ یہ ہے:

"اَعُوْذُ بِكَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّآمَّةِ مِنْ شَرِّ كُلِّ هَآمَّةٍ وَعَيْنٍ لَآمَّةٍ" ترجمہ: "میں ہر موذی جانور اور نظربد کے شر سے اللہ تعالیٰ کے کامل و تمام کلمات (مبارکہ) کی پناہ میں آتا ہوں۔" یہ دعا پڑھ کر اپنے آپ کو، اپنے اہل و عیال یعنی بیوی بچوں کو اور ہر اس چیز کو دم کرنا چاہئے، جس کیلئے عافیت اور سلامتی مقصود ہے۔ اہل اللہ، عارفینِ کاملین اور علماءِ عاملین نے یہ بھی بتایا ہے کہ نظربد سے بچنے کیلئے قرآن مجید کی سورۂ القلم کی آخری دو آیاتِ مبارکہ آیت نمبر ۵۱، ۵۲ پڑھ کر دم کرے، وہ آیات مبارکہ یہ ہیں:

وَاِنْ يَّكَادُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَيُزْلِقُوْنَكَ بِاَبْصَارِهِمْ لَمَّا سَمِعُوا الذِّكْرَ وَيَقُوْلُوْنَ اِنَّهٗ لَمَجْنُوْنٌ ۝ وَمَا هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝

"اور یقیناً ایسا لگتا ہے کہ کافر گویا آپ کو اپنی نظر (بد) لگا کر گرادیں گے۔ وہ جب قرآن سنتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ ضرور مجنون ہیں، اور وہ قرآن تو صرف تمام جہانوں کیلئے نصیحت ہے۔"

ان آیات کے شان نزول کے بارے میں منقول ہے کہ اہل عرب میں بعض لوگ نظریں لگانے میں بڑی شہرت کے حامل تھے، وہ بعض اوقات دعویٰ کر کے نظر لگاتے اور ان کی نظربد کا جو بھی چیز نشانہ بنتی وہ ہلاک ہو جاتی، ایسے کئی واقعات لوگوں کے مشاہدے میں تھے، چنانچہ کفار مکہ نے معاذ اللہ! رسول اللہ ﷺ کو گزند پہنچانے کیلئے ان نظربازوں کو استعمال کیا، انہوں نے لاکھ جتن کئے، مگر اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب کریم ﷺ کو ان کے شر سے محفوظ رکھا، کفار کے دیگر مکر و فریب اور تدابیر شر کی طرح یہ حیلہ بھی ناکام و نامراد ثابت ہوا۔ اس موقع پر یہ آیات نازل ہوئیں۔ حضرت حسن کا فرمان ہے: "جس کو نظربد لگے، اس کو یہ آیات پڑھ کر دم کیا جائے۔ انسان کو کوئی اچھی صورت، اچھی چیز، فن پارہ یا کمال و ہنر کا کوئی ایسا مظہر و نمونہ نظر آئے، جو دل کو بھائے اور اس کی طرف دل مائل ہو تو "مَاشَآءَ اللّٰهُ لَاقُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ" اور "فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ" پڑھ لینا چاہئے تاکہ وہ چیز اللہ تعالیٰ کی امان میں رہے۔

سوال میں نظربد سے بچنے کیلئے جن چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے ان کی شریعت میں کوئی اصل

نہیں ہے۔ان چیزوں کو بالذات موثر ماننا شرک ہے اور ان کی تاثیر ذاتی کا ایمان واعتقاد رکھے بغیر انہیں اختیار کرنا گمراہی، ضعیف الاعتقادی اور توہم پرستی ہے۔

نظر لگنے کا حکم

سوال: کیا نظر کی تاثیر یا نظر لگنے کا ثبوت قرآن و سنت میں ملتا ہے اس کا شرعی حکم کیا ہے؟

(محمد یاسین، ماڈل کالونی)

جواب: نظر کی تاثیر حدیث سے ثابت ہے صحیح مسلم میں ہے کہ ام المومنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے گھر رسول اللہ ﷺ نے ایک لڑکی کو دیکھا، جس کے چہرے پر جھائیاں تھیں۔ آپ نے فرمایا: ”اس کو نظر لگ گئی ہے اس پر دم کراؤ۔“ صحیح بخاری میں ہے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ حضرت حسن اور حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو دم کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ تمہارے جد اعلیٰ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے صاحبزادوں حضرت اسماعیل اور حضرت اسحاق کو انہی کلمات کے ساتھ دم کیا کرتے تھے۔وہ کلمات دعا یہ ہیں:

”اَعُوْذُ بِکَلِمَاتِ اللّٰہِ التَّآمَّۃِ مِنْ شَرِّ کُلِّ ھَآمَّۃٍ وَعَیْنٍ لَآمَّۃٍ“ ترجمہ: ”میں تم دونوں کو اللہ تعالیٰ کے کامل و تمام کلمات کی پناہ میں دیتا ہوں ہر شیطان اور ہر موذی سے اور ہر نظر بد سے۔“

ستاروں کی تاثیر

سوال: کیا ستارے انسان کے مستقبل پر اثر انداز ہوتے ہیں؟ برج سے کیا مراد ہے؟ کیا ستاروں کے ذریعے مستقبل کا حال معلوم کیا جاسکتا ہے؟

(ڈاکٹر عطاء المصطفیٰ جمیل راٹھور، گلشن اقبال۔ کراچی)

جواب: علم ہیئت (Astronomy) کے ماہرین اور قدیم یونانی فلسفیوں کا قول ہے کہ سات آسمانوں میں سے ہر آسمان پر ایک ستارہ گردش کر رہا ہے جسے وہ ”کوکب سیارہ“ کہتے ہیں۔ آٹھویں آسمان پر حرکت نہ کرنے والے ستارے ہیں جنہیں ”ثوابت“ کہتے ہیں۔ آٹھویں آسمان پر سیاروں کے اجتماع سے مختلف اوقات میں مختلف شکلیں بنتی

ہیں جو نویں آسمان، فلک اطلس، پر اس کے شفاف ہونے کی وجہ سے منعکس ہوتی ہیں، انہیں یہ لوگ "برج" کا نام دیتے ہیں، یہ برج بارہ ہیں، حمل، ثور، جوزا، سرطان، اسد، سنبلہ، میزان، عقرب، قوس، جدی، دلو اور حوت۔ سبع سیارات کے نام ہیں: قمر، عطارد، زہرہ، شمس، مریخ، مشتری، زحل۔ اہل نجوم (ستارہ پرست، جو ستاروں کی تاثیر کے قائل ہیں) کہتے ہیں: کہ فلاں ستارہ فلاں برج میں پہنچ جائے تو بارش ہوتی ہے یا قحط پڑتا ہے یا طوفان آتے ہیں وغیرہ۔ اسی طرح یہ لوگ انسان کے نام اور تاریخ پیدائش سے سیارہ نکالتے ہیں، پھر کہتے ہیں کہ اس کی پیدائش کے وقت یہ سیارہ فلاں برج میں تھا اور اس کی یہ تاثیر ہے، یہ سعد ہے یا نحس ہے۔

قرآن نے آسمانوں کی تعداد نو نہیں بلکہ سات بتائی ہے۔ قرآن میں "بروج" کا ذکر ہے، لیکن "بروج" سے سورج کے سفر کی منازل ہیں۔ اسلام کی رو سے بارش کے برسنے، قحط سالی یا طوفان آنے، سعد یا نحس ہونے میں ستاروں کی کوئی تاثیر نہیں ہے۔ تمام امور اللہ تعالیٰ کی تقدیر، مشیت اور حکم کے تابع ہیں، اسی کی ہستی مؤثر بالذات ہے۔ صحیح مسلم اور صحیح بخاری میں حدیث ہے: صحابی زید بن خالد بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں حدیبیہ میں صبح کی نماز پڑھائی، اس وقت رات کی بارش کا اثر باقی تھا، نماز سے فارغ ہو کر آپ حاضرین کی جانب متوجہ ہوئے اور فرمایا: "تم جانتے ہو تمہارے رب نے کیا فرمایا؟": "صحابہ نے عرض کیا: اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میرے بندوں میں سے بعض کی صبح ایمان پر ہوئی اور بعض کی کفر پر ہوئی ہے، جس شخص نے یہ کہا کہ ہم پر خدا کے فضل و کرم سے بارش ہوئی، اس نے مجھ پر ایمان رکھا اور ستاروں کا کفر کیا، اور جس نے یہ کہا کہ فلاں فلاں ستاروں کی تاثیر سے بارش ہوئی، اس نے میرا انکار کیا اور ستاروں پر ایمان رکھا۔

سورج گرہن اور ستاروں کی تاثیر کی بابت اسلام کا نظریہ

قرآن مجید بنیادی طور پر "کتابِ ہدایت" ہے، سورۂ البقرہ آیت نمبر ۲ میں اسے "اہل

تقویٰ" کیلئے ذریعہ ہدایت اور آیت نمبر ۱۸۵ میں سارے عالم انسانیت کیلئے ہادی قرار دیا گیا ہے۔ ان دونوں آیات میں تطبیق اس طرح کی گئی ہے کہ قرآن کا پیغامِ ہدایت اور دعوت تو بلاشبہ ساری انسانیت کیلئے ہے لیکن اس سے فیض وہی پاتے ہیں جو اہل تقویٰ و ایمان ہیں۔ لہٰذا کتاب و سنت اور نبوت و رسالت کا بنیادی موضوع اور مشن عالمِ انسانیت کی رشد و ہدایت ہے۔

قرآن مجید میں اگر کہیں انفس و آفاق، حیات و کائنات، طبیعیات، فلکیات، ارضیات اور دیگر سائنسی و فنی علوم کی جانب اشارات و تصریحات ملتی ہیں تو ان کا مقصد بھی اہل فکر و نظر کیلئے تعقل اور تفکر و تدبر کی دعوت ہے، تذکیر و موعظت ہے تاکہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، قدرت و جلالت، اس کی کتابِ مقدس اور اس کے رسولِ مکرم ﷺ کی حقانیت و صداقت پر حجت قائم ہو جائے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتوں کو اس کے بندوں کی فلاح و بقا کیلئے استعمال میں لانے کی ترغیب بھی ہے۔

اشیاء کی حقیقت، ان کے آثار اور ان میں تغیر و تبدل کی سائنسی توجیہات کیا ہیں؟، یہ قرآن و حدیث کا اصل موضوع نہیں ہے، یہ ضمنی مباحث ہیں، تاہم اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں کئی مقامات پر ان مباحث کو اپنی عظیم قدرت کی نشانی کے طور پر ضرور بیان فرمایا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَالشَّمْسُ تَجْرِىْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ○ وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِيْمِ ○ لَا الشَّمْسُ يَنْۢبَغِىْ لَهَآ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ وَكُلٌّ فِىْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ○

"اور سورج اپنے مقرر رستے پر چلتا رہتا ہے، یہ بڑی غالب اور علیم ہستی کا مقرر کیا ہوا نظام ہے، اور ہم نے چاند کیلئے بھی منزلیں مقرر فرمادی ہیں یہاں تک کہ وہ لوٹ کر کھجور کی پرانی شاخ کی مانند (باریک) ہو جاتا ہے، نہ سورج کی یہ مجال کہ وہ (اپنی گردش کے دوران) چاند کو جا پکڑے اور نہ ہی رات دن پر سبقت لے جا سکتی ہے، اور ہر ایک (اپنے اپنے) مدار میں تیر رہا ہے۔" (یٰس: ۳۸، ۳۹)

دوسرے مقام پر فرمایا:

اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ ۝ وَّالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدٰنِ ۝

"سورج اور چاند حساب (اور قدرت کے مقررہ ضابطے) کے پابند ہیں اور (زمین پر پھیلا ہوا) سبزہ اور (کھڑے) درخت (اس کے حضور) سجدہ ریز ہیں"

(الرحمٰن: ۵، ۶)

اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ يُمْسِكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ اَنْ تَزُوْلَا ۚ وَلَئِنْ زَالَتَآ اِنْ اَمْسَكَهُمَا مِنْ اَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِهٖ ۭ

"بے شک اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمین کو روکے ہوئے ہے کہ وہ اپنی جگہ سے (نہ) ہٹیں اور اگر وہ ہٹ جائیں تو اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی انہیں کوئی روک نہ سکے۔"

(فاطر: ۴۱)

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِيْ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ۠ وَّتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝

"بلاشبہ زمین و آسمان کی پیدائش، گردش لیل و نہار اور ان کشتیوں میں جو لوگوں کے نفع کی چیزیں لئے سمندر میں رواں دواں ہیں اور اس پانی میں جسے اللہ تعالیٰ نے آسمان سے نازل فرمایا، پھر اس سے مردہ زمین کو زندہ کیا اور اس میں ہر قسم کے جانور پھیلا دیئے اور ہواؤں کی گردش اور بادلوں میں جو زمین و آسمان کے درمیان اللہ تعالیٰ کے حکم کے تابع ہیں، ضرور (ان سب میں) اہل عقل و خرد کیلئے (اللہ تعالیٰ کی معرفت کی) نشانیاں ہیں۔" (البقرہ: ۱۶۴)

ان آیات سے معلوم ہوا کہ سورج، چاند، ستارے، بحر و بر، ہوائیں، بادل اور گردش لیل و نہار، حتیٰ کہ پورا نظامِ کائنات اللہ تعالیٰ کے حکم کے تابع ہے، یہ سب مظاہر کائنات ایک قادر مطلق ہستی کے غیر مرئی (Unseen) نظم و ضبط کی لڑی میں اتنی شدت سے بندھے ہوئے ہیں کہ کسی کو مجالِ انحراف نہیں ہے۔ یعنی یہ نظامِ کائنات کوئی اتفاقی حادثہ نہیں ہے بلکہ ایک مربوط، منضبط اور منظم شاہکارِ قدرت ہے۔

موجودہ دور میں کسوف (سورج گرہن) اور خسوف (چاند گرہن) کی سائنسی توجیہہ اور عادی سبب تو سب کو معلوم ہے کہ جب دورانِ گردش زمین اور سورج کے درمیان چاند حائل ہو جاتا ہے تو سورج کی روشنی جزوی یا کلی طور پر زمین پر پہنچ نہیں پاتی اور تاریکی چھا جاتی ہے، اسے سورج گرہن کہتے ہیں اور جب چاند اور سورج کے درمیان زمین حائل ہو جاتی ہے تو چاند گرہن ہو جاتا ہے۔ سائنس دانوں اور ماہرینِ فلکیات کے نزدیک یہ ایک معمول کی بات ہے جو وقتاً فوقتاً ظہور میں آتی رہتی ہے، لیکن اسلام کی نظر میں یہ ایک غیر معمولی صورتحال ہے، یہ اللہ تعالیٰ کی عظمت و جلالت اور قدرت و کمال کی ایک عظیم نشانی ہے اور مومن صادق اسے اسی زاویہ نظر سے دیکھتا ہے۔ گویا منظر (Scenario) ایک ہی ہے لیکن مومن اور کافر و ملحد کے زاویہ نظر اور طرزِ فکر میں بنیادی فرق ہے۔ کیونکہ جب یہ تسلیم کر لیا جائے کہ یہ قدرتِ باری تعالیٰ کی ایک عظیم نشانی ہے تو اس کی حکمت قرآن نے یہ بتائی ہے کہ:

"ہم اپنی نشانیاں (اپنے عذاب سے) ڈرانے کیلئے بھیجتے ہیں (بنی اسرائیل: ۵۹)"۔

یعنی یہ مقامِ عبرت ہے کہ جب سورج جیسا عظیم منبع حرارت و نور اور معلوم کائنات کا سب سے بڑا مظہر ایک خاص وقت میں اور ایک خاص مرحلے پر زمین تک اپنی روشنی کی ترسیل پر قادر نہیں ہوتا اور اس کی روشنی کی شعاعوں کی راہ میں ایک محدود وقت کیلئے زمین یا چاند کا حائل ہونا محض اللہ تعالیٰ کی قدرت کا کرشمہ ہے اور کسی کے بس میں نہیں کہ وہ اپنی قوت و طاقت کے بل پر اس میں کوئی تبدیلی لائے یا اس گرہن کو ٹال دے یا اس کی مدت میں کمی بیشی کر دے۔ تو اس موقع پر انسان یہ سوچے کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہے کہ سورج کے منبع حرارت و نور سے روشنی کو بالکل سلب فرما دے تو کس کے بس میں ہے کہ اسے بحال کر سکے اور جب قیامت

قائم ہوگی تو ایسا ہی ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ ۝ "جب سورج لپیٹ دیا جائے گا (یعنی سورج کی وہ روشنی جو ساری کائنات کو منور کرتی ہے، اسی پر لپیٹ دی جائے گی اور اس کی ترسیل (Transmission) روک دی جائے گی)" (التکویر : ۱)

لہٰذا بندۂ مومن جب قدرتِ باری تعالیٰ کی ایسی آیات عظیم کو دیکھے تو سراپا تسلیم ورضا بن کر اس کے حضور سجدہ ریز ہو جائے اور یہ سوچے کہ جب سورج اور چاند جیسے عظیم مظاہر کائنات اس کے حکم کے آگے بے بس ہیں تو انسان عاقل کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ اس کی حکم عدولی کرے، چنانچہ احادیث مبارکہ میں بکثرت آیا ہے کہ جب سورج گرہن لگتا تو حضور ﷺ بے اختیار نماز کیلئے نکل کھڑے ہوتے۔ جب عہدِ رسالت میں سورج گرہن لگا تو یہ ایک اتفاقی امر تھا کہ ان ہی دنوں نبی کریم ﷺ کے صاحبزادے حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا تھا اس لئے بعض لوگوں نے سورج گرہن کو اسی کا سبب قرار دیا، تو رسول اللہ ﷺ نے ان باطل نظریات کی واضح تردید کرتے ہوئے فرمایا، سورج یا چاند کو کسی کی موت یا حیات کی وجہ سے گہن نہیں لگتا بلکہ یہ دونوں (کسوف وخسوف) اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ہیں، پس جب تم یہ نشانیاں دیکھو تو نماز پڑھو (صحیح مسلم)۔ ایک اور روایت میں ہے کہ اس تاریکی کو دیکھ کر قبر کی تاریکی کو یاد کرو اور عذاب قبر سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگو۔

پس معلوم ہوا کہ سورج گرہن کا کسی کی موت وحیات اور نفع ونقصان سے کوئی تعلق نہیں ہے، نہ ہی کسی شبھ گھڑی یا نحس ساعت سے اس کا کوئی تعلق ہے، اسلام کی رو سے یہ سارے توہمات، نظریات اور عقائد باطل ہیں، فقط اتنی بات درست ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا سورج گرہن کے موقع پر نماز کسوف پڑھنا اس لئے تھا کہ اس عالم اسباب میں لوگوں کی نظر اسباب پر ہوتی ہے اور نبی کریم ﷺ کی نظر ذات مسبب الاسباب پر ہوتی تھی اور اللہ تعالیٰ کی جلالت، عظمت اور ہیبت دل پر چھا جاتی تھی کہ حرارت و

نور کے اتنے بڑے سرچشمے کو اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت سے کنٹرول کر رکھا ہے، اگر یہ زمین کے قریب آجائے تو سب کچھ جل کر خاکستر ہو جائے اور اگر زمین سے بہت دور چلا جائے تو شدید سردی کے سبب سارے ذی حیات فنا ہو جائیں۔ لہٰذا رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو نماز، توبہ واستغفار، اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء اور ذکر وتسبیح کی تعلیم دی۔ سورج گرہن کے وقت سورج کی طرف دیکھنے کی شرعاً کوئی ممانعت نہیں ہے، البتہ اگر طبی لحاظ سے ماہرین کی رائے میں نقصان کا اندیشہ ہو تو ضرور احتیاط کریں یا ان آلات کی مدد سے دیکھیں جو تجویز کئے گئے ہوں۔ یہ خیال بھی شرعاً بالکل باطل ہے کہ سورج گرہن کے موقع پر خواتین یا بالخصوص حاملہ خواتین پر کوئی خاص اثرات مرتب ہوتے ہیں، ان توہمات کی شرعاً کوئی حیثیت نہیں ہے۔ البتہ خواتین کو بھی چاہئے کہ نماز، ذکر، توبہ واستغفار اور تسبیح وتحمید میں مشغول رہیں۔

صلوٰۃ کسوف

سورج گرہن کے وقت دو رکعت نماز پڑھنا سنت مؤکدہ ہے، باجماعت پڑھنا مستحب ہے، چار رکعات یا زیادہ بھی پڑھی جاسکتی ہیں، اس میں اذان واقامت نہیں ہے، فقہ حنفی کے مطابق خطبہ بھی نہیں ہے اور یہ نماز عام نوافل کی طرح پڑھی جائے گی، افضل یہ ہے کہ سورج روشن ہونے تک نماز میں مشغول رہیں۔ قرأت طویل کریں اور رکوع و سجود میں تسبیحات بھی زیادہ پڑھیں۔ نماز سے فارغ ہو چکے ہوں تو دُعا واذکار اور استغفار میں مشغول رہیں۔ نماز باجماعت میں قرأت بلند آواز سے نہ کریں۔ یہ نماز تنہا بھی پڑھی جاسکتی ہے، باجماعت پڑھنی ہو تو عید گاہ یا مسجد میں پڑھیں۔ چاند گرہن کی نماز مستحب ہے، اسے تنہا پڑھیں۔ رسول اللہ ﷺ نے اس موقع پر تکبیر کہنے اور صدقہ دینے کا بھی حکم فرمایا ہے، لہٰذا صدقہ وخیرات بھی مستحب ہے۔

ستاروں کی تاثیر

صحیح مسلم میں حدیث ہے کہ حدیبیہ کے مقام پر رسول اللہ ﷺ فجر کی نماز سے فارغ ہو کر حاضرین کی جانب متوجہ ہوئے اور فرمایا: ''کیا تم جانتے ہو کہ تمہارے رب نے کیا

فرمایا؟۔ صحابہ نے عرض کیا: ''اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول (ﷺ) ہی بہتر جانتے ہیں''، آپ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میرے بندوں میں سے بعض کی صبح ایمان پر ہوئی اور بعض کی کفر پر، جس شخص نے یہ کہا کہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ہم پر بارش ہوئی، اس نے مجھ پر ایمان رکھا اور ستاروں کا کفر کیا اور جس شخص نے یہ کہا کہ فلاں ستارے کی تاثیر سے ہم پر بارش ہوئی، اس نے میرا کفر کیا اور ستاروں پر ایمان رکھا (واضح رہے کہ اس رات بارش ہوئی تھی اور صبح تک اس کا اثر باقی تھا)''۔ اس حدیث مبارک سے معلوم ہوا کہ کائنات میں جو کچھ بھی ہو رہا ہے یا ہوتا ہے، وہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی قدرت سے ہوتا ہے اور اس کی ہستی مؤثر بالذات ہے، کائنات کے تکوینی نظام میں ستاروں یا کسی اور چیز کی کوئی تاثیر نہیں ہے۔

عالمِ اسباب میں بعض چیزیں بظاہر علت اور معلول اور سبب اور مسبَّب (Cause And Effect) کے رشتے میں منسلک ہیں، لیکن ان امور میں بھی اسباب کی تاثیر قطعی اور ذاتی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر اور مشیت کے تابع ہے۔ مثلاً شافی الامراض بالذات صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، اس کی مشیت ہوتی ہے تو دوا سے شفا مل جاتی ہے ورنہ نہیں۔ اسی طرح وہ اپنی مشیت کو نافذ کرنے میں اسباب کا محتاج نہیں ہے بلکہ یہ محض اس کی سنت جاریہ ہے، مثلاً عالمِ اسباب میں انسان کی تخلیق کا سبب والدین ہیں، لیکن اس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو باپ کے وسیلے کے بغیر، حضرت حوا علیہا السلام کو عورت کے وسیلے کے بغیر اور حضرت آدم علیہ السلام کو مرد و زن دونوں کے وسیلے کے بغیر پیدا فرما کر یہ ثابت کر دیا کہ اس کی قدرت اسباب کی محتاج نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ ۝ وَاِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِيْمٌ ۝ اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ ۝ فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ ۝ لَّا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ۝ تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ اَفَبِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَنْتُمْ	''تو مجھے قسم ہے ان جگہوں کی جہاں ستارے واقع ہوتے ہیں، اگر تم سمجھو تو یہ بہت بڑی قسم ہے، بے شک یہ بڑی عزت والا قرآن ہے، محفوظ کتاب میں (ہے)، اس کو صرف پاک لوگ چھونے کے اہل

مُدْهِنُوْنَ ○ وَتَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ اَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ ○

ہیں، (یہ) رب العالمین کی جانب سے نازل کیا ہوا ہے، تو کیا تم اس کلام کے ساتھ لاپرواہی کرتے ہو اور تم (قرآن میں) اپنا حصہ یہ رکھتے ہو کہ (اسے) جھٹلاتے ہو۔" (الواقعہ ۷۵ تا ۸۲)

قدیم فلاسفہ یونان اور علماء ہیئت کا یہ کہنا ہے کہ سات آسمانوں میں ہر آسمان پر ایک گردش کرنے والا ستارہ ہے جسے "کوکب سیارہ" کہتے ہیں، پہلے آسمان پر قمر، دوسرے پر عطارد، تیسرے پر زہرہ، چوتھے پر شمس، پانچویں پر مریخ، چھٹے پر مشتری اور ساتویں پر زحل ہے۔ آٹھویں آسمان پر "ثابت" ستارے ہیں جو حرکت نہیں کرتے، نواں آسمان فلک اطلس ہے جس پر کوئی ستارہ نہیں ہے۔ آٹھویں آسمان پر ستاروں کے اجتماع سے جو ہیئت بنتی ہے وہ نویں آسمان کے شفاف ہونے کی بناء پر اس پر منعکس ہوتی ہے، یہ بارہ شکلیں ہیں: ثور، جوزا، سرطان، اسد، سنبلہ، میزان، عقرب، قوس، جدی، دلو اور حوت۔ ان کو علماء ہیئت "برج" کہتے ہیں۔

اہل نجوم جو ستاروں کی تاثیر کے قائل ہیں، کہتے ہیں کہ فلاں ستارہ جب فلاں برج میں پہنچ جائے تو مثلاً بارش ہوتی ہے یا قحط پڑتا ہے یا دریاؤں اور سمندروں میں طوفان آتے ہیں، یا اچھی فصل پیدا ہوتی ہے وغیرہ، یہ لوگ کسی شخص کے نام اور اس کی تاریخ پیدائش سے اس کا ستارہ نکالتے ہیں اور پھر بتاتے ہیں کہ اس کی پیدائش کے وقت اس کا ستارہ فلاں برج میں تھا اور یہ ستارہ سعد ہے یا نحس۔ اور پھر اس کی زندگی کے واقعات کو اس ستارے سے جوڑتے ہیں کہ مثلاً جب وہ فلاں برج میں پہنچے گا تو اسے سفر میں، تجارت میں یا کسی اور مقصد میں کامیابی ہوگی یا ناکامی۔ اخبارات میں کالم شائع ہوتے ہیں کہ "آپ کا یہ ہفتہ کیسا رہے گا" یہ سب انکل پچو باتیں ہیں، ظن و تخمین کے خیالی گھوڑے ہیں جو دوڑائے جاتے ہیں۔ اسلام میں ایسے باطل نظریات کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے، قضاو قدر، تقدیر اور نظام کائنات کی باگ ڈور اللہ تعالیٰ کے دستِ قدرت میں ہے، وہ مالک و مختار ہے، اس کی مشیت کے بغیر ایک پتا بھی نہیں ہلتا۔ علامہ اقبال نے سچ کہا ہے ؎

ستارہ کیا مری تقدیر کی خبر دے گا؟
وہ خود فراخیٔ افلاک میں ہے خوار و زبوں

قرآن مجید میں "بروج" کا ذکر ضرور ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: "اور برجوں والے آسمان کی قسم (البروج: ۱)" لیکن ان بروج سے مراد سورج، چاند اور ستاروں کی منزلیں ہیں، کسی چیز یا کسی شخص کے خیر و شر میں یہ موثر بالذات نہیں ہیں اور حدیث پاک کی رو سے جو ان ستاروں کو تکوینی امور میں موثر بالذات مانے، وہ کافر ہے، اللہ تعالیٰ کی قدرت کا منکر ہے۔

اوجھڑی حلال یا حرام

سوال: جانور کی اوجھڑی کھانا حلال ہے یا حرام؟ بعض لوگ بڑے شوق سے کھاتے ہیں، اس کا شرعی حکم کیا ہے؟ (محمد علی، اورنگی ٹاؤن۔ کراچی)

جواب: رسول اللہ ﷺ نے حلال جانور کے جن اجزاء کو حرام قرار دیا ہے وہ یہ ہیں ذکر، فرج، خصیتیں، غدود، پتہ، مثانہ اور دمِ مسفوح (بہنے والا خون) ان میں سے دمِ مسفوح (ذبح کے وقت بہنے والا خون) تو حرامِ قطعی ہے کیونکہ اس کی حرمت نصِ قرآنی سے ثابت ہے اور باقی چھ چیزیں مکروہ تحریمی ہیں۔ اوجھڑی کو ہم مثانے پر قیاس کرتے ہیں۔ گوبر کا مستقر ہونے کی وجہ سے اوجھڑی کا بھی یہی حکم ہونا چاہیے، اور طبیعت اور فطرت سلیم بھی اسے پسند نہیں کرتی بلکہ گھن آتی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "اور نبی (ﷺ) ان پر ناپاک چیزوں کو حرام کرتے ہیں۔" اگر مثانے اور اوجھڑی میں علت مشترکہ کو دیکھا جائے تو اس کا حکم بھی مکروہ تحریمی ہونا چاہیے، لیکن اگر اس پہلو سے دیکھا جائے کہ اس کی ممانعت حدیث میں مذکور نہیں ہے تو کم از کم مکروہ تنزیہی تو بہر حال قرار پائے گی۔

پولٹری فارم کی مرغیوں کی خوراک

سوال: پولٹری فارم کی غذا (Feed) کے بارے میں سنا ہے کہ اس میں ذبیحہ کے جانوروں

کا خون اور ہڈیاں وغیرہ شامل ہوتی ہیں۔ قرآن مجید میں جانور کی ذبح کے وقت بہنے والے خون کو حرام قرار دیا گیا ہے اور جو چیز حرام ہو وہ ناپاک بھی ہوتی ہے۔ تو سوال یہ ہے کہ آیا (ا) حلال جانوروں کی غذا حرام اور ناپاک چیز سے تیار ہو سکتی ہے (ب) اور یہ کہ کیا (بہنے والے) خون کی بیع جائز ہے اور اس سے حاصل ہونے والی قیمت حلال ہے؟

جواب: (ا) ماکول اللحم (یعنی جن جانوروں کا گوشت کھایا جاتا ہے یا جو عرفِ عام میں حلال جانور کہلاتے ہیں) کی غذا ان اشیاء سے ہو سکتی ہے۔ دیہاتوں میں مرغیاں گلی کوچوں میں پھرتی ہیں اور نجاست بھی کھاتی رہتی ہیں۔ فقہی اصطلاح میں گندگی کھانے والے جانور کو "جلالہ" کہتے ہیں۔ اگر نجاست کھانے یا پیشاب پینے سے جانور کا گوشت یا دودھ بدبو دار ہو جائے تو اس کا استعمال مکروہ تحریمی ہے، بعض فقہاء نے اس کے پسینے کو بھی مکروہ لکھا ہے۔ لہٰذا ذبح سے پہلے یا دودھ استعمال کرنے کیلئے ایسے جانوروں کو اتنی مدت کیلئے تھان پر باندھ کر رکھا جائے کہ بدبو کا ازالہ ہو جائے۔ فتاویٰ درمختار میں لکھا ہے کہ مرغی کو تین دن تک، بکری کو چار دن تک اور اونٹ، گائے وغیرہ کو دس دن تک رکھا جائے۔ فتاویٰ شامی میں بزازیہ کے حوالے سے مردار کھانے والے اونٹ کو ایک ماہ تک، گائے کو بیس دن تک اور بکری کو دس دن تک باندھے رکھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ تاہم ظاہر ہے کہ یہ اپنے اپنے قیاسات ہیں۔ لیکن اگر ان جانوروں کے گوشت میں ناپاک اشیاء کی بدبو سرایت نہ کرے اور اثر انداز نہ ہو تو ان کا کھانا مطلقاً حلال ہے۔ فتاویٰ ردالمحتار (شامی) اور درمختار میں یہی مسئلہ لکھا ہے۔ چونکہ فارم کی مرغیوں کے گوشت میں کسی بدبو کا اثر نہیں ہوتا لہٰذا وہ مطلقاً حلال ہیں۔ الغرض حلال جانور کی غذا حرام یا نجس وغیرہ سے ہو سکتی ہے، اس کے حلال اور طیب ہونے کی شرط نہیں ہے۔ (ب) ذبح کے وقت بہنے والا خون حرام اور ناپاک ہے لہٰذا شرعاً اس کی بیع جائز نہیں ہے اور اس کے عوض بائع کو حاصل ہونے والی قیمت اس کیلئے حلال نہیں ہے لیکن اس خون کو جمع کرنے اور پیک کرنے کا خرچ وہ لے سکتا ہے۔

مرد کیلئے زیور پہننا

سوال: (۱) کیا مرد کیلئے زیور پہننا جائز ہے؟ (۲) لوہے، تانبے، چاندی کی انگوٹھی جائز ہے؟

(محمد شریف بلوچ، لیاری۔ کراچی)

جواب: (۱) مرد کیلئے زیور پہننا مطلقاً حرام ہے۔ (۲) لوہے، تانبے، پیتل، جست اور دیگر دھاتوں کی انگوٹھیاں مرد اور عورت دونوں کیلئے ناجائز ہیں۔ (۳) مرد کیلئے سونے کی انگوٹھی، کڑے یا بالیاں حرام ہیں البتہ چاندی کی ایک انگوٹھی مرد کیلئے جائز ہے جس کا وزن ساڑھے چار ماشے سے زیادہ نہ ہو۔

اعترافِ جرم

سوال: کیا مجرمان سے اعترافِ جرم کرانے کیلئے انہیں جسمانی اذیت دینا درست ہے، اسے جسمانی ریمانڈ کا نام دیا جاتا ہے؟ (محمد ایوب عباسی، بولٹن مارکیٹ۔ کراچی)

جواب: ملزم سے تفتیشی ادارے کا تفتیش کرنا، تحقیق کرنا درست ہے، لیکن کسی جرم کے قطعی ثبوت کے بغیر سزا دینا، اذیت پہنچانا یا جبراً اقرار جرم کرانا، خواہ اس نے جرم کا ارتکاب نہ کیا ہو، درست نہیں ہے۔

بالوں میں خضاب لگانا یا رنگنا

سوال: ازروئے شریعت بالوں اور داڑھی میں رنگ لگانا کہاں تک درست ہے؟

(منور رمضان، معمار کوٹ، گلشن اقبال۔ کراچی)

جواب: اس مسئلے کی شرعی حیثیت جاننے کیلئے یہ احادیث مبارکہ ملاحظہ فرمائیے:

۱۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "یہود و نصاریٰ اپنے بالوں کو نہیں رنگتے، سو تم ان کی مخالفت کرو۔"

(صحیح بخاری ج ۲ ص ۸۷۵، سنن ابوداؤد ج ۲ ص ۲۲۲)

۲- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "سفید بالوں کو متغیر کرو اور یہود کی مشابہت نہ کرو۔" (جامع ترمذی ص ۲۶۶)

۳- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جن چیزوں سے بالوں کا رنگ تبدیل کیا جاتا ہے، ان میں سب سے اچھی چیز مہندی اور کتم ہے۔"

(جامع ترمذی ص ۲۶۶)

۴- حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ "نبی کریم ﷺ بغیر بالوں کے چمڑے کی جوتی پہنتے تھے اور اپنی داڑھی کو سرخ اور زرد رنگ سے رنگتے تھے۔"

(سنن ابوداؤد ج ۲ ص ۲۲۲)

۵- رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "سفید بالوں کو نہ اکھاڑو، جس شخص کے بال بھی سفید ہوں گے، وہ قیامت کے دن اس کیلئے نور بن جائیں گے۔" (سنن ابوداؤد ج ۲ ص ۲۲۴)

۶- حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "آخر زمانہ میں ایک قوم کبوتر کے پوٹوں کی طرح سیاہ رنگ کے ساتھ اپنے بالوں کو رنگے گی، وہ (میدان حشر میں) جنت کی خوشبو نہیں پائے گی۔"

(سنن ابوداؤد ج ۲ ص ۲۲۲)

۷- نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: "آخر زمانہ میں ایک قوم ہوگی جو اپنے بالوں کو سیاہ رنگ کے ساتھ رنگے گی، اللہ تعالیٰ ان کی طرف نظر رحمت نہیں فرمائے گا۔"

(مجمع الزوائد ج ۵ ص ۱۶۱)

سید المرسلین ﷺ کی داڑھی مبارک میں آپ ﷺ کے وصال مبارک تک زیادہ سے زیادہ بیس بال سفید تھے، بعض روایات میں ہے کہ سرخ اور زرد رنگ سے رنگے ہوئے تھے اور بعض میں ہے کہ سفید تھے، ان روایات میں تطبیق کی صورت یہ ہے کہ جس صحابی نے جس حال میں مشاہدہ کیا، اسے بیان کر دیا۔ سفیدی اصل حالت ہے اور سرخ یا زرد رنگ وصف زائد ہے اور اصول یہ ہے کہ جس روایت میں وصف زائد ہو، وہ قابل ترجیح ہوتی ہے۔ بعض صحابہ و تابعین سے سیاہ رنگ کے استعمال کی روایات بھی ثابت ہیں، ان تمام احادیث و آثار کی روشنی

میں خلاصہ کلام حسب ذیل ہے:

امام شافعی کے نزدیک سفید بالوں کو رنگنا مستحب ہے (یعنی سرخ، زرد، عنابی وغیرہ) اور سیاہ خضاب مکروہ تحریمی ہے۔ امام مالک کے نزدیک بالوں کو رنگنا مستحب اور سیاہ رنگ خلافِ اولیٰ ہے۔ امام احمد کے نزدیک سفید بالوں کو رنگنا مستحب ہے اور سیاہ رنگ مکروہ ہے۔ فقہائے احناف کے نزدیک بھی سفید بالوں کو رنگنا مستحب ہے اور سیاہ رنگ مکروہ ہے، بعض کے نزدیک بلا کراہت جائز ہے۔ بعض صحابہ اور تابعین سے جو سیاہ رنگ ثابت ہے وہ حالتِ جنگ پر محمول ہے اور اس دور میں جہاد تقریباً تسلسل کے ساتھ جاری رہا۔ سیاہ خضاب کے بارے میں چونکہ احادیث مبارکہ میں وعید آئی ہے اس لئے مکروہ ہے اور اس سے اجتناب کرنا چاہئے، اس مسئلے پر مفصل اور مدلل بحث شرح صحیح مسلم مصنفہ علامہ غلام رسول سعیدی ج ۶ ص ۲۱۰ تا ۲۲۷ پر موجود ہے، علمی و تحقیقی ذوق رکھنے والے اصحاب اس کا مطالعہ کریں۔

خودکشی حرام کیوں؟

سوال: جب ہر کام اللہ تعالیٰ کی مرضی سے ہوتا ہے تو خودکشی پر سزا کیوں ہے اور یہ فعل حرام کیوں ہے؟ (سعید اسد اللہ، کورنگی)

جواب: "مشیت الٰہی" اور "رضائے الٰہی" میں بڑا فرق ہے۔ دنیا میں ہر کام اللہ تعالیٰ کی مشیت سے ہوتا ہے لیکن ضروری نہیں ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی رضا بھی ہو۔ جیسے ایک معلم اپنے طلبہ کو پڑھاتا ہے، اس کی رضا اس میں ہوتی ہے کہ سب طالب علم دل لگا کر پڑھیں۔ خوب محنت کریں، آوارگی نہ کریں، اعلیٰ درجے میں کامیاب ہوں، لیکن بدقسمتی سے ایک طالب علم آوارہ ہے، پڑھائی پر کوئی توجہ نہیں دیتا۔ امتحان میں کامیابی اور ناکامی کا ایک ضابطہ ہے، معلم امتحان لیتا ہے۔ وہ طالب علم فیل ہو جاتا ہے۔ استاد کا اسے فیل کرنا، یہ اس کی مشیت ہے، قانون ہے، ضابطہ ہے لیکن اس کی رضا نہیں ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو عقل عطا کی ہے، کتابِ الٰہی اور انبیاء کرام کے ذریعے شریعت کے احکام عطا کئے

ہیں، نیکی اور بدی کی پہچان اور دونوں کا انجام بھی بتادیا ہے۔ اسے اپنے اختیار اور صوابدید کے مطابق خیر و شر میں سے ایک راستے کو منتخب کرنے کا اختیار دیا ہے اور اسی اختیار پر جزا اور سزا ہے۔ انسان اپنی جان کا مالک نہیں ہے، انسان کی جان کا خالق و مالک اللہ تعالیٰ ہے۔ اس نے ہمیں صرف اس جسم و جاں، عقل و خرد اور صلاحیتوں کو استعمال کرنے کا اختیار دیا ہے۔ یعنی ہم اپنی جان کے متصرف ہیں، مالک نہیں ہیں لہٰذا ہمیں اپنی جان تلف کرنا تو درکنار، ایک عضو تلف کرنے کا بھی اختیار نہیں ہے۔ ارشاد فرمایا: ''اپنے ہاتھوں سے اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔'' ''اپنے آپ کو قتل نہ کرو۔'' لہٰذا ''اتلافِ عضو'' اور ''اتلافِ جان'' (خودکشی) حرام ہے، گناہ ہے اور اس پر سزا ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ جو شخص زہر کھا کر خودکشی کرے گا، اس کی سزا یہ ہے کہ وہ جہنم میں زہر کھاتا رہے گا اور مسلسل اذیت پاتا رہے گا جو کسی بلند و بالا مینار یا بلڈنگ سے چھلانگ لگا کر خودکشی کرے گا، وہ جہنم کے گڑھے میں گرتا ہی چلا جائے گا، علیٰ ہذا القیاس۔ حضور ﷺ نے دوسری صورتوں کا بھی ذکر فرمایا۔ تو اب یہ جرم اور اس کی یہ سزا اللہ تعالیٰ کی مشیت اور اس کا قانونِ مکافاتِ عمل تو ہے اس کی رضا نہیں ہے، اس کی رضا تو اس میں تھی کہ اس کا بندہ اس کے احکام پر عمل کرتا اور جنت کی ابدی نعمتوں سے فیض یاب ہوتا۔

چوری شدہ مال

سوال: جن گھروں میں چوریاں ہوتی ہیں، کیا ان کا مال حلال کا نہیں ہوتا؟ کیونکہ اکثر لوگوں سے سننے میں آیا ہے کہ حلال کا مال کبھی ضائع نہیں ہوتا؟

(ڈینیل سردار بھٹی، منظور کالونی)

جواب: کسی کا مال چوری ہو جائے یا ڈاکے میں لٹ جائے یا کسی ناگہانی آفت میں تلف ہو جائے تو یہ اس امر کی دلیل نہیں کہ خدانخواستہ وہ مال حلال کا نہیں تھا، ایسا مال حلال کمائی کا بھی ہو سکتا ہے اور حرام کا بھی، حرام مال ہونے کی صورت میں ہمارے ہاں یہ مقولہ عام ہے کہ مال حرام بود بجائے حرام رفت۔ مگر اس سے سارا

قصہ تمام نہیں ہوتا، اگر حرام کا مال تلف بھی ہو جائے تب بھی "کسبِ حرام" کا جواب اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دینا پڑے گا اور جس کا حق مارا ہے، اس کا تاوان بھی دنیا یا آخرت میں دینا پڑے گا۔ تاہم اگر حلال کمائی کسی آفت کا شکار ہو جائے یا چوری ہو جائے تو اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک آزمائش اور امتحان سمجھنا چاہئے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ؕ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ○

(ترجمہ) "اور البتہ ہم تم کو کچھ ڈر، بھوک اور (تمہارے) مالوں، جانوں اور پھلوں میں کمی کے ذریعے ضرور آزمائیں گے اور (اے حبیب! مصیبت میں) صبر کرنے والوں کو بشارت دیجئے" (البقرہ: ۱۵۵)

ایسی آزمائش کے موقع پر صبر کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ یا تو دنیا ہی میں بہتر بدل عطا فرمائے گا یا آخرت میں اجرِ عظیم سے نوازے گا یا اسے گناہوں کا کفارہ بنا دے گا یا درجات میں بلندی عطا فرمائے گا۔ ایسے موقع پر اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ پڑھنے کے بعد یہ دعا مانگنی چاہئے جو حدیث میں تعلیم فرمائی گئی ہے: اَللّٰھُمَّ اَجِرْنِیْ فِیْ مُصِیْبَتِیْ ھٰذِہٖ وَاخْلُفْ لِیْ خَیْرًا مِّنْھَا ترجمہ "اے اللہ! مجھے اس مصیبت پر اجر عطا فرما اور مجھے اس کا بہتر بدل عطا فرما تو (یقیناً) اللہ تعالیٰ اسے بہتر بدل عطا فرمائے گا (صحیح مسلم)۔

حلال کمائی اور دوسرے لوگ

سوال: ایک شخص ہے جو خود حلال کماتا ہے مگر اس کے دو بھائی حرام کماتے ہیں اور تینوں بھائی مل کر رہتے ہیں اور ایک ساتھ کھاتے پیتے ہیں۔ حلال کمانے والا چھوٹا ہے اور بڑوں کو منع کرتا ہے مگر وہ نہیں مانتے۔ چھوٹے بھائی کیلئے کیا حکم ہے؟

(محمد اسرار الحق۔ کراچی)

جواب: جو بھائی حلال روزی کماتا ہے، وہ دوسرے بھائیوں کو حرام کمائی سے منع کرے، اگر وہ کسی بھی تدبیر سے باز نہ آئیں تو ان سے علیحدگی اختیار کرلے، ہم ہر روز وتر کی نماز

میں دعائے قنوت پڑھ کر اللہ تعالیٰ سے یہ عہد کرتے ہیں کہ "اے اللہ! جو تیرا نافرمان ہے ہم اس سے قطع تعلق کرتے ہیں۔" اور علیحدگی کے بعد بھی انہیں حرام سے بچنے کی ترغیب و تلقین کرتے رہیں۔ شاید اللہ تعالیٰ ان کے قلوب کو خیر کی طرف مائل فرمادے اور اللہ تعالیٰ سے بھی ان کی ہدایت کیلئے دعا کرتے رہیں، اور اگر علیحدگی میں کوئی ایسی وجوہ حائل ہوں جن کا ازالہ اس کے بس میں نہیں ہے تو کھاتے پیتے وقت یہ نیت کریں کہ میں اپنی حلال کمائی کا حصہ کھا رہا ہوں، جو شخص حلال کماتا ہے، حلال کھاتا ہے، کوئی اور سبب مانع نہ ہو تو اس کے پیچھے نماز جائز ہے۔

تعویذ کی شرعی حیثیت

سوال: کیا تعویذ باندھنا جائز ہے۔ بعض لوگ اسے شرک کہتے ہیں؟

(نور نبی، شاہ پور چاکر، سندھ)

جواب: "عوذ" اور "عیاذ" کے معنی ہیں پناہ مانگنا، کسی کے شر سے پناہ مانگنا اور کسی کی حفاظت و پناہ میں آنا۔ "تعویذ" سے مراد وہ اسمائے مقدسہ اور آیات ہیں جو کسی شر یا مرض سے بچاؤ کیلئے گلے میں باندھے جاتے ہیں۔ کسی کیلئے دعائے خیر، آیاتِ الٰہی یا کلمات مقدسہ پڑھ کر دم کرنا یا اسمائے مبارکہ اور آیات لکھ کر تعویذ کی صورت میں باندھنا یا لٹکانا شرعاً جائز ہے۔ امراض جس طرح جسمانی و طبعی ہوتے ہیں، اسی طرح روحانی، اخلاقی اور اعتقادی بھی ہوتے ہیں، اس کا ذکر قرآن مجید میں موجود ہے۔ "شَافِیُ الْاَمْرَاضِ بِالذَّات" صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اور اس کی مشیت کے بغیر شفاء کا ملنا ناممکن ہے لیکن یہ عالم اسباب ہے اور ہم شرعاً اسباب کو اختیار کرنے کے مکلّف ہیں یا یہ کہ اسباب کا اختیار کرنا جائز ہے۔ جیسے بیماری کی صورت میں ہم ڈاکٹر سے رجوع کرتے ہیں اور دواؤں کا استعمال کرتے ہیں، لیکن ہمارا عقیدہ یہ ہوتا ہے کہ طبیب کی تشخیص اور دوا کی تاثیر اللہ تعالیٰ کی مشیت کے تابع ہے۔ اس طرح دعا، دم اور تعویذ وغیرہ ازالہ مرض و شر کے روحانی اسباب ہیں جیسے دوا مادی سبب ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا ○

"اور ہم قرآن میں ایسی چیز نازل فرماتے ہیں جو اہل ایمان کیلئے (وسیلہ) شفا و رحمت ہے اور اس سے ظالموں کیلئے خسارے میں اضافہ ہی ہوتا ہے۔"

(بنی اسرائیل : ۸۲)

اس میں تو کوئی شبہ ہی نہیں کہ قرآن اخلاقی اور اعتقادی امراض کیلئے شفا ہے، تاہم جمہور مفسرین نے یہ لکھا ہے کہ آیات قرآنی پڑھ کر دم کرنے یا آیات واسمائے الٰہی کا تعویذ باندھنے سے اللہ تعالیٰ جسمانی امراض سے بھی شفا عطا فرماتا ہے۔ بخاری، مسلم، ترمذی، ابوداؤد اور مسند احمد میں حدیث ہے کہ حضرت ابو سعید خدری نے سوۂ فاتحہ پڑھ کر دم کیا اور ایک شخص جو بچھو کے کاٹنے سے تڑپ رہا تھا اسے شفا مل گئی، انہوں نے اس پر بکریوں کا ریوڑ معاوضہ بھی لیا، لیکن صحابہ کا آپس میں اختلاف ہو گیا کہ آیا یہ اجرت، جسے آج کل کی اصطلاح میں نذرانہ کہتے ہیں، جائز ہے یا نہیں لہذا انہوں نے توقف کیا اور مدینہ طیبہ پہنچ کر حضور ﷺ سے اس کا شرعی حکم دریافت کیا تو آپ نے نہ صرف اسے جائز قرار دیا بلکہ فرمایا کہ اس میں سے مجھے بھی دو۔ یہ بعض مواقع پر حضور اس لئے کرتے تھے تاکہ صحابہ کرام کو اس کے جائز ہونے میں کوئی شبہ نہ رہے۔ آیات قرآنی اور کلمات مقدسہ پڑھ کر دم کرنے (نظر بد یا موذی جانوروں کے ایذا یا جنات وغیرہ کے شر یا مرگی کے دورے سے تحفظ کیلئے) کا ثبوت وجواز متعدد احادیث مبارکہ اور رسول اللہ ﷺ کے اپنے عمل مبارک سے بھی ثابت ہے۔ لیکن یہ قرآن مجید کی ضمنی اور اضافی برکات ہیں، بنیادی طور پر قرآن مجید کتاب ہدایت اور ضابطۂ عمل ہے جس پر ایمان بھی ضروری ہے اور اس کے احکام پر عمل بھی، اور قرآن پاک کی اسی جہت کو غالب حیثیت حاصل ہے۔ جن احادیث مبارکہ میں تعویذ یا دم کی ممانعت آئی ہے وہ اس پر محمول ہے کہ (۱) وہ دم یا منتر کلمات شرک و کفر یا کلمات ضلالت پر مشتمل ہو اور (۲) یا یہ کہ کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی ذات کو فراموش

کر کے محض اسباب کو موثر بالذات ماننے۔ بلاشبہ موثر بالذات صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، اسباب میں تاثیر اسی نے پیدا فرمائی اور وہ جب چاہے اسے سلب فرما سکتا ہے۔

رات کے وقت ناخن کاٹنا

سوال: کہا جاتا ہے کہ رات کے وقت ناخن نہیں کاٹنے چاہئیں کیونکہ اس سے برکت ختم ہو جاتی ہے، کیا یہ درست ہے؟ (نائلہ۔ کراچی)

جواب: رات کے وقت ناخن کاٹنے کی شرعاً کوئی ممانعت نہیں ہے، ممکن ہے کسی بزرگ نے اسے کاہلی سمجھ کر منع کیا ہو۔

"اذان" کے نام سے فلم بنانا

سوال: عرض یہ ہے کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان میں شعبہ شوبز سے تعلق رکھنے والی ایک اداکارہ نے لفظ "اذان" پر فلم بنانے کا اعلان کر رکھا ہے جس پر علماء کرام سمیت سائل کو اس نام سے فلم بنانے پر شدید اعتراض ہے۔ اس سلسلے میں اخبارات کے ذریعے اس پر زبردست احتجاج کیا گیا، جس کے جواب میں موصوفہ نے جہاں شعائر اللہ کی بے حرمتی کی وہاں علماء کرام کی شان میں بھی گستاخی کی۔ راقم نے بھی وقتاً فوقتاً اس موضوع پر اپنی سی کوشش کی، جس کے نتیجہ میں اب ان کا جو موقف سامنے آیا ہے، اس کے متن کی کاپی بھی اس سوال کے ساتھ منسلک ہے۔ اس سلسلے میں آپ سے التماس ہے کہ قرآن و سنت کی روشنی میں رہنمائی فرمائیں کہ کیا واقعی "اذان" کے نام کو کرپشن، تعصب، لسانیت کے سدباب کیلئے اور فلم میں علامتی طور پر ادا کرنے کی اجازت دی جاسکتی ہے؟، بصورت دیگر اس نام سے فلم روکنے پر کیا اقدام کیے جاسکتے ہیں؟ (سید منیر احمد، خواجہ چوک، حیدر آباد سندھ)

جواب: "اذان" اسلامی شعائر میں سے ایک شعار ہے۔ اس کو اسلامی شعار کے بجائے لہو لعب میں استعمال کرنا حرام ہے۔ جبکہ فلم بنانا، فلم میں کام کرنا یا معاونت کرنا ناجائز و حرام ہے۔

تو ایک کام جو اپنی اصل اور صورت ظاہری دونوں اعتبار سے ایک سے زائد شرعی

ممنوعات پر مشتمل ہے، اس کے تعارف و فروغ کیلئے "اذان" کے نام کو استعمال کرنا جو ایک خالص اسلامی شعار ہے، حرام اور کفر کے قریب ہے۔ لہذا اس سے اجتناب لازمی ہے اور حکومت کو چاہیے کہ فلموں کیلئے اسلامی شعائر کا نام استعمال کرنے پر پابندی لگائے۔

آنکھوں کی گناہ سے حفاظت

سوال: میں ایک دکان دار ہوں۔ ایک لڑکی بائیں کھڑی، دوسری دائیں، تیسری سامنے، میں اپنی آنکھیں بچا نہیں سکتا، کیا کروں؟ (احمد شاہ)

جواب: آپ نے جو صورتحال بیان کی ہے کہ یہ واقعی آزمائش ہے۔ ایسے ہی امور کو شریعت نے "فتنہ" سے تعبیر کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ ○

"اور (اے رسول ﷺ) آپ مومن مردوں سے کہہ دیجئے کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں۔ یہ ان کیلئے زیادہ پاکیزگی کی بات ہے، بلاشبہ جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ تعالیٰ اس سے باخبر ہے۔" (النور: ۳۰)

سب سے اولین احتیاط تو یہ ہے کہ اپنی نگاہیں حتی الامکان بچائے رکھیں، غیر ارادی پہلی نظر پر تو اللہ تعالیٰ کے ہاں مواخذہ نہیں ہے، لیکن لذت نگاہ، حظِ نفس اور شہوت رانی کیلئے غیر محرم خاتون کو دیکھنا حرام ہے، "لاحول" پڑھتے رہا کریں۔

معوذتین پڑھتے رہا کریں (قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ)۔ جب نفس آمادۂ لذت کرے تو جہنم کی آگ کے شعلوں کا ذہن میں تصور کریں، حضرت ذوالنون نے فرمایا "جب نظر نہ آنے والا شیطان تمہیں بہکائے تو اس کے شر اور وسوسے سے اس ذات باری تعالیٰ کی مدد مانگو جو شیطان کے دائرۂ نگاہ سے بھی باہر ہے اور جس کی نگاہ و قدرت میں شیطان اور اس کا مکر و فریب ہے۔ اس کے علاوہ کوشش بھی کرتے رہیں اور دعا بھی کرتے رہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے حبیب کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے طفیل ایسا وسیلۂ رزق

عطا فرمائے جس میں غیر محرم عورتوں سے واسطہ نہ پڑے۔

دوسروں کی چیزیں استعمال کرنا

سوال: بہت سے لوگ دوسروں سے چیزیں لے کر استعمال کے بعد اِدھر اُدھر ڈال دیتے ہیں؟

جواب: حسن اخلاق اور شرافت نفس کا تقاضا ہے کہ دوسرے کی چیز بلا اجازت استعمال نہیں کرنی چاہئے اگر اس نے استعمال کی آزادانہ اجازت دے رکھی ہے تو استعمال کے بعد چیز جہاں سے اٹھائی ہے وہیں رکھ دینی چاہئے تاکہ اسے تلاش کرنے میں دشواری نہ ہو۔

انسان کا گھر میں اور باہر الگ الگ رویہ

سوال: بہت سے لوگ دینی مجالس میں شرکت کرتے ہیں اس کے علاوہ مذہبی لٹریچر بھی پڑھتے ہیں، مگر گھر میں جن کے ساتھ زیادہ وقت گزارتے ہیں، انہیں ہر طرح سے آزار پہنچاتے ہیں جبکہ گھر سے باہر دوسروں کے ساتھ اچھا رویہ رکھتے ہیں، کیا ایسا کرنا جائز ہے؟ (تبسم حمید)

جواب: رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے ”تم میں سے سب سے بہتر شخص وہ ہے جس کا رویہ، سلوک اور برتاؤ اپنے گھر والوں کے ساتھ سب سے اچھا ہو۔“ کسی شخص کی سیرت و کردار، اخلاق کا اصلی رخ اور داخلی پرت اس کے اہل خانہ کے سامنے ہی اپنی اصلی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ اس میں بے ساختگی ہوتی ہے، تصنع اور فریب نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس بعض لوگ دہری شخصیت کے مالک ہوتے ہیں گھریلو زندگی میں بدخو، بدکلام اور بداطوار ہوتے ہیں، جبکہ گھر سے باہر خارجی زندگی میں اپنی شخصیت پر خوش اخلاقی کا نقاب چڑھا لیتے ہیں۔ اسلام ایسی دو عملی کو پسند نہیں فرماتا، آدمی کو چاہئے کہ اپنے اہل خانہ کے ساتھ بھی اسی حسن اخلاق سے پیش آئے جس سے دوسروں کے ساتھ پیش آتا ہے۔

دوسرے لوگوں کو تکلیف دینا

سوال: میری رہائش کے قریب ایک صاحب روزانہ ۱۲ بجے اپنی گاڑی میں ایک بڑا تھیلا

گوشت کاٹ کر لاتے ہیں اور کتے، بلیوں، کوؤں اور چیلوں کو کھلاتے ہیں۔ یہ کام وہ اپنے گھر کے آگے نہیں بلکہ میرے گھر کے آگے کرتے ہیں جہاں ہر وقت کتے، بلیاں، کوے جمع رہتے ہیں۔ برائے مہربانی یہ بتایئے کہ ان کو اس کا کوئی ثواب ملے گا؟ (محمد علی خان)

جواب: جانوروں کو کھلانا بلاشبہ ثواب ہے لیکن ایسا نہیں کرنا چاہئے کہ ایک ہاتھ سے ثواب کمائے اور دوسرے ہاتھ سے اسے گنوائے۔ پڑوسیوں کے بھی حقوق ہوتے ہیں بلکہ بہت زیادہ ہیں، لہٰذا مذکورہ شخص کو پڑوسیوں کیلئے باعث آزار بننے کے بجائے اپنے گھر کے سامنے یہ کار خیر کرنا چاہئے اور اگر جگہ ایسی ہے کہ راہ چلنے والوں کیلئے اذیت کا باعث ہے تو پھر کسی ایسی جگہ کا انتخاب کریں جہاں کسی کو تکلیف و اذیت نہ پہنچے۔

بزرگانِ دین کے مزارات پر عقیدت

سوال: کیا بزرگانِ دین کی قبور کو تعظیماً سجدہ کرنا، ان کا طواف کرنا اور بوسہ دینا شرعاً جائز ہے؟ (تاج محمد، لانڈھی۔ کراچی)

جواب: انبیائے کرام علیہم السلام، اولیائے کرام یا کسی کی بھی قبر کو عبادت کی نیت سے سجدہ کیا جائے تو یہ شرک ہے، محض تعظیم و توقیر کی نیت سے سجدہ کیا جائے تو یہ بھی شرعاً حرام ہے، صرف بیت اللہ کا طواف ہی عبادت ہے، قبور انبیائے کرام علیہم السلام یا اولیائے کرام کا طواف تعظیماً کیا جائے تو یہ بھی ناجائز ہے، عامۃ المسلمین کو قبر کو بوسہ دینے سے بھی منع کیا جائے، زیادہ احتیاط کا تقاضا یہی ہے۔

میت کے ایصالِ ثواب کیلئے اہتمام

سوال: اہل میت کی طرف سے میت کے ایصال ثواب کیلئے قرآن خوانی اور کھانے کا اہتمام کیا جاتا ہے جسے عام طور پر وہ تمام رشتے دار اور احباب کھاتے ہیں جو معاشی طور پر خوشحال ہوتے ہیں، کیا یہ کھانا مال داروں کیلئے جائز ہے یا صرف فقراء کیلئے جائز ہے؟ (عبدالقادر نجمی، نئی کراچی۔ کراچی)

جواب: کتاب وسنت سے تقریباً تواتر کی حد تک یہ بات ثابت ہے کہ میت کے ایصال ثواب کیلئے جو بھی نیک عمل کیا جائے مثلاً قرآن خوانی، مستحقین کیلئے کھانے کا اہتمام یا لباس کی فراہمی، نقد صدقات یا مساجد ومدارس کی تعمیر میں حصہ لے کر صدقہ جاریہ کا اہتمام کرنا وغیرہ، تو اس کا ثواب میت کو پہنچتا ہے اس سلسلے میں متعدد احادیث وارد ہوئی ہیں۔

ایصال ثواب کیلئے قرآن خوانی کا جو اہتمام ہوتا ہے اور ان مواقع پر کھانے کا جو اہتمام ہوتا ہے، اس کی حیثیت نفلی صدقے کی ہے۔ افضل تو بلاشبہ یہی ہے کہ یہ صرف فقراء و مستحقین پر صرف کیا جائے اور اس صورت میں اس کا اجر بھی اللہ تعالیٰ کے ہاں یقیناً زائد ہوگا۔ تاہم چونکہ یہ نفلی صدقہ ہے اس لئے مال داروں کیلئے بھی اس کا کھانا جائز ہے اور اس پر بھی اجر ملے گا۔

میت کو دوسری جگہ دفن کرنا

سوال: نمبر ۱- جس قبرستان میں سیلابی پانی جمع ہو اور قبروں کے اندر بھی پانی بھرا ہوا ہو تو کیا میت کو نکال کر کسی اور قبرستان میں دفن کر سکتے ہیں؟

سوال: نمبر ۲- شرعی عذر کیا ہے جس کے تحت قبر سے میت کو نکال کر کہیں اور دفن کیا جائے؟

سوال: نمبر ۳- سونے چاندی کے ذاتی استعمال کی کتنی مقدار ہے جس کو وزن کر کے زکوٰۃ ادا کی جائے؟
(عبداللہ، محمود آباد۔ کراچی)

جواب: نمبر ۱- عذر شرعی کی وجہ سے قبر کو کھودنا جائز ہے اور میت کو قبر سے نکال کر دوسری جگہ منتقل کرنا بھی جائز ہے۔ جب قبرستان میں سیلاب یا سیم وتھور کا پانی آجائے تو ان صورتوں میں میت کو دوسری جگہ منتقل کیا جا سکتا ہے۔ اگر غالب امکان یہ ہے کہ میت گل سڑ چکی ہے، سلامت نہیں رہی یا اس پر تغیرات آچکے ہیں تو قبر کو اندر سے چھیڑے بغیر اوپر سے مرمت کر لیں کہ قبر کا نشان باقی رہے۔

جواب : نمبر ۲- شرعی عذر یہ ہے کہ میت کو کسی دوسرے شخص کی زمین میں اس کی اجازت کے بغیر دفن کیا گیا ہو اور وہ شخص مطالبہ کرے کہ زمین خالی کی جائے یا قبرستان میں سیلاب کا پانی آئے اور خدشہ ہو کہ زمین پانی میں ڈوب جائے گی تو ان صورتوں میں میت کو دوسری جگہ منتقل کیا جاسکتا ہے۔

جواب : نمبر ۳- فقہائے اسلام کا اس بات پر اتفاق ہے کہ چاندی دو سو درہم یعنی 612.36 گرام ہو تو اس پر زکوٰۃ واجب ہے جبکہ سونا 20 دینار یعنی 87.48 گرام ہو تو اس پر بھی زکوٰۃ واجب ہے۔ البتہ اگر نقد رقم ہے یا مال تجارت ہے یا متفرق چیزیں ہیں اور ان کی مجموعی مالیت 612.36 گرام چاندی کی مروجہ قیمت کے برابر بن جائے تو زکوٰۃ واجب ہو جاتی ہے۔

قرآن مجید سفر میں کیسے لے جائیں

سوال : میری نواسی امریکہ سے آئی ہوئی ہے وہ اپنے ساتھ قرآن شریف لے جانا چاہتی ہے کیا وہ اپنے سوٹ کیس کے درمیان قرآن شریف رکھ کر لے جاسکتی ہے، بے ادبی تو نہیں ہوگی، یہ سوٹ کیس کارگو میں دے دیا جائے تو گناہ تو نہیں ہوگا؟

(حکیم محمود علی بیگ پی ای سی ایچ ایس۔ کراچی)

جواب : زیادہ بہتر طریقہ تو یہ ہے کہ قرآن مجید کسی پاک کپڑے یا بیگ میں لپیٹ کر اپنے گلے میں لٹکا لے یا مسافروں کے سروں کے اوپر ہلکا سامان رکھنے کیلئے جو خانہ ہوتا ہے اس میں دوسرے سامان کے اوپر رکھ لے اس میں کوئی دشواری ہو تو کپڑے میں لپیٹ کر بیگ میں سامان کے اوپر یا درمیان میں بھی رکھ سکتے ہیں۔ کسی مسلم ملک کی ایئر لائن یا خاص طور پر پی- آئی- اے سے سفر کر رہے ہیں تو ہمارا مشاہدہ ہے کہ عملے کے لوگ بھی اس سلسلے میں کافی تعاون کرتے ہیں، آپ عملے کی مدد بھی لے سکتے ہیں۔ کیونکہ موجودہ دور میں ہمارے اعمال کا معیار تو بلاشبہ بہت گرا ہوا ہے، لیکن قرآن مجید کی توقیر واحترام کے بارے میں بالعموم ہر طبقے کا مسلمان حساس ہوتا ہے۔

کیا سینے میں دو دل ہو سکتے ہیں

سوال: اخبارات میں آیا ہے کہ ایک ایسا لڑکا پیدا ہوا ہے جس کے سینے میں دو دل ہیں، جبکہ قرآن میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی کے سینے میں دو دل نہیں بنائے۔ یہ خبر پڑھ کر میرا ایمان متزلزل ہو رہا ہے اور اسلام کے بارے میں میرے ذہن میں طرح طرح کے وسوسے اور فاسد خیالات پیدا ہو رہے ہیں ازراہِ کرم میرے ان خدشات کا ازالہ فرمادیجئے؟ (ن س، لانڈھی۔ کراچی)

جواب: سورۃ الاحزاب آیت نمبر ۴ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِيْ جَوْفِهٖ ۚ وَمَا جَعَلَ اَزْوَاجَكُمُ الّٰٓئِيْ تُظٰهِرُوْنَ مِنْهُنَّ اُمَّهٰتِكُمْ ۚ وَمَا جَعَلَ اَدْعِيَآءَكُمْ اَبْنَآءَكُمْ ۭ ذٰلِكُمْ قَوْلُكُمْ بِاَفْوَاهِكُمْ ۭ وَاللّٰهُ يَقُوْلُ الْحَقَّ وَهُوَ يَهْدِي السَّبِيْلَ ۝

"اللہ تعالیٰ نے کسی آدمی کیلئے اس کے سینے میں دو دل نہیں بنائے اور تم اپنی جن بیویوں سے ظہار کرتے ہو (یعنی یہ کہتے ہو کہ تو میرے لئے میری ماں کی پشت کی طرح ہے) اللہ نے انہیں تمہاری ماں نہیں بنایا، اور نہ ہی اس نے تمہارے منہ بولے بیٹوں کو تمہارا (حقیقی) بیٹا بنایا ہے یہ سب تمہارے اپنے منہ کی (بنائی ہوئی) باتیں ہیں اور اللہ تعالیٰ حق فرماتا ہے اور وہی (سیدھی) راہ دکھاتا ہے۔"

اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے "قلب" کی اصطلاح استعارہ کے طور پر استعمال کی ہے۔ یہاں قلب سے مراد گوشت کا وہ ٹکڑا یا لوتھڑا نہیں ہے جو انسان کے سینے میں دھڑکتا ہے اور جو بدن میں رگوں کے ذریعے صاف خون کو پمپ کرتا ہے اور جس کے صحیح کام کرنے پر انسان کی جسمانی صحت کا مدار ہے۔ بلکہ اس سے مراد انسان کی قوت عاقلہ ہے، جس کے ذریعے وہ حقائق کا ادراک کرتا ہے اور وہ خیر و شر میں تمیز کرتا ہے۔ جو محبت یا نفرت کا محل ہوتا ہے۔ اور یہ انسان کی عقل یا انسان کا دماغ ہے۔ قرآن و حدیث میں اسے کہیں "قلب" سے تعبیر کیا ہے، کہیں "نفس" سے، کہیں "عقل" سے اور کہیں "فواد" کہا ہے۔ رہا یہ سوال کہ جب قرآن و حدیث میں اس سے مراد عقل و دماغ ہے تو اس کیلئے "قلب" کی اصطلاح

کیوں استعمال کی گئی ؟۔ تو جواباً عرض ہے کہ قرآن مجید بنیادی طور پر طب یا سائنس کی کتاب نہیں ہے بلکہ "کتاب ہدایت" ہے، لہٰذا اس میں ایسے الفاظ، استعارات اور اصطلاحات استعمال کی گئی ہیں جو لوگوں کے عرف، محاورہ اور روزمرہ کے مطابق ہوں تاکہ اتمامِ حجت ہو جائے اور حق ثابت ہو جائے۔ عرف عام اور روزمرہ اور محاورات میں ادراک، احساس، محبت اور نفرت کیلئے مجازاً قلب (دل) کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے، مثلاً میں نے دل میں سوچا، میرے دل میں یہ خیال آیا، میرا دل اس کو نہیں مانتا، میرا دل اس سے نفرت کرتا ہے، میرے دل میں اس کی بڑی عزت یا محبت ہے وغیرہ۔ ائمہ اربعہ میں سے امام اعظم ابو حنیفہ اور امام مالک کا یہی قول ہے کہ عقل کا محل و مرکز دماغ ہے اور جدید طب اور سائنس بھی اس کی تصدیق کرتی ہے۔ اس تفصیلی بحث سے یہ واضح ہو گیا کہ آیت میں قلب سے مراد دل نہیں ہے بلکہ عقل ہے۔ لہٰذا اگر کوئی بچہ ایسا پیدا ہو گیا ہے جس کے سینے میں دو دل ہیں تو یہ قرآن کے منافی نہیں ہے اور نہ ہی اس پر شکوک و شبہات میں مبتلا ہونے کی ضرورت ہے۔ باقی یہ سوال کہ "اللہ تعالیٰ نے کسی آدمی کیلئے اس کے سینے میں دو دل نہیں بنائے"، اس کا مطلب کیا ہے ؟، تو امام فخر الدین رازی نے تفسیر کبیر میں اور علامہ قرطبی نے تفسیر "الجامع لاحکام القرآن" میں اس کا مفہوم یہ بیان کیا ہے :

(۱) جب عقل انسانی ایک ہے تو ایک انسان کی عقل میں یا تو ایمان ہوگا یا کفر، دونوں جمع نہیں ہو سکتے۔

(۲) ایک ہی عقل میں اللہ تعالیٰ اور غیر اللہ کی محبت ایک ہی درجے میں جمع نہیں ہو سکتی۔

(۳) یہ نہیں ہو سکتا کہ انسان کے دل میں تقویٰ بھی ہو، اللہ تعالیٰ سے ڈرے بھی اور غیر اللہ سے بھی اس طرح ڈرے جیسے اللہ تعالیٰ سے ڈرنا چاہئے چنانچہ فرمایا :

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ۭ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ۭ

"اور کچھ لوگ ایسے ہیں جو غیر اللہ کو شریک ٹھہراتے ہیں، اور ان سے ایسی محبت کرتے ہیں جیسی محبت اللہ تعالیٰ سے کرنی چاہئے، اور جو اہل ایمان ہیں وہ اللہ تعالیٰ ہی کی ذات سے (سب سے) زیادہ محبت کرتے ہیں۔" (البقرہ : ۱۶۵)

اور فرمایا:

وَتَخْشَى النَّاسَ ۚ وَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰهُ ؕ

"آپ لوگوں کی طعن و تشنیع سے ڈرتے ہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ ہی اس بات کا سب سے زیادہ حق دار ہے کہ آپ اس سے ڈریں۔" (الاحزاب: ۳۷)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شیخ محمد یوسف لدھیانوی کی خدمت میں چند گزارشات

بہ سلسلہ "آپ کے مسائل اور ان کا حل"

تمہید: ہر جمعہ کو روزنامہ "جنگ" کراچی کے "اقرا ایڈیشن" میں شیخ محمد یوسف لدھیانوی کا کالم "آپ کے مسائل اور ان کا حل" شائع ہوتا ہے، اس کالم پر ادارے کی طرف سے موصوف کی اجارہ داری ہے، لہٰذا جوابات میں وہ اپنے ذاتی نظریات کو اکثر ترجیح دیتے ہیں، حالانکہ وقتاً فوقتاً یہ نوٹ لکھا جاتا ہے کہ مسائل کا جواب "فقہ حنفی" کے مطابق دیا جاتا ہے لیکن بعض اوقات اس کی رعایت نہیں کی جاتی۔ اس سے قارئین غلط فہمی کا شکار ہو جاتے ہیں، بعض اوقات دین کی مصلحت اور حکمت کو یکسر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ سطور ذیل میں ہم چند اہم مسائل کی نشاندہی کر رہے ہیں تاکہ قارئین کی صحیح رہنمائی ہو سکے۔

شہید کی نماز جنازہ: روزنامہ جنگ کراچی کے ۲۶ ستمبر ۱۹۹۷ء کے ایڈیشن میں شیخ لدھیانوی لکھتے ہیں:

"جو شخص کسی کے ہاتھ سے بے گناہ قتل کیا جائے، وہ شہید ہے اور شہید کی نماز جنازہ نہیں ہوتی۔"

یہ مسئلہ احناف کے مسلمہ اور اجماعی موقف کے سراسر خلاف ہے۔ صحیح بخاری، کتاب

الجنائز، باب الصلوٰۃ علی الشہید میں حدیث نمبر ۱۳۴۴ میں ہے:

"حضرت عقبہ بن عامر روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ ایک دن نکلے اور آپ ﷺ نے شہداء احد کی نماز جنازہ پڑھی، جیسے کہ میّت پر پڑھی جاتی ہے، پھر آپ ﷺ (خطبہ دینے کیلئے) منبر کی طرف پلٹے اور فرمایا: "میں (آخرت میں) تمہارا پیشرو ہوں اور میں تم پر گواہ ہوں، اور اللہ کی قسم میں اس وقت بھی اپنے حوض کو دیکھ رہا ہوں اور مجھے زمین کے خزانوں کی کنجیاں عطا کی گئی ہیں، یا (آپ ﷺ نے فرمایا) زمین کی کنجیاں دی گئی ہیں اور خدا مجھے اس بات کا خدشہ نہیں ہے کہ تم میرے بعد شرک کرو گے لیکن مجھے یہ خدشہ ضرور ہے کہ تم دنیا کی محبت میں گرفتار ہو جاؤ گے۔"

اس حدیث کے تحت محدثین وشارحین نے لکھا ہے کہ اگر ایک واقعے کے بارے میں ایک روایت اثبات کی ہو اور دوسری نفی کی تو ترجیح کا مسلمہ اصول یہ ہے کہ روایتِ "اثبات" کو ترجیح دی جائے گی۔ اس کے علاوہ المبسوط مصنفہ شمس الائمہ محمد ابن احمد سرخسی، ردالمحتار مصنفہ علامہ ابن عابدین شامی، عالمگیری مؤلفہ ملا نظام الدین، الھدایہ مصنفہ شیخ الاسلام برہان الدین مرغینانی اور فقہ حنفی کی تمام اُمہاتِ کتب یہ مسئلہ درج ہے۔ بلکہ فقہاء احناف نے یہ بھی تصریح کی ہے کہ قرآن وسنت میں جو "حیاتِ شہداء" کے بارے میں فرمایا گیا ہے وہ عالمِ برزخ و آخرت کے اعتبار سے ہے، دینوی احکام کے اعتبار سے ان پر موت کا اطلاق کیا جائے گا، یہی وجہ ہے کہ شہید کی میراث تقسیم ہوتی ہے، شہید کی بیوہ عدتِ وفات گزرنے کے بعد نکاح کر سکتی ہے۔

اگرچہ یہ بات قوی آثار و روایات سے ثابت ہے کہ بسا اوقات شہدا کے دنیاوی اجسام بھی باقی رہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان اجسام کو زندہ رکھتا ہے۔ عام برزخی زندگی تو کفار کو بھی حاصل ہے، اور ان کی ارواح کا ان کے اجسام کے ساتھ ایک خاص قسم کا تعلق قائم ہوتا ہے، جس سے وہ عذاب کی اذیت میں مبتلا ہوتے ہیں اور ان کے برعکس ثواب وجزا کی لذت کو محسوس کرتے ہیں۔ شہید کا امتیاز یہ ہے کہ اس کی زندگی شہادت کے بعد بھی جسمانی اور بدنی زندگی ہوتی ہے۔

والدین کی نصیحت: اسی اشاعت میں "اطاعتِ والدین" کے تحت شیخ لکھتے ہیں: "لیکن

نہ ان کو نصیحت کرو۔" یعنی والدین کی ناحق بات پر ان کو قبولِ حق کی نصیحت نہ کرو۔ یہ مسئلہ قرآن کے عمومی حکم "وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ" (یعنی ایک دوسرے کو حق بات کی وصیت و نصیحت کرو) کے سراسر خلاف ہے۔

احادیثِ مبارکہ میں بھی ماں باپ کو دعوتِ حق اور نصیحت کا ثبوت ملتا ہے، امام محمد بن اسماعیل بخاری نے "الادب المفرد" میں "باب عرض الاسلام علی الام النصرانیۃ" کے تحت حدیث نمبر ۳۴ نقل کی ہے، راوی بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کو سنا، وہ فرما رہے تھے: "میرے بارے میں جس یہودی و نصرانی نے بھی سنا، اس نے مجھ سے محبت کی، (بات یہ ہے کہ) میں چاہتا تھا کہ میری ماں اسلام قبول کرے تو وہ انکار کر دیتیں، میں نے پھر انہیں دعوتِ اسلام دی تو انہوں نے انکار کر دیا، پھر میں نے نبی کریم ﷺ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہو کر عرض کی کہ میری ماں کیلئے دعا فرمائیے (کہ وہ اسلام قبول کرلے) حضور نے دعا فرمائی، میں واپس آیا اور وہ اپنا دروازہ بند کر چکی تھیں، انہوں نے (اندر ہی سے) آواز دی، ابوہریرہ میں نے اسلام قبول کرلیا، میں نے اس خوشخبری کی اطلاع حضور ﷺ کو دی اور عرض کی: (یارسول اللہ ﷺ)! میرے لئے اور میری ماں کیلئے دعا فرمائیے! تو حضور انور ﷺ نے فرمایا: "اے اللہ! تو اپنے بندے ابوہریرہ اور اس کی ماں دونوں کو لوگوں کی نظروں میں محبوب بنادے۔"

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ حضرت ابوہریرہ نے اپنی ماں کو بار بار قبولِ حق کی نصیحت کی اور حضور ﷺ نے نہ صرف یہ کہ انہیں اس "دعوتِ حق" سے منع نہیں فرمایا بلکہ ان کی ماں کیلئے دعا فرما کر ان کی حوصلہ افزائی فرمائی۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ جب انسان اپنے والدین کو نصیحت کرے، ناحق بات پر ان کی غلطی کی نشاندہی کرنا چاہے تو ملائمت و ملاطفت کا لب ولہجہ اختیار کرے، ادب کے تمام تقاضوں کو ملحوظ رکھے، مثلاً یوں کہے کہ: "ابا جان! میرے خیال میں مسئلہ یہ ہے، بہتر ہوگا آپ کسی عالم سے معلوم کرلیں، اگر میں غلطی پر ہوا تو میری اصلاح ہوجائے گی، وغیرہ۔"

کارخانوں اور دفاتر میں نمازِ جمعہ: حکومت پاکستان نے جب فروری ۱۹۹۷ء میں

تقریباً ۲۰ سال کے بعد اچانک جمعہ کی تعطیل کو منسوخ کردیا تو یہ سوال اٹھایا گیا کہ کارخانوں اور دفاتر کی مساجد میں نماز جمعہ ادا کرنا جائز ہے یا نہیں؟ شیخ لدھیانوی سے جب یہی سوال کیا گیا تو انہوں نے جنگ کے صفحات پر جواب دیا کہ: "جہاں عام مسلمانوں کو آکر نماز پڑھنے کا اذنِ عام نہ ہو، وہاں نمازِ جمعہ ادا کرنا جائز نہیں ہے، کیونکہ نماز جمعہ کی صحت کیلئے اذنِ عام شرط ہے۔" اصولی طور پر تو شیخ کی یہ بات درست ہے، لیکن مسند افتاء کیلئے نفس مسئلہ کو جاننے کے ساتھ ساتھ فقاہت، دینی بصیرت، مصالحِ دینیہ کا ادراک، عرف سے آگہی، فرع کو اصل پر قیاس کرنے، ایک جیسی نظائر کے ایک دوسرے پر انطباق، مجتہدانہ فکر اور اصابت رائے بھی ضروری ہے۔ مشہور قول ہے کہ: "جو فقیہ اپنے دور کے عرف سے آگاہ نہیں، وہ جاہل ہے۔"

چنانچہ صحتِ جمعہ کی ایک شرط "اذنِ عام" کے تحت "در مختار" اور "رد المحتار" میں ہے کہ اگر دشمن کے خطرے کے پیشِ نظر قلعے (فصیل شہر) کا دروازہ ہو، لیکن حدود قلعہ کے اندر رہنے والوں کیلئے اذنِ عام ہو تو یہ نماز جمعہ کی صحتِ ادا کیلئے کافی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے ان فقہاءِ عظام کی تربتوں پر اپنی رحمتوں کا نزول فرمائے کہ انہوں نے اپنے دَور کی ضرورتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے احکام شریعت کے انطباق اور اطلاق (Application) میں وسعت پیدا کی، جہاں تک حدود شرع میں ممکن ہوا یُسر کو ملحوظ رکھا اور اللہ تعالیٰ کے پیارے حبیب ﷺ کے فرمان کے مطابق تنفُّر کے بجائے تبشیر کی راہ اختیار کی۔

علامہ شامی نے تو یہاں تک توسع اختیار کی ہے کہ درِ مختار کی یہ عبارت کہ (اَلْاِذْنُ الْعَامُ) --- مِنَ الْاِمَامِ، وَهُوَ يَحْصُلُ بِفَتْحِ اَبْوَابِ الْجَامِعِ لِلْوَارِدِيْنَ (کافی)، فَلَا يَضُرُّ غَلْقُ بَابِ الْقَلْعَةِ لِعَدُوٍّ اَوْلِعَادَةٍ قَدِيْمَةٍ، لِاَنَّ الْاِذْنَ الْعَامَّ مُقَرَّرَةٌ لِاَهْلِهٖ وَغَلْقُهٗ لِمَنْعِ الْعَدُوِّ لَالِلْمُصَلِّيْ، نَعَمْ لَوْلَمْ يَغْلَقْ لَكَانَ اَحْسَنَ كَمَا فِيْ "مَجْمَعُ الْاَنْهُرِ" مَعْزِيًّا "لِشَرْحِ عُيُوْنِ الْمَذَاهِبِ" ترجمہ: "امام کی جانب سے اذن عام..... اور وہ مسجدِ جامع میں آنے والوں کے لئے دروازے کھلے رکھنے سے حاصل ہو جاتا ہے، لہٰذا اگر مسجدِ جامع کے دروازے کسی قدیم عادت یا خطرہ دشمن کے پیش نظر بند ہوں تو اذن عام کے لئے مضر نہیں ہے، کیونکہ اس کے اہل (یعنی اندر رہنے والوں) کے لئے تو بہر حال ثابت ہے اور دروازے

کی بندش نمازی کے لئے نہیں ہے، دشمن کو روکنے کے لئے ہے، تاہم اگر دروازہ بند نہ ہوتا تو بہتر ہوتا الخ۔"

علامہ شامی اس کے تحت لکھتے ہیں: "قُلْتُ: وَيَنْبَغِيْ اَنْ يَكُوْنَ مَحَلُّ النِّزَاعِ مَا اِذَا كَانَتْ لَاتُقَامُ اِلاَّ فِيْ مَحَلٍّ وَاحِدٍ، اَمَّا لَوْ تَعَدَّدَتْ فَلاَ، لِاَنَّهُ لَمْ يَتَحَقَّقُ التَّفْوِيْتُ كَمَا اَفَادَهُ التَّعْلِيْلُ، تَاَمَّلْ" ترجمہ: "میں کہتا ہوں، (مسجدِ جامع کے دروازے کی بندش) محلِ نزاع تب قرار پانا چاہئے جبکہ نماز صرف ایک ہی جگہ ہوتی ہو، لیکن اگر نمازِ جمعہ کئی جگہ ہو رہی ہو تو پھر یہ مسئلہ محلِ نزاع نہیں رہے گا، کیونکہ نمازِ جمعہ کا فوت ہونا متحقق نہیں ہوگا، جبکہ تعلیل اس کا فائدہ دے رہی ہے، غور کیجئے۔" یعنی علامہ شامی کے نزدیک موجودہ حالات میں بعض مقامات پر اگر سیکورٹی اور تحفظ کی خاطر کسی مسجدِ جامع میں اذنِ عام نہ بھی ہو یا دروازے باہر والوں کے لئے بند ہوں، تب بھی جمعہ جائز ہوگا، اذنِ عام کی شرط متحقق ہوگی کیونکہ اور متعدد مقامات (یعنی مساجدِ جامع) ایسے ہیں جو سب کے لئے کھلے ہیں۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار جلد ۳ مطبوعه داراحیاء التراث العربی، بیروت، لبنان)

ہمارے دور میں سیکورٹی اور سلامتی کے مسائل سنگین خطرات سے دوچار ہیں، بعض صنعتی اور انتظامی ادارے انتہائی حساس اور دفاعی نوعیت کے ہیں اور تقریباً ہر صنعتی ادارے میں باہر کے غیر متعلقہ افراد کا داخلہ خصوصی اجازت اور پاس کے بغیر منع ہے۔ بعض اداروں میں ہزاروں افراد کام کرتے ہیں اور وہ میلوں تک پھیلے ہوئے ہیں، جیسے پاکستان اسٹیل، پی-آئی-اے، پورٹ، شپ یارڈ، کیمپ، واہ فیکٹری، کامرہ فیکٹری وغیرہ۔ ان میں سے بعض اداروں کی حدود کے اندر ایک سے زائد مساجد ہیں۔ تو اگر "اذنِ عام" کی کڑی شرط کا غیر دانشمندانہ اطلاق کر کے ان اداروں میں نمازِ جمعہ کے صحیح نہ ہونے کا فتویٰ دے دیا جائے تو مسلمانوں کی عظیم اکثریت اسلام کے ایک عظیم شعار، سعادتِ جمعہ سے محروم رہ جائے گی۔ کیونکہ ان لوگوں کیلئے کارخانوں کی حدود سے باہر آکر کھلی مساجد میں جمعہ پڑھنا تقریباً ناممکن العمل ہو جائے گا۔ اور تو چھوڑیئے، ایوانِ صدر، گورنر ہاؤسز، وزیر اعظم ہاؤس وغیرہ کی حدود میں جمعہ ناجائز قرار پائے گا، کیونکہ سیکورٹی کے مقاصد کے تحت ان اداروں میں داخلے کا اذنِ

عام نہیں ہے اور نہ ہی یہ اعلیٰ ارباب اقتدار محفوظ ترین سیکورٹی کے بغیر باہر کھلی مساجد میں آکر نماز پڑھ سکتے ہیں۔ لہذا اس کے سوا چارۂ کار نہیں ہے کہ جو رخصت ہمارے فقہاءِ متقدمین نے پرانے ادوار میں ادائے جمعہ کیلئے قلعہ بند بستیوں کے رہنے والوں کیلئے دی تھیں، اس کا اطلاق موجودہ دَور کے "ٹائٹ سیکورٹی" والے اداروں، کارخانوں، دفاتر اور اڈوں وغیرہ پر بھی کر کے جمعہ کی شرط "اذنِ عام" میں نرمی پیدا کی جائے۔

ہاں البتہ وہ حساس نوعیت کے (Sensitive) والے ادارے جہاں باقاعدہ مساجد ہیں، جن کی تاسیس ہی مسجد کیلئے کی گئی ہے، وہاں باجماعت پنج وقتہ اور جمعہ کی نماز پڑھنے سے مسجد اور جماعت دونوں کا ثواب ملے گا، لیکن جہاں باقاعدہ فرش سے مسجد قرار دیئے بغیر، کوئی کمرہ، ہال یا عمارت کا کوئی حصہ وقتی ضرورت کے تحت نماز کیلئے مختص کر دیا گیا تو وہاں باجماعت نمازِ پنج وقتہ اور جمعہ کی ادائیگی تو ہو جائے گی، لیکن مسجد کا ثواب نہیں ملے گا۔

ٹی وی، ویڈیو کا مسئلہ : ٹی وی، ویڈیو، وی سی آر، وی سی پی وغیرہ کے استعمال اور استفادے کے بارے معاصر علماء کی دو آراء ہیں۔ ایک یہ کہ ان کا استعمال بالکل ناجائز ہے، یہ رائے ہندوستان کے ممتاز عالم دین علامہ اختر رضا خان بریلوی اور ان کے ہم خیال علماء کی ہے، دوسری رائے ہندوستان کے ممتاز عالم دین مولانا مدنی میاں، مفتی محمد وقار الدین قادری مرحوم اور ان کے ہم خیال علماء کی ہے۔ چنانچہ مفتی محمد وقار الدین قادری مرحوم سے جب ان آلات کی مرمت اور کاروبار کے جواز اور استعمال کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے جواباً فرمایا کہ: "ان کے جائز و ناجائز ہونے کا حکم فی نفسہٖ ان پر نہیں بلکہ ان کے استعمال پر ہوتا ہے۔ ان کا جیسا استعمال ہوگا، ویسا ہی حکم ہوگا، لہذا ان کی مرمت کر کے روزی کمانا جائز ہے۔" مزید لکھتے ہیں: "ریڈیو اور ٹی وی مشینی آلات ہیں، ان سے جائز کام بھی لئے جاتے ہیں اور ناجائز کام بھی، یہ صرف حرام کیلئے استعمال نہیں ہوتے اور نہ محض غلط کاموں کیلئے بنائے جاتے ہیں، جس طرح چھری اور بندوق وغیرہ جیسے آلات سے جہاد بھی کیا جاتا ہے اور اپنے ذاتی کاموں اور شکار میں بھی استعمال کئے جاتے ہیں اور انہی سے انسان کو قتل کرنے والا فعل قبیح بھی کیا جاتا ہے۔ لہذا جو آلات صرف معصیت کیلئے متعین نہ ہوں، ان کا بنانا اور مرمت

کرنا جائز ہے تو ریڈیو اور ٹی وی کی مرمت کرنا بھی جائز ہے، اسی طرح اس کی مرمت کی اجرت بھی حلال ہے۔ ٹی وی کے ایسے پروگرام جو دینی ہوں اور جن میں عورت یا اس کی آواز نہ ہو، دیکھنے اور سننے میں کوئی حرج نہیں۔" (وقار الفتاویٰ ص ۲۱۹۔۲۱۸)

شیخ لدھیانوی صاحب سے دریافت کیا گیا کہ دولت پور کی مسجد میں تقریب نکاح کی مووی (Movie) بن رہی تھی، کسی نے امام صاحب سے کہا کہ منع کریں، امام صاحب نے کہا کہ حرمین طیبین میں بھی مووی بنتی ہے۔ شیخ نے "جنگ" کے صفحات پر جواب دیا کہ امام کا یہ فعل حرام ہے اور اس امام کی اقتدا میں نماز جائز نہیں ہے۔ شیخ نے دولت پور کے امام کا مسئلہ تو بے دھڑک بتادیا، لیکن امام حرم کے پیچھے نماز کے جواز یا عدم جواز کا مسئلہ نہیں بتایا۔ کسی بھی عالم ربانی کو کسی طمع و لالچ اور خوف و خطر کے بغیر پورا مسئلہ بتانا چاہئے۔ دولت پور کا امام تو کسی وڈیرے یا کمیٹی کا ملازم و ماتحت ہوگا، جبکہ امام حرم تو "مدیر العام لشئون الحرمین الطیبین" یعنی ڈائریکٹر جنرل برائے امور حرمین طیبین ہیں، اور ان کا عہدہ مملکت کے نائب وزیر کے برابر ہے، وہ مملکت کی جانب سے امور حرمین کے مجاز و مختار ہیں۔ شریعت میں حلال و حرام کا معیار دولت پور اور مکہ مکرمہ و مدینہ منورہ کیلئے ایک ہے۔ بلکہ اگر مسجد الحرام میں نیکی کا اجر دوسرے مقامات کے بہ نسبت ایک لاکھ گنا ہے تو گناہ کا وبال بھی زیادہ ہوگا۔ لیکن بعض لوگوں کے نزدیک معیارِ حق و باطل، جائز و ناجائز افراد اور مقامات کے اعتبار سے بدل جاتا ہے یا ممکن ہے مصلحتیں حائل ہو جاتی ہوں۔

بقول ولی دکنی۔

پہلے وہ آپ کہہ کر بلاتے تھے، اب وہ تُو کہتے ہیں	وقت کے ساتھ خطابات بدل جاتے ہیں
پہلے تھے میخانہ میں، اب ہیں مسجد میں ولی	عمر کے ساتھ مقامات بدل جاتے ہیں

اسی طرح حرمین طیبین کے مختلف ائمہ عظام کی رنگین تصاویر کے البم بھی موجود ہیں، جو ان کی مرضی سے وقتاً فوقتاً لی جاتی رہیں۔ لدھیانوی صاحب ذرا ہمت کر کے ہمیں بتائیں کہ ان کے نزدیک حکم شرعی کیا ہے۔ افراد کے اعتبار سے شرعی احکام کی حیثیت اور جائز و ناجائز کا معیار بدلنے کی رسم علماء یہود نے ایجاد کی تھی، جس کے بارے میں قرآن نے فرمایا کہ :

اِتَّخَذُوٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَاباً مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔ (ترجمہ) "انہوں نے اپنے دینی پیشواؤں اور راہبوں کو اللہ تعالیٰ کے سوا اپنا رب بنالیا" (التوبہ :۳۱)

اس لئے لدھیانوی صاحب سے ہماری گزارش ہے کہ دین و شریعت کا مسئلہ وہ بتائیں جس کا اطلاق وہ یکساں طور پر ہر ایک پر اور ہر جگہ کر سکیں۔

اختلافِ اُمت اور صراطِ مستقیم : شیخ لدھیانوی جنگ کے فورم کو اپنی کتاب "اختلاف اُمت اور صراطِ مستقیم" کی تشہیر کیلئے استعمال کرتے ہیں اور مختلف سوالات کے جوابات میں لکھتے ہیں کہ یہ مسئلہ میری کتاب میں مطالعہ کریں۔

اس کتاب میں شیخ لدھیانوی کا طریقۂ کار یہ ہے کہ وہ مختلف مسالک و مکاتبِ فکر کے عقائد و نظریات تحریر کرتے ہیں اور پھر اپنے نقطۂ نظر سے ان کی تردید کرتے ہیں۔ اس کتاب میں موصوف نے اہل سنت و جماعت جنہیں وہ بزعم خویش بریلوی سے تعبیر کرتے ہیں، پر یہ ظلمِ عظیم کیا ہے کہ پہلے اپنی طرف سے فرضی عقائد ان کی طرف منسوب کئے ہیں اور پھر اپنے انداز سے ان کی تردید کی ہے۔ کسی کی طرف مسلمہ ثبوت کے بغیر کوئی بات منسوب کرنا، شرعاً کذب، تہمت اور بہتان کے زمرے میں آتا ہے جو گناہ کبیرہ ہے۔ ہم یہاں نمونے کے طور پر ایک مثال ذکر کر رہے ہیں :

شبیہ بیت اللہ کا طواف : لدھیانوی صاحب اپنی کتاب "اختلاف اُمت اور صراطِ مستقیم" کے صفحہ نمبر ۹۲ پر نمبر (۱۰) کے تحت لکھتے ہیں : "اب میں اس "عید میلاد النبی" کا آخری کارنامہ عرض کرتا ہوں، کچھ عرصے سے ہمارے کراچی میں "عید میلاد النبی" کے موقع پر آنحضرت ﷺ کے روضۂ اطہر اور بیت اللہ کی شبیہ بنائی جاتی ہے اور جگہ جگہ بڑے چوکوں میں سانگ بنا کر رکھے جاتے ہیں۔ لوگ ان سے تبرک حاصل کرتے ہیں اور "بیت اللہ" کی خود ساختہ شبیہ کا طواف بھی کرتے ہیں اور یہ سب کچھ مسلمانوں کے ہاتھوں اور علماء کی نگرانی میں کرایا جا رہا ہے۔ فیا اسفاہ!"

اس سلسلے میں گزارش یہ ہے کہ علماء اہلسنت کے نزدیک شبیہ کا حکم اصل کا نہیں ہے،

اور مزید یہ کہ ہمارے نزدیک صرف مسجد الحرام، مکہ مکرمہ میں بیت اللہ کا طواف عبادت ہے۔ خود مکہ مکرمہ یا مدینہ منورہ میں بھی "بیت اللہ" کی شبیہ بنا کر اس کا طواف کرنا عبادت نہیں ہے، چہ جائیکہ کراچی یا دنیا کے کسی اور مقام پر ایسا کیا جائے۔ اہل سنت و جماعت کے کسی ثقہ و مستند عالم دین یا مفتی نے نہ ایسی بات کہیں لکھی ہے اور نہ ہی کبھی ایسی بات کہی ہے اور نہ کسی مستند عالم دین نے ان بدعات کی نگرانی کی ہے، لہذا یہ سراسر بہتان اور افتراء ہے اور لدھیانوی صاحب کو اس سے رجوع کرنا چاہیے۔ اگر کوئی کہے کہ ایسا ہوتا تو ہے۔ اگر بفرض محال کہیں ایسا ہو رہا ہو تو کیا کسی کے عقائد ثابت کرنے اور کسی کی طرف عقائد منسوب کرنے کا شرعی طریقہ یہی ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی عیسائی، یہودی یا ہندو یہ کہے کہ اسلام میں شراب بنانا، بیچنا اور پینا جائز ہے کیونکہ میں نے خود دیکھا ہے لنڈن کے فلاں مقام پر ایک مسلمان شراب پی رہا تھا اور ایک مسلمان شراب بیچ رہا تھا اور فلاں مقام پر فلاں مسلمان کا شراب کارخانہ ہے۔

قبروں پر منتیں اور چڑھاوے

(شیخ محمد یوسف لدھیانوی نے اپنی کتاب "اختلاف امت اور صراط مستقیم" کے صفحات ۷۵، ۷۶ پر مندرجہ بالا عنوان کے تحت جو کچھ لکھا ہے، وہ من و عن درج ذیل ہے) :

بہت سے لوگ نہ صرف اولیاء اللہ سے مرادیں مانگتے ہیں، بلکہ ان کی منتیں بھی مانتے ہیں کہ اگر ان کا فلاں کام ہو جائے تو ان کی قبر پر غلاف یا شیرینی چڑھائیں گے یا اتنی رقم ان کی نذر کریں گے۔ اس سلسلہ میں چند مسائل معلوم کر لینا ضروری ہے :

(۱) منت ماننا و نذر و نیاز دینا عبادت ہے اور غیر اللہ کی عبادت جائز نہیں۔ ہمارے حنفیہ کی مشہور کتاب در مختار میں ہے :

"وَاعْلَمْ اَنَّ النَّذْرَ الَّذِیْ یَقَعُ لِلْاَمْوَاتِ مِنْ اَکْثَرِ الْعَوَامِ وَمَا یُؤْخَذُ مِنَ الدَّرَاهِمِ وَالشَّمْعِ وَالزَّیْتِ وَنَحْوِهَا اِلٰی ضَرَائِحِ الْاَوْلِیَاءِ الْکِرَامِ تَقَرُّبًا اِلَیْهِمْ فَهُوَ بِالْاِجْمَاعِ بَاطِلٌ وَحَرَامٌ۔ مَالَمْ

مَالَمْ يَقْصِدُوْا صَرْفَهَا لِفُقَرَاءِ الْاَنَامِ، وَقَدِ ابْتُلِيَ النَّاسُ بِذٰلِكَ لاَ سِيَّمَا فِيْ هٰذِهِ الْاَعْصَارِ وَقَدْ بَسَطَهُ الْعَلاَّمَةُ قَاسِمُ فِيْ شَرْحِ دُرَرِالْبِحَارِ۔" (در مختار قبیل باب الاعتکاف)

ترجمہ :- "جاننا چاہئے کہ اکثر عوام کی طرف سے مردوں کے نام کی جو نذر مانی جاتی ہے اور اولیائے کرام کی قبروں پر روپے پیسے، شمع تیل وغیرہ۔ ان کے تقرب کی خاطر جو لائے جاتے ہیں وہ بالاجماع باطل اور حرام ہے۔ اور لوگ اس میں بکثرت مبتلا ہیں خصوصاً اس زمانے میں۔ اور اس مسئلہ کو علامہ قاسمؒ نے درر البحار" کی شرح میں بڑی تفصیل سے لکھا ہے۔"

علامہ شامیؒ فرماتے ہیں کہ "ایسی نذر کے باطل اور حرام ہونے کی کئی وجوہ ہیں۔ ایک یہ کہ یہ نذر مخلوق کے لئے ہے۔ اور مخلوق کے نام کی منت ماننا جائز نہیں۔ کیونکہ نذر عبادت ہے۔ اور عبادت مخلوق کی نہیں ہوتی...... دوم یہ کہ جس کے نام کی منت مانی گئی ہے وہ میت ہے۔ اور مردہ کسی چیز کا مالک نہیں ہوتا...... سوم یہ کہ اگر نذر ماننے والے کا خیال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا مرا ہوا شخص بھی تکوینی امور میں تصرف رکھتا ہے تو اس کا یہ عقیدہ کفر ہے......(ردالمحتار ص ۱۳۹) (اختلاف امت اور صراط مستقیم صفحہ ۷۵،۷۶)

ترجمہ میں علمی خیانت

مذکورہ بالا اقتباس کے پیراگراف نمبر (ا) میں علامہ علاء الدین حصکفی کی کتاب "الدر المختار" کی عربی عبارت دی گئی ہے جو بالکل درست طور پر نقل کی گئی ہے، لیکن اس کے اردو ترجمے میں بہت بڑی علمی خیانت کا ارتکاب کیا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ سہو یا اتفاقی غلطی نہیں ہے بلکہ دانستہ طور پر ایسا کیا گیا ہے، جس کا مقصد اپنی طرف سے مزعومہ (Pretended) عقائد کو اہلسنت وجماعت کی طرف منسوب کر کے عامۃ المسلمین کو ان سے بد ظن کرنا ہے۔ علامہ علاء الدین حصکفی کی عربی عبارت میں ایک جملہ ہے: "مَالَمْ يَقْصِدُوْا صَرْفَهَا لِفُقَرَآءِ الْاَنَامِ"۔ صاحب در مختار نے نذر باطل میں سے اس صورت کو مستثنیٰ (Exempt) کر دیا ہے، جو باطل و حرام کے زمرے میں نہیں آتی بلکہ شرعاً بالکل

جائز ہے اور وہ یہ ہے کہ: "عوام اولیاء اللہ کی قبروں پر جو نقد رقوم یا شمع و تیل وغیرہ لاتے ہیں، اگر وہ اس نیت سے لائے جاتے ہیں کہ (اللہ کے) نادار بندوں پر خرچ کئے جائیں یا وہ ان سے فائدہ اٹھائیں تو یہ بالکل جائز ہے اور الحمد للہ اہلسنت و جماعت کا یہی عقیدہ و نظریہ ہے۔

علامہ محمد امین ابن عابدین شامی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب "ردالمحتار" میں در مختار کی مذکورہ بالا عبارت کی تشریح کرتے ہوئے جو حرام و باطل ہونے کی صورت لکھی ہے، وہ یہ ہے کہ کوئی شخص صاحب قبر ولی اللہ کو مخاطب کر کے یہ کہے: "اے بزرگ محترم! اگر میرا (فلاں) گمشدہ عزیز (سلامتی کے ساتھ) واپس آگیا یا میرا (فلاں) مریض شفایاب ہو گیا یا میرا (فلاں) کام ہو گیا، تو یہ سونا یا چاندی یا کھانا یا شمع و تیل آپ کے لئے ہے، تو یہ نذر باطل و حرام ہے اور آگے علامہ شامی نے اس کے حرام ہونے کی وجوہ تحریر فرمائی ہیں، جنہیں جناب شیخ محمد یوسف لدھیانوی نے اپنی کتاب میں نقل کیا ہے، اسی عبارت میں متصلاً علامہ شامی نے اولیاء اللہ کے مزارات پر دی جانے والی نذر کے جائز ہونے کی وجوہ بھی لکھ دی ہیں اور علمی دیانت و امانت کا تقاضا یہ تھا کہ پوری عبارت نقل کی جاتی، پورا مفہوم ترجمے میں بیان کر دیا جاتا تاکہ قارئین کو جائز اور ناجائز دونوں صورتیں معلوم ہو جاتیں اور علامہ شامی کا پورا موقف سامنے آجاتا۔ لیکن چونکہ اس سے جناب لدھیانوی کا مقصد پورا نہیں ہوتا تھا، کیونکہ وہ تو اہل سنت و جماعت کے عقائد و نظریات کو باطل ثابت کرنے پر ادھار کھائے بیٹھے تھے، اس لئے اپنے مطلب کے خلاف عبارت پر قینچی چلا دی اور اسے قلمزد (Censor) کر دیا، آیئے! ہم پہلے علامہ شامی کی محولہ بالا عبارت درج کرتے ہیں اور پھر اس کا مفہوم بیان کرتے ہیں:

"وَاعْلَمْ أَنَّ النَّذْرَ الَّذِيْ يَقَعُ لِلْأَمْوَاتِ مِنْ أَكْثَرِ الْعَوَامِّ وَمَا يُؤْخَذُ مِنَ الدَّرَاهِمِ وَالشَّمْعِ وَالزَّيْتِ وَنَحْوِهَا إِلَى ضَرَائِحِ الْأَوْلِيَاءِ الْكِرَامِ تَقَرُّبًا إِلَيْهِمْ فَهُوَ بِالْإِجْمَاعِ بَاطِلٌ وَحَرَامٌ۔

مَطْلَبٌ فِي النَّذْرِ الَّذِيْ يَقَعُ لِلْأَمْوَاتِ مِنْ أَكْثَرِ الْعَوَامِّ مِنْ شَمْعٍ أَوْ زَيْتٍ أَوْ نَحْوِهِ۔ قَوْلُهُ: (تَقَرُّبًا إِلَيْهِمْ) كَأَنْ يَقُوْلَ: يَاسَيِّدِيْ فُلَانٌ إِنْ رُدَّ غَائِبِيْ أَوْ عُوْفِيَ مَرِيْضِيْ أَوْ قُضِيَتْ حَاجَتِيْ فَلَكَ مِنَ الذَّهَبِ أَوِ الْفِضَّةِ أَوِ الطَّعَامِ أَوِ الشَّمْعِ

اَوِالزَّيْتِ، كَذَا (بَحر)۔ قَوْلُهُ: (بَاطِلٌ وَ حَرَامٌ) لِوُجُوْهٍ: مِنْهَا أَنَّهُ نَذْرٌ لِمَخْلُوْقٍ وَالنَّذْرُ لِلْمَخْلُوْقِ لَايَجُوْزُ، لِأَنَّهُ عِبَادَةٌ وَالْعِبَادَةُ لَاتَكُوْنُ لِمَخْلُوْقٍ، وَمِنْهَا: أَنَّ الْمَنْذُوْرَ لَهُ مَيِّتٌ وَالْمَيِّتُ لَا يَمْلِكُ۔ وَمِنْهَا: اَنَّهُ اِنْ ظَنَّ أَنَّ الْمَيِّتَ يَتَصَرَّفُ فِي الْاُمُوْرِ دُوْنَ اللّٰهِ تَعَالٰى وَاعْتِقَادُهُ ذٰلِكَ كُفْرٌ۔ اَللّٰهُمَّ اِلاَّ اَنْ قَالَ: يَااَللّٰهُ اِنِّيْ نَذَرْتُ لَكَ اِنْ شَفَيْتَ مَرِيْضِيْ أَوْ رَدَدْتَ غَائِبِيْ اَوْ قَضَيْتَ حَاجَتِيْ أَنْ أَطْعِمَ الْفُقَرَآءَ الَّذِيْنَ بِبَابِ السَّيِّدَةِ نَفِيْسَةَ اَوِالْاِمَامِ الشَّافِعِيِّ اَوِالْاِمَامِ اللَّيْثِ اَوْ أَشْتَرِيَ حُصُرًا لِمَسَاجِدِهِمْ اَوْ زَيْتًا لِوُقُوْدِهَا اَوْ دَرَاهِمَ لِمَنْ يَقُوْمُ بِشَعَآئِرِهَا اِلٰى غَيْرِ ذٰلِكَ مِمَّا يَكُوْنُ فِيْهِ نَفْعٌ لِلْفُقَرَآءِ وَالنَّذْرُ لِلّٰهِ عَزَّوَجَلَّ۔ (ردالمحتار علی الدر المختار جلد ۳ ص ۳۸۰-۳۷۹ مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت، لبنان)

یعنی ہاں، یہ صورت بالکل جائز ہے کہ کوئی شخص یہ کہے کہ: اے اللہ! اگر میرا (فلاں) مریض شفایاب ہو گیا یا میرا (فلاں) گمشدہ عزیز (سلامتی کے ساتھ) واپس آگیا یا میرا (فلاں) کام ہو گیا تو میں تیرے نام کی نذر مانتا ہوں کہ سیدہ نفیسہ یا امام شافعیؒ یا امام لیث کے مزار پر جو فقراء ہیں، میں انہیں کھانا کھلاؤں گا یا ان کی مساجد کے لئے چٹائیاں (دریاں) خرید کر دوں گا یا وہاں (پر جو چراغ جلائے جاتے ہیں، ان) کے لئے تیل خرید کر دوں گا، یا جو لوگ وہاں کا انتظام و انصرام کرتے ہیں، انہیں نقد رقم دوں گا، وغیرہ۔ (الغرض) نذر اللہ عزوجل کے لئے ہو اور اس سے فائدہ (وہاں کے) فقراء کو پہنچانا مقصود ہو تو یہ بلاشبہ جائز ہے۔ اور علامہ حصکفی نے بھی اپنی استثنائی عبارت میں نذر کے مال کو خرچ کرنے کا جائز محل و مصرف بیان کیا ہے اور وہ ایسے مستحقین ہیں جو ان مساجد یا مزارات کے پاس رہتے ہیں، تو ان پر نذر کی ان رقوم کا خرچ کرنا جائز ہے، البتہ نذر کے اس مال کا ایسے متولی و سجادہ نشین پر خرچ کرنا جائز نہیں ہے جو نادار نہیں ہے بلکہ مالدار ہے۔ چنانچہ آگے چل کر صفحہ ۸۷ پر جناب لدھیانوی نے خود صورت جواز کو تسلیم کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

(۴) ''اور اگر کسی شخص نے منت اللہ کی مانی ہو اور محض اس بزرگ کی روح کا ایصال

ثواب مقصود ہو یا وہاں کے فقراء کو نفع پہنچانا مقصود ہو تو اس کو حرام اور شرک نہیں کہا جائے گا۔" لیکن پھر صفحہ ۹۷ پر مسلمانوں کی نیت پر حملہ آور ہوتے ہیں اور لوگوں کی نیتوں اور دلوں کے احوال کا فیصلہ کرنے بیٹھ جاتے ہیں، جس کا شریعت نے انہیں حق نہیں دیا، کیونکہ شریعت میں ظاہر حال پر حکم لگایا جاتا ہے اور باطن کا معاملہ اللہ کے سپرد ہوتا ہے؛ مگر جناب لدھیانوی حد شرعی سے تجاوز کر کے لکھتے ہیں:

"مگر مشاہدہ یہ بتاتا ہے کہ جو لوگ بزرگوں کے مزاروں پر چڑھاوے چڑھاتے اور منتیں مانتے ہیں، ان کی یہ نیت ہرگز نہیں ہوتی، بلکہ وہ یہ کہہ کر "ہم خدا کی منت مان رہے ہیں اور بزرگوں کو صرف ایصال ثواب مقصود ہوتا ہے، اپنے آپ کو دھوکہ دے رہے ہیں"

حالانکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يَاۤ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ۔ (الحجرات: ۱۲)

اے مومنو! بہت سی بدگمانیوں سے اجتناب کرو، بے شک بعض بدگمانیاں گناہ (کا باعث) ہیں۔

اور ارشاد رسول ﷺ ہے:

اِيَّاكُمْ وَالظَّنَّ فَاِنَّ الظَّنَّ اَكْذَبُ الْحَدِيْثِ۔

(لوگوں کے بارے میں) بدگمانی کرنے سے بچے رہو، کیونکہ بدگمانی سب سے بڑا جھوٹ ہے۔

صفاتِ باری تعالیٰ کا مظہر بننے کا مفہوم

ہمارے ایک شاگرد ڈاکٹر حافظ قاری عطاء المصطفیٰ جمیل راٹھور نے ہمارے حوالے سے جامع مسجد قبا کرمانوالہ بلاک نمبر ۱ گلستان جوہر میں خطاب جمعہ کے دوران حدیث کے حوالے سے یہ بیان کیا کہ بندہ تقرب الٰہی کی منزلیں طے کرتے کرتے اللہ تعالیٰ کی صفاتِ جلیلہ کا مظہر بن جاتا ہے، اس پر جناب کامران احمد انصاری گلستان جوہر کراچی نے ایک مفصل اعتراض تحریری شکل میں ان پر وارد کر دیا کہ جو کچھ آپ بیان کر رہے ہیں، یہ تو شرک

کے زمرے میں آتا ہے، پہلے حدیثِ پاک ملاحظہ فرمایئے:

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ تَعَالیٰ قَالَ: مَنْ عَادٰی لِیْ وَلِیًّا فَقَدْ اٰذَنْتُهٗ بِالْحَرْبِ، وَمَا تَقَرَّبَ اِلَیَّ عَبْدِیْ بِشَیْءٍ اَحَبَّ اِلَیَّ مِمَّا افْتَرَضْتُ عَلَیْهِ وَمَا یَزَالُ عَبْدِیْ یَتَقَرَّبُ اِلَیَّ بِالنَّوَافِلِ حَتّٰی اُحِبَّهٗ فَکُنْتُ سَمْعَهُ الَّذِیْ یَسْمَعُ بِهٖ وَبَصَرَهُ الَّذِیْ یُبْصِرُ بِهٖ وَیَدَهُ الَّتِیْ یَبْطِشُ بِهَا وَرِجْلَهُ الَّتِیْ یَمْشِیْ بِهَا، وَاِنْ سَاَلَنِیْ لَاُعْطِیَنَّهٗ وَلَئِنِ اسْتَعَاذَنِیْ لَاُعِیْذَنَّهٗ مَا تَرَدَّدْتُ عَنْ شَیْءٍ اَنَا فَاعِلُهٗ تَرَدُّدِیْ عَنْ نَفْسِ الْمُؤْمِنِ یَکْرَهُ الْمَوْتَ وَاَنَا اَکْرَهُ اِسَاءَتَهٗ وَلَا بُدَّلَهٗ مِنْهُ، (رواه البخاری بحواله مشکوٰة المصابیح بابُ ذِکْرِ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ وَالتَّقَرُّبِ اِلَیْهِ)

"حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بلاشبہ اللہ جل شانہٗ فرماتا ہے: جو شخص میرے کسی ولی سے عداوت کرے، میں اس کے خلاف اعلانِ جنگ کرتا ہوں، اور بندہ اپنے جس عمل سے، جو مجھے محبوب ترین ہے، میرے قریب ہوتا ہے، وہ اس پر میرے عائد کردہ فرائض ہیں، اور (ادائیگی فرائض کے بعد) میرا بندہ نوافل ادا کرتے کرتے مسلسل میرے قریب ہوتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ میں اسے اپنا محبوب بنالیتا ہوں، پھر میں اس کے کان بن جاتا ہوں جن سے وہ سنتا ہے اور اس کی آنکھیں بن جاتا ہوں جن سے وہ دیکھتا ہے اور اس کے ہاتھ بن جاتا ہوں جن سے وہ پکڑتا ہے اور اس کے پاؤں بن جاتا ہوں جن سے وہ چلتا ہے، اور اگر وہ مجھ سے کسی چیز کا سوال کرے تو میں ضرور اسے عطا کرتا ہوں، اور اگر وہ (کسی چیز کے شر سے) میری پناہ مانگے تو میں ضرور اسے پناہ دیتا ہوں، اور میں جس چیز کے کرنے کا ارادہ فرمالوں تو پھر اس میں

تاخیر نہیں کرتا، سوائے مومن کی جان لینے کے موقع پر، کہ وہ موت کو ناپسند کرتا ہے اور میں اسے رنجیدہ نہیں کرنا چاہتا اور (بہر کیف) موت کا قانونِ قدرت تو اس پر نافذ ہونا ہی ہے۔"

اس حدیثِ قدسی کا ایک مفہوم جو عام طور پر یہ بیان کیا جاتا ہے یہ ہے: کہ اللہ تعالیٰ کا بندے کے کان، آنکھیں، ہاتھ اور پیر بن جانے کا مطلب یہ ہے کہ بندہ اپنی ان صلاحیتوں (سماعت، بصارت، گرفت اور رفتار) اور ان اعضاء و جوارح (کان، آنکھیں، ہاتھ اور پیر) کو صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے کاموں میں استعمال کرتا ہے اور اس کے محرّمات، ممنوعات اور مکروہات سے انہیں بچائے رکھتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بھی ایک مفہوم ہے اور اس سے کسی کو اختلاف نہیں ہے۔ لیکن ڈاکٹر عطاء المصطفیٰ جمیل راٹھور صاحب نے ہمارے حوالے سے اس حدیث کا مفہوم یہ بیان کیا کہ بندہ فرائض کی ادائیگی سے کماحقہٗ عہدہ برا ہوئے کے بعد، عباداتِ نافلہ کے ذریعے اللہ تعالیٰ کے تقرب کی منزلیں طے کرتے کرتے اس کی صفات کا مظہر بن جاتا ہے اور وہ اللہ کے نور تجلی سے دیکھتا ہے، سنتا ہے وغیرہ۔ اس مفہوم پر کامران احمد انصاری صاحب نے شرک کا فتویٰ صادر فرمادیا اور ڈاکٹر صاحب سے پوچھا کہ حدیث کا یہ مطلب و مفہوم کس عالم جلیل نے کہاں بیان کیا ہے، تو میں نے ان کی تشفی کے لئے یہ سطور سپردِ قلم کی ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

زیرِ بحث حدیث مبارک کا سیاق و سباق یہ ہے کہ بندہ فرائض کی ادائیگی سے کماحقہٗ عہدہ برا ہونے کے بعد نوافل ادا کرتے کرتے اللہ تعالیٰ کے تقرب کی منزلیں طے کرتا چلا جاتا ہے، یہاں تک کہ اللہ جل شانہٗ ارشاد فرماتا ہے کہ میں اس کو اپنا محبوب بنالیتا ہوں، بعد میں آنے والی عبارت "مقامِ محبوبیت باری تعالیٰ" پر فائز ہونے کا ثمرہ اور اکرام و اعزاز ہے۔

چنانچہ حدیث قدسی کے کلمات مبارکہ یہ ہیں:

"فَإِذَا أَحْبَبْتُهُ فَكُنْتُ سَمْعَهُ الَّذِي يَسْمَعُ بِهِ وَبَصَرَهُ الَّذِي يُبْصِرُ بِهِ

وَيَدَهُ الَّتِي يَبْطِشُ بِهَا وَرِجْلَهُ الَّتِي يَمْشِي بِهَا" الخ۔

ترجمہ: "پس جب میں اپنے بندے کو محبوب بنالیتا ہوں تو میں اس کے کان ہو جاتا ہوں جن سے وہ سنتا ہے اور میں اس کی آنکھیں ہو جاتا ہوں جن سے وہ دیکھتا ہے اور میں اس کے ہاتھ ہو جاتا ہوں جن سے وہ کام کرتا ہے اور میں اس کے پیر ہو جاتا ہوں جن سے وہ چلتا ہے" الخ۔

مقام غور یہ ہے کہ اگر اس کے اعضاء وجوارح اللہ تعالیٰ کے حکم کے تابع نہ ہوتے تو وہ مقامِ محبوبیت پر کیسے فائز ہوتا؟ یہ اعزاز و اکرام جو اللہ تعالیٰ اسے عطا فرمارہا ہے، یہ تو "مقامِ محبوبیت باری تعالیٰ" پر فائز ہونے کا ثمرہ ہے۔ لہٰذا جو مفہوم حدیث قدسی کا آپ بیان کر رہے ہیں، وہ حدیثِ رسول ﷺ کا منطوق نہیں ہے۔

باقی ہم یہ بات نہ کہتے ہیں اور نہ اس کے قائل ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی صفات جلیلہ اس میں منتقل ہو جاتی ہیں یا اس میں حلول کر جاتی ہیں، بلکہ ہمارا موقف یہ ہے کہ وہ بندۂ محبوب صفاتِ الٰہی کا مظہر بن جاتا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کے اذن وعطا سے خرق عادت تصرفات کر لیتا ہے، ایسے خرقِ عادت امور کا ظہور اگر رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ بابرکات سے ہو تو شریعت کی اصطلاح میں اسے "معجزہ" کہتے ہیں اور کسی ولی اللہ اور عبد صالح کی ذات سے ہو تو اسے "کرامت" کہتے ہیں۔ مخلوق کا صفاتِ الٰہی کا مظہر ہونا، قرآن مجید سے ثابت ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

فَلَمَّآ اَتٰهَا نُوْدِيَ مِنْ شَاطِئِ الْوَادِ الْاَيْمَنِ فِي الْبُقْعَةِ الْمُبٰرَكَةِ مِنَ الشَّجَرَةِ اَنْ يّٰمُوْسٰٓى اِنِّيْٓ اَنَا اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (القصص: ۳۰)

ترجمہ (از شیخ اشرف علی تھانوی): "سو جب وہ اس آگ کے پاس پہنچے تو ان کو اس میدان کی داہنی جانب سے (جو کہ موسیٰ کی داہنی جانب تھی) اس مبارک مقام میں ایک درخت میں سے آواز آئی کہ: "اے موسیٰ میں اللہ رب العالمین ہوں۔"

تو آپ کیا تاویل کریں گے کہ معاذ اللہ! اللہ تعالیٰ نے درخت میں حلول کر لیا تھا؟ یا یہ کہ وہ درخت اللہ تعالیٰ کی صفت کلام کا مظہر بن گیا تھا۔

شیخ الحدیث دار العلوم دیوبند شیخ انور شاہ کشمیری فیض الباری (شرح صحیح بخاری جلد ۴ صفحہ ۴۲۹) پر زیر بحث حدیث کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"(ترجمہ) جب درخت سے "میں اللہ ہوں" کی آواز آسکتی ہے تو نفلی عبادت کرنے والے کا کیا حال ہو گا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے سمع وبصر کا مظہر نہ ہو سکے اور اللہ تعالیٰ کا اپنے مقرب بندوں کے سمع وبصر ہو جانا ایسی صورت میں کیونکر مستبعد و محال ہو سکتا ہے جبکہ وہ ابن آدم جو رحمٰن کی صورت پر پیدا کیا گیا ہے، شرف وکمال میں شجر موسیٰ سے کسی طرح کم نہیں ہے۔"

شیخ انور شاہ کشمیری کے اپنے الفاظ یہ ہیں :

"فَاِذَا صَحَّ الشَّجَرَةُ يُنَادِيْ فِيْهَا بِاَنِّيْ اَنَا اللّٰهُ، فَمَا بَالُ الْمُتَصَرِّفِ بِالنَّوَافِلِ اَنْ لَّا يَكُوْنَ اللّٰهُ سَمْعَهٗ وَبَصَرَهٗ؟ كَيْفَ وَاَنَّ ابْنَ آدَمَ الَّذِيْ خُلِقَ عَلٰى صُوْرَةِ الرَّحْمٰنِ لَيْسَ بِاَدْوَنَ مِنْ شَجَرَةِ مُوْسٰى عَلَيْهِ السَّلَامُ"

تو جناب کامران احمد انصاری صاحب :

آپ کا کیا خیال ہے، دار العلوم دیوبند کے شیخ الحدیث انور شاہ کشمیری بندے کو صفاتِ الٰہیہ کا مظہر مان کر عقیدۂ توحید سے انکار کر رہے ہیں یا شرک کی تعلیم دے رہے ہیں ؟

اسی حدیث مبارک کی شرح میں امام المفسرین امام فخر الدین رازی تفسیر کبیر جلد ۵ صفحہ ۶۷ ۴ پر لکھتے ہیں :

ترجمہ : "اور یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ مقربین کی آنکھوں، کانوں بلکہ تمام اعضاء میں غیر اللہ کیلئے کوئی حصہ باقی نہیں رہا، اس لئے کہ اگر یہاں اللہ تعالیٰ کے غیر کیلئے کوئی حصہ باقی رہتا تو اللہ تعالیٰ یہ کبھی نہ فرماتا کہ میں اس کی سمع اور بصر ہو جاتا ہوں۔"

آگے چل کر مزید فرماتے ہیں :

"اور اسی لئے حضرت علی بن ابی طالب کرم اللہ تعالیٰ وجہہ نے فرمایا کہ اللہ کی قسم میں نے خیبر کا دروازہ جسمانی قوت سے نہیں بلکہ ربانی قوت سے اکھاڑا تھا، اور اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ اس وقت حضرت علی کی نظر عالم اجساد سے منقطع ہو چکی تھی اور ملکی قوتوں نے حضرت علی کو عالم کبریاء کے نور سے چمکا دیا تھا، جس کی وجہ سے ان کی روح قوی ہو کر ارواح

ملکیہ کے جواہر سے مشابہ ہو گئی تھی، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ انہیں وہ قدرت حاصل ہو گئی جو ان کے غیر کو حاصل نہ تھی۔ اور اسی طرح جب کوئی بندہ نیکیوں پر دوام اختیار کرتا ہے تو وہ اس مقام تک پہنچ جاتا ہے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے "کُنْتُ لَهٗ سَمْعاً وَبَصَراً" فرمایا ہے اور جب اللہ تعالیٰ کے جلال کا نور اس کی سمع ہو جاتا ہے تو وہ قریب اور دور کی آواز کو سن سکتا ہے اور جب نور (الٰہی) اس کی بَصَر ہو جاتا ہے تو وہ دور و نزدیک کی چیزوں کو دیکھ لیتا ہے اور جب یہ نور (جلال) اس کا ہاتھ ہو جاتا ہے تو وہ بندہ مشکل اور آسان، قریب و دور ہر طرح کے امور میں تصرف کرنے پر قادر ہو جاتا ہے۔"

ہمارے نزدیک "مظہریت باری تعالیٰ" کا یہی مفہوم ہے اور اکابر امت کا ہمیشہ سے یہ عقیدہ رہا ہے اور یہ شرک و بدعت نہیں بلکہ عین توحید ہے۔ اور بندے کو یہ کمالات اور تصرفات اللہ تعالیٰ کے اذن اور عطا سے حاصل ہوتے ہیں، جیسا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا:

وَاُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ وَاُحْيِ الْمَوْتٰى بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ

"میں اللہ کے اذن سے پیدائشی نابینا اور برص کے مریض کو شفایاب کرتا ہوں اور مردے کو زندہ کرتا ہوں۔"

(آل عمران: ۴۹)

اَنِّیْٓ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّيْنِ كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ فَاَنْفُخُ فِيْهِ فَيَكُوْنُ طَيْرًا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ

"اور میں تمہارے لئے مٹی سے پرندے کی صورت بناتا ہوں، پھر میں اس میں پھونکتا ہوں تو وہ اللہ تعالیٰ کے اذن سے (اڑتا ہوا) پرندہ بن جاتا ہے۔"

(آل عمران: ۴۹)

یہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام شفا دینے کی نسبت، زندہ کرنے کی نسبت اور پیدا کرنے یا بنانے کی نسبت اپنی طرف کرتے ہیں مگر چونکہ وہ اذنِ الٰہی سے مظہر صفات ربانی بن کر یہ تصرفات کرتے ہیں، اس لئے یہ عین توحید ہے۔

☆...☆...☆